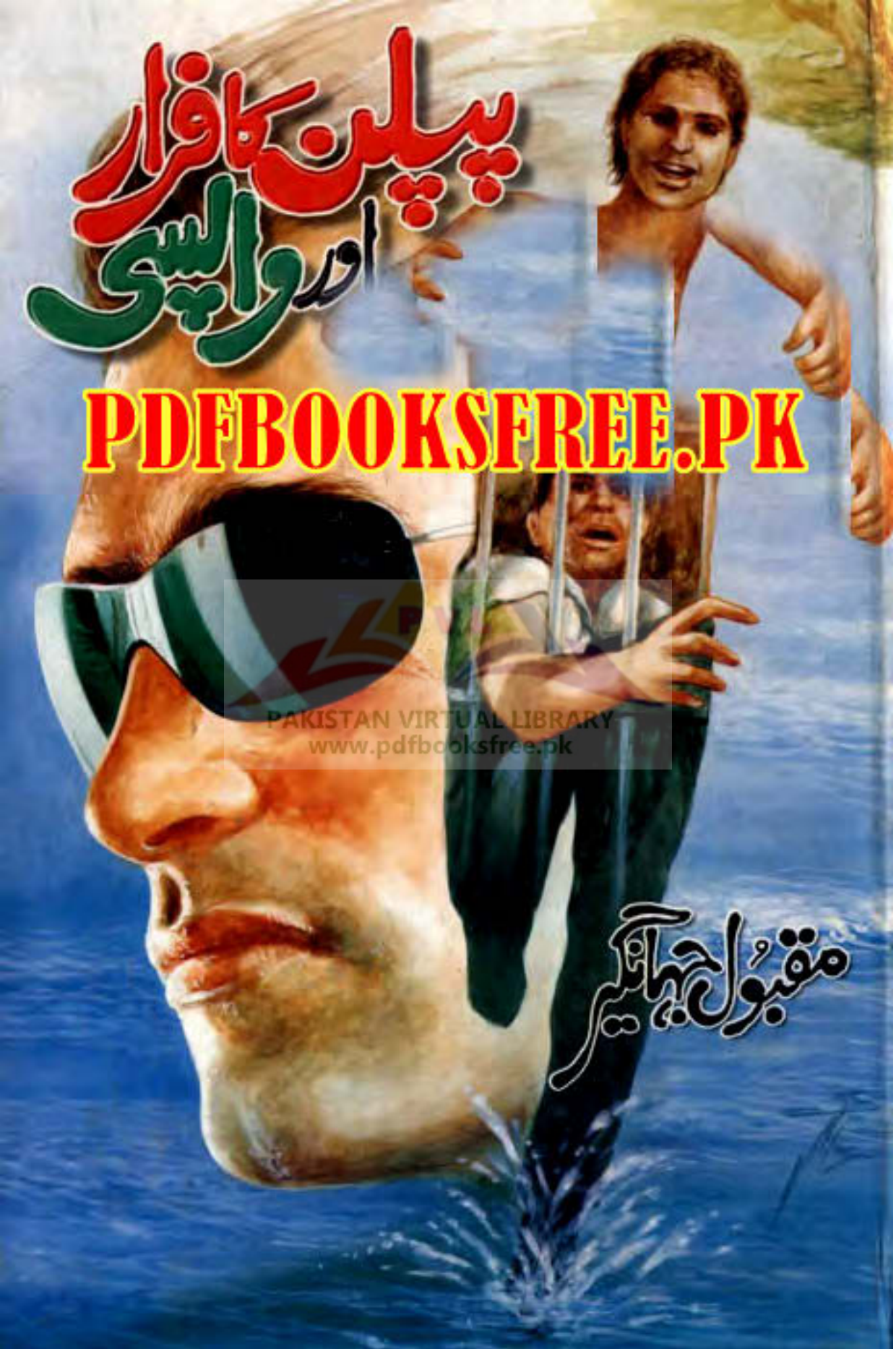
پیپلن کا فرار
اور واپسی
PDFBOOKSFREE.PK
PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk
مقبول جہانگیر

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

تعارف

انسانی زندگی جدوجہد اور سعی وکاوش سے عبارت ہے۔ اگر یہ نہ ہوں تو زندگی موت کی سرحدوں کو چھونے لگتی ہے۔ ہزاروں سال سے انسان کرہ ارض پر آباد ہے جو مشکلات و مصائب میں رہ کر زندگی بسر کرتا آیا ہے۔ اس نے سمندروں کا سینہ چیرا ہے' پہاڑوں اور ویرانوں کو کھنگالا ہے اور کٹھن سے کٹھن مہمات سر کی ہیں جو آنے والوں کو روشنی اور امید کا پیغام دیتی ہیں' مگر معروف معنوں میں بُرے انسان بھی اگرچہ اپنی ذات ہی کے لیے سہی' مشکل حالات کا دیوانہ وار مقابلہ کرتے رہے اور عزم وہمت کے ایسے کارنامے انجام دے گئے جو اپنے اندر ایک پسندیدگی اور تحیر رکھتے ہیں اور لوگ انہیں پڑھ کر حیرت واستعجاب میں ڈوبتے چلے جاتے ہیں۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

''پیپلن کا فرار'' ایک ایسے ہی شخص کی حیرت انگیز داستان ہے۔ ہنری چریری عرف پیپلن آج سے نصف صدی پہلے فرانس کا ایک نامی گرامی بدمعاش اور مجرم تھا۔ اسے ایک ناکردہ جرم میں طویل سزا سنا کر دوسرے مجرموں کے ساتھ جنوبی امریکہ' فرانسیسی گی آنا کے جزائر میں بھیج دیا گیا۔ وہ بار بار فرار ہوا اور پھر پکڑا گیا۔ اسے کوڑھیوں کے جزیرے میں بھی قید کیا گیا' مگر وہ وہاں سے بھی بھاگ نکلا اور بالآخر ولندیزیوں کے زیر تسلط جزائر کوراکاؤ میں جا نکلا۔ وہاں بھی اسے قید وبند کا سامنا کرنا پڑا۔ آخر میں اس نے وینزویلا میں جا پناہ لی اور دارالحکومت کاراکاس میں نئی زندگی کا آغاز کیا۔ وہاں ایک روز کتابوں کی دکان میں اس کی نگاہ البرٹائن سارازین کی حیران کن آپ بیتی پر پڑی جس کے سرورق پر لکھا تھا کہ اس کی 123 ہزار جلدیں فروخت ہو چکی ہیں۔ پیپلن نے سوچا اگر یہ عورت ٹوٹی ہڈیوں کے ساتھ

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ایک پناہ گاہ سے دوسری پناہ گاہ میں چھپتی پھری اور اس کی داستان لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہو چکی ہے تو میں نے تو اس سے زیادہ صعوبتیں اٹھائی ہیں۔ اس نے اسکول کے بچوں کی دو کاپیاں خریدیں اور اپنی آپ بیتی لکھنے لگا۔ پھر اس نے گیارہ کاپیاں اور خریدیں اور چند مہینوں میں وہ بھی بھر گئیں۔ اس نے یہ داستان فرانسیسی زبان میں لکھی اور پھر دنیا بھر میں اس کے تراجم منظر عام پر آئے۔ اس کتاب پر مبنی فلم بھی بنی جس پر اہل مغرب نے داد و تحسین کے ڈونگرے برسائے۔

اس مہماتی کتاب کی لاکھوں جلدیں ہاتھوں ہاتھ لی گئیں۔ اس میں دلچسپی کا مرکز وہ نئی دنیا ہے جو اس کتاب میں منکشف ہوتی ہے۔ یہ دنیا پرشور سمندروں' خوفناک جنگلوں' وحشی انسانوں اور خونخوار درندوں کے درمیان خطرناک مہمات اور پراسرار واقعات سے ترتیب پاتی ہے۔ پیپلن کا بیان سحر انگیز ہے جو قاری کے احساسات کو فوراً اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ یہ نئی دنیا ایک زیر زمین دنیا ہے۔ مصنف نے اسے اندر رہ کر سیکھا اور غیر معمولی فطری ذہانت سے اسے بیان کر دیا۔ وہ اس دنیا کی اقدار کو قبول کرتا ہے۔ جرأت' عزم' حوصلہ وفاداری اور استقلال وہ لازوال قدریں ہیں جو اس ہمت افروز ڈرامے کی اساس ٹھہرتی ہیں اور پڑھنے والوں کو دعوت عمل دیتی ہیں۔

فرار اور مہم جوئی کی یہ غیر معمولی داستان اردو ڈائجسٹ میں مئی 1975ء میں چھپنی شروع ہوئی تھی۔ اسے قارئین میں وہ مقبولیت حاصل ہوئی جو اردو میں پہلے مہم جوئی کی کسی کہانی کو نصیب نہیں ہوئی تھی۔ قدم قدم پر حیرتوں کا سماں باندھنے اور ہر موڑ پر سانس روک دینے والی یہ کہانی اکتوبر میں مکمل ہوئی تو قارئین نے بجا طور پر محسوس کیا کہ ابھی اسے جاری رہنا چاہیے تھا۔ یقیناً یہ کتاب اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

پیپلن کا فرار

26 اکتوبر 1931ء کی صبح کا ذکر ہے۔ آٹھ بجے تھے کہ انہوں نے مجھے جیل کی کوٹھڑی سے نکالا۔ میں تھوڑی دیر پہلے ہی ڈاڑھی مونچھ صفاچٹ کر کے اٹھا تھا اور نئے کپڑے پہن رہا تھا۔ نہایت عمدہ قمیض' پتلون اور دیدہ زیب شوخ ٹائی باندھ کر آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا' تو جی خوش ہوا کہ ہم بھی ہزاروں میں ایک ہیں۔ ان دنوں جوانی مجھ پر ٹوٹ کر برس رہی تھی۔ پچیس چھبیس برس کی عمر' اچھا کھانا' اچھا پینا' فکر نہ فاقہ روپے پیسے سے فراغت۔ زیر زمین دنیا کے علاوہ شرفا میں بھی عزت بنی ہوئی۔ پولیس والوں نے مجھے دیکھا' کچھ ہنسے' کچھ مسکرائے' میری جامہ زیبی کی تعریف کی اور کہا کہ وہ ہتھکڑیاں ڈالنا مناسب نہیں سمجھتے۔ پانچ وہ تھے' ایک میں تھا' بھاگ کر جاتا بھی کہاں؟ یوں بھی ان کے شائستہ رویے سے میں نے یہ اندازہ کیا شاید وہ یہ محسوس کر رہے ہیں کہ میں بری ہو جاؤں گا۔

عدالت میں پہنچے تو میرا وکیل دوڑا ہوا آیا اور اس نے بتایا کہ پالا مار لیا ہے۔ استغاثہ جرم ثابت نہیں کر سکا اور عدالت تمہیں رہا کر دینے پر مجبور ہے..... ہر وکیل ایسا ہی کہتا ہے۔ یوں نہ کہے تو اس کا کاروبار کیسے چلے؟ میں چپکا سنتا رہا۔ دس بجے جیوری کے ارکان' مجسٹریٹ صاحبان اور صدر صاحب اپنی اپنی نشستوں پر رونق افروز ہوئے۔ صدر عدالت پھولے ہوئے جسم اور پست قامت کا ایک جج تھا جس نے چندھی چندھی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ اس کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے یکسر خالی تھا۔ استغاثہ کا وکیل بھی میری طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو میں نے تمہیں آخر کار بلا ثبوت پھانس ہی دیا نا؟ جیوری کے بقیہ ارکان سماعت کے دوران میں ہمیشہ اونگھنے کے عادی تھے اور انہیں کبھی کچھ پتہ نہ چلا کہ کیا کارروائی ہو رہی ہے۔ ایسے معصوم صفت لوگ پھر کبھی نہ دیکھے گئے۔ تھوڑی دیر بعد صدر عدالت نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ مجھے قتل کا مجرم قرار دے کر عمر قید با مشقت کی سزا دی گئی۔ پولیس والوں کے چہرے مسرت سے کھل اٹھے۔ وکیل استغاثہ نے فخر سے سینہ تان لیا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

''تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟ کوئی درخواست؟''

''جی ہاں جناب والا۔'' میں نے کہا' ''میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ جس جرم کی مجھے سزا دی جا رہی ہے' وہ ہرگز مجھ سے سرزد نہیں ہوا۔ یہ پولیس نے میرے خلاف پرانی دشمنی کے تحت مقدمہ بنایا ہے۔''

''براہ کرم مجرم کو عدالت سے باہر لے جایا جائے۔'' جج صاحب نے پولیس والوں کو حکم دیا اور کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ پولیس والوں نے بڑھ کر میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی اور قریب ہی ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گئے۔ میں نے سگریٹ طلب کیا جو مجھے فوراً دیا گیا۔ اس کے بعد پولیس گاڑی آئی جس میں چاروں طرف کوئی درجن بھر مسلح سپاہی کھڑے تھے۔ انہوں نے مجھے گاڑی میں سوار کرایا اور سارجنٹ پولیس نے ڈرائیور کو جیل چلنے کا حکم دیا۔

فرانس کی ملکہ میری انتونی کے نام پر بنائی گئی جیل میں مجھے لے جایا گیا۔ یوں تو مجھے پیرس کی کئی جیلوں اور حوالات میں داخلے کا فخر حاصل تھا' مگر اس منحوس جیل میں آنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ پولیس سارجنٹ نے مجھے ہیڈ وارڈن کے سپرد کیا۔ اس نے باقاعدہ ایک کاغذ پر دستخط کر کے ''وصولی'' کی اور میری ہتھکڑی کا معائنہ کرتے ہوئے بولا:

''کیوں برخوردار کتنی کاٹو گے؟''

''عمر قید میں آیا ہوں۔''

''اچھا.....!'' اس نے حیرت سے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا' پھر پولیس گاڑی کی طرف گھور کر دبی زبان سے بولا: ''ان بدمعاشوں سے خدا ہر شریف آدمی کو بچائے۔ قانون کے نام پر سب سے گھناؤنے جرم یہ سور خود کرتے ہیں۔''

پھر وہ مجھے جیلر کے سامنے لے گیا۔ یہ پچاس سال کا ایک ادھیڑ عمر اور مضبوط جسم کا مالک شخص تھا۔ معلوم ہوا وہ اخبارات میں میرے مقدمے کی کارروائی غور سے دیکھتا رہا ہے اور اس بات کا قائل ہے کہ میرے ساتھ انصاف نہیں ہوا۔ اس نے بھی پولیس والوں کو دو تین وزنی وزنی گالیاں دیں اور وارڈن کو حکم دیا کہ میری ہتھکڑی فوراً کھول دی جائے۔ اس کے بعد وہ مجھے لے کر جیل کے اس حصے میں گیا جہاں قاتلوں' پاگلوں اور ایسے مجرموں کو رکھا جاتا ہے جنہیں عمر قید یا مشقت کی سزا دی گئی ہو۔

جب وہ مجھے کوٹھڑی میں بند کر کے اور دوہرے آہنی جنگلے پر بھاری قفل ڈال کر چلا گیا' تو میں نے سنجیدگی سے اپنے حالات کا جائزہ لیا۔ اس مرتبہ برے پھنسے بیٹا پیپلن.....عمر قید با مشقت میں تو تمہارا پلیتھن نکل جائے گا۔ اس تصور کے ساتھ ہی میرے خون کی گردش تیز ہو گئی۔ کنپٹیاں گرم ہونے لگیں۔ کیا مجھے اپیل کرنی چاہیے؟ نہیں۔ نہیں میں ان بے رحم' سنگ دل اور بے انصاف لوگوں سے کچھ مانگنے کو تیار نہیں۔ مجھے آگے بڑھ کر اپنا حق چھیننا ہوگا' اپنی آزادی مجھے خود حاصل کرنا ہوگی۔ ان بے ضمیر لوگوں سے کوئی توقع رکھنا بالکل بے کار ہے۔ مجھے ان سے انتقام لینے کے لیے تیار ہونا پڑے گا۔ ایک بھیانک انتقام! ان سب لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارنا میرا فرض ہوگا جنہوں نے مجھے یہاں تک پہنچایا ہے.....یہ خیالات میرے ذہن میں ہلچل مچا رہے تھے اور میں اپنی کوٹھڑی میں بپھرے ہوئے چیتے کی مانند ٹہل رہا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے ہر قیمت پر یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ میں اپنی قیمتی زندگی اس بے ہودہ یا کسی بھی جیل میں ہرگز ضائع نہیں کروں گا مگر.....کیا میں اکیلا اس منصوبے پر کامیابی سے عمل کر سکوں گا؟ مجھے اپنے ساتھ ایک نہ ایک بدمعاش کو ملانا ہوگا' لیکن کیسے؟

دیر تک میں سوچتا رہا۔ یکا یک بجلی کی مانند میرے ذہن میں ڈیگا کا خیال آیا.....ڈیگا.....فرانس کا نامور بدمعاش.....وہ بھی تو اسی جیل میں ہے۔ مجھے ہر صورت میں اس سے رابطہ قائم کرنا چاہیے۔ ڈیگا کا تصور اتنا خوش کن تھا کہ ایک لمحے میں میرے اعصاب پرسکون ہو گئے اور یوں محسوس ہوا جیسے تمام پریشانیاں دور ہو گئی ہوں۔ سہ پہر کو میں نے وارڈن سے کہا کہ میں بال کٹوانا چاہتا ہوں' مجھے حجام تک لے جایا جائے یا حجام کو یہاں بھیج دیا جائے۔ تجربے کی بناء پر مجھے معلوم تھا کہ ایک دوسرے سے رابطہ استوار کرنے کے لیے جیل کا حجام بہترین آدمی ہے' ہر شخص شیو بنوانے یا بال کٹوانے اس کے پاس ضرور آتا ہے' چنانچہ جیلر نے مجھے ایک گارڈ کی نگرانی میں حجام تک لے جانے کی منظوری دے دی۔ وہاں کیا دیکھتا ہوں بال کٹوانے اور شیو بنوانے والے قیدیوں کی ایک طویل قطار لگی ہے۔ میں نے غور سے سب کا جائزہ لیا اور یہ دیکھ کر چلو بھر خون بڑھ گیا کہ ڈیگا بھی اس قطار میں کھڑا اپنی باری کا منتظر ہے.....میں ٹہلتا ہوا اس کے قریب گیا۔ اس نے نگاہ اٹھا کر میری طرف دیکھا اور حیرت کے آثار اس کے چہرے پر نمودار ہوئے۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ میں نے آنکھ کے اشارے سے منع کر دیا' خدا کا شکر اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

گارڈ نے مجھے وہیں چھوڑا اور چند قدم پر کھڑے ہوئے اپنے دو اور ساتھیوں سے گپ شپ کرنے لگا۔ موقع پا کر میں نے چپکے سے کہا:

"ڈیگا! کیا حال چال ہے؟"

"گزر رہی ہے یار..... پندرہ سال کے لیے آیا ہوں' تم اپنی کہو' میں نے سنا ہے تمہیں بھی عمر قید دی ہے انہوں نے۔"

"ہاں' مگر میں نے بھاگنے کا ارادہ کر لیا ہے' تمہارے کیا ارادے ہیں؟"

"ابھی تو میں نے کچھ سوچا نہیں۔ چند دن میں یہاں کے رنگ ڈھنگ کا اندازہ ہو تو کچھ فیصلہ کروں۔ اچھا یہ بتاؤ کچھ مال وال بھی ہے تمہارے پاس؟ بغیر مال کے فرار کا منصوبہ بنانا احمقوں کا کام ہے۔"

"اس وقت تو میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں' تمہارے پاس کچھ ہے؟"

"تم جانتے ہو' میں کبھی خالی ہاتھ جیل نہیں آتا۔ اب بھی میرے پاس اسٹرلنگ پونڈ کی شکل میں کم از کم دس ہزار فرانک موجود ہیں۔ جیل میں روپے کے بغیر دھندا چلتا ہی نہیں۔ تمہارا گزارا کیونکر ہوگا..... تم فوراً اپنے وکیل کو بلواؤ اور اس کے ذریعے اپنی بیوی کو پیغام بھیجو کہ وہ پلان میں دولت بھر کر دانتے کے حوالے کر دے۔ دانتے کو تم جانتے ہی ہو میرا پرانا آدمی ہے' وہ یہ پلان یہاں پہنچا دے گا اور میں تمہارے حوالے کر دوں گا۔"

ڈیگا کا مشورہ درست تھا۔ جیل میں روپے پیسے کے بغیر ایک روز بھی اطمینان سے بسر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اس کی انتہائی مہربانی تھی کہ اس نے اپنے آدمی کے ذریعے پلان منگوا دینے کا وعدہ کر لیا۔ اپنے معصوم اور بے ضرر قارئین کی معلومات کے لیے میں اس لفظ "پلان" کی مختصر سی تشریح کر دوں تو اچھا ہے۔

پلان..... دراصل کسی بھی دھات کی بنی ہوئی ایک پتلی سی نلکی ہوتی ہے جس میں کرنسی نوٹ' ہیرے' سونا یا ایسی قیمتی چیزیں بھر لی جاتی ہیں اور پھر یہ نلکی حلق کے ذریعے اس آنت میں اتار لی جاتی ہے جس میں غذا تحلیل ہوتی ہے۔ یہ کام خاصی مہارت اور مشاقی کا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے قیدی کے پاس روپیہ پیسہ ہر وقت موجود رہتا ہے' اسے تلاشی' برآمدگی یا چوری کا خوف نہیں رہتا' مجرموں کی اصطلاح میں اس نلکی کو "پلان" کہتے ہیں۔

غرض میں نے ڈیگا کے مشورے پر عمل کیا۔ یہ ایلومونیم کی ایک نہایت ہلکی اور چمک دار ٹیوب تھی جو درمیان میں ایک پیچ کی مدد سے کھل کر دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی تھی۔ اس نلکی کے اندر میری وفادار بیوی نے ساڑھے پانچ ہزار فرانک کی مالیت کے بل رکھ کر بھیجے تھے۔ میں نے اس چھوٹی سی ٹیوب کو خوشی سے چوما جو انسانی انگوٹھے کے برابر موٹی اور تقریباً ڈھائی انچ لمبی تھی پھر اسے میں نے اپنے حلق میں اتار لیا۔ اب میں بھی ڈیگا کی طرح ایک مال دار قیدی تھا اور میرا مال ایسی جگہ محفوظ تھا جہاں اسے کوئی چرا سکتا تھا نہ ڈھونڈ سکتا تھا۔

رات کو جب میں آہنی پلنگ پر سونے کے لیے لیٹا' تو اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کی آگ کچھ اور تیز ہو چکی تھی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ پلان کی موجودگی میں جیل سے فرار ہو جانا کچھ مشکل نہ ہوگا۔ میں نے سوچا کہ یہاں سے نکلتے ہی سب سے پہلے اس جج کو قتل کروں گا جس نے مجھے عمر قید کی سزا دی۔ پھر وکیل استغاثہ کا نمبر آئے گا۔ اس کے بعد ان مخبروں کا جنہوں نے پولیس کو اطلاع دی۔ پھر ان پولیس والوں کا جنہوں نے مجھ پر جھوٹا کیس بنوایا۔ اس طرح مجھے کم از کم آٹھ نو افراد کو موت کے گھاٹ اتارنا تھا۔ اس کے بعد خواہ یہ گلوٹین کے ذریعے میرا سر کاٹ ڈالیں یا پھانسی پر لٹکا دیں۔ یا جو جی چاہے کریں' مجھے سب منظور تھا۔

تیسرے روز انہوں نے مجھے اس کوٹھڑی سے نکال کر ایک اور جگہ پہنچا دیا' شاید انہوں نے میرے دلی خیالات کا مطالعہ کر لیا تھا۔ اس مرتبہ جس کوٹھڑی میں مجھے لے جایا گیا وہ مشکل سے پانچ فٹ چوڑی اور سات فٹ لمبی تھی۔ اس کے دو آہنی دروازے تھے اور روشن دان کی اونچائی کوئی تیرہ فٹ۔ چھت میں ایک بڑا برقی بلب نصب تھا۔ مجھے حکم دیا گیا دن کے وقت پلنگ پر لیٹنے کی اجازت نہیں ہے۔ لکڑی کے اس اسٹول پر بیٹھنا ہوگا جو دیوار کے ساتھ رکھا ہوا ہے۔ بیٹھنے کو جی نہ چاہے تو ٹہلتے رہو' اور اگر تمہیں لیٹے ہوئے دیکھ لیا گیا تو سخت سزا دی جائے گی۔ رات ہوئی تو یہ طاقت ور بلب روشن کر دیا گیا۔ اس کی روشنی اس قدر تیز تھی کہ میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ آخر میں نے اپنا رومال آنکھوں پر باندھا اور جیل حکام کو گالیاں دیتا ہوا سو گیا۔ غالباً انہوں نے مجھے ڈیگا سے راز و نیاز کرتے دیکھ لیا تھا۔ ممکن ہے انہوں نے ڈیگا کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا ہو۔

چوبیس گھنٹے میں مجھے صرف ایک مرتبہ کوٹھڑی سے نکالا جاتا اور وہ بھی تھوڑی دیر کے لیے۔ اس کے بعد وہی قید تنہائی۔ میں نے کئی بار گارڈ سے کہا کہ وہ جیلر کو بلوائے تاکہ میں اس

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

سے پوچھوں کہ اس رویے کا مطلب کیا ہے' لیکن ہر بار میری درخواست سنی ان سنی کر دی گئی۔ تیسرے روز گارڈ نے لوہے کی وہ چھوٹی سی کھڑکی کھولی جو دروازے میں لگی تھی اور میری جانب ایک پیکٹ بڑھایا۔ میں نے بے صبری سے پیکٹ کھولا' اس میں ایک تازہ ڈبل روٹی' دو ڈبیا سگریٹ' ایک ماچس اور ایک مکھن کی ٹکیہ برآمد ہوئی۔ گارڈ نے صرف اتنا کہہ کر کھڑکی بند کر دی کہ یہ پیکٹ تمہاری بیوی نے بھجوایا ہے۔ میں نے سب سے پہلے ڈبل روٹی کے ٹکڑے گنے۔ کیا دیکھتا ہوں ان ٹکڑوں کے درمیان کاغذ کا ایک پرزہ رکھا ہوا ہے۔ اس پرزے پر یہ عبارت لکھی تھی:

''میں خیریت سے ہوں' تم سے ملاقات کو جی چاہتا ہے' ماچس کی ڈبیا میں تین جوئیں بند ہیں۔ یہ جوئیں گارڈ کو دکھاؤ اور اس سے کہو کہ تمہارے کپڑوں میں جوئیں پڑ گئی ہیں اور بالوں میں بھی جوئیں ہیں۔ لہٰذا وہ تمہیں فوراً گرم حمام میں جانے کی اجازت دے دیں گے۔ میری ڈیوٹی آج کل وہیں ہے..... ڈیگا۔''

میں نے ماچس کی ڈبیا کھولی۔ اس میں بھورے رنگ کی تین پلی ہوئی جوئیں کلبلا رہی تھیں۔ ڈیگا کی اس انوکھی تدبیر اور حاضر دماغی پر میں عش عش کر اٹھا۔ ظالم نے ملنے کا کیا طریقہ نکالا تھا' استاد پھر استاد ہے۔ جونہی میں نے جوؤں کا شاخسانہ کھڑا کیا' جیلر اور وارڈن دونوں بھاگے بھاگے آئے' جیل میں اور سب کچھ قابل برداشت ہے' گندگی کے سوا..... چنانچہ کسی تاخیر کے بغیر فوراً اس عاجز کو گرم حمام کی جانب روانہ کیا گیا۔ ظاہر ہے محافظوں اور نگرانوں کی موجودگی میں ڈیگا سے راز و نیاز ممکن نہ تھا اس لیے سگریٹ کا ایک پیکٹ دینے کا وعدہ کر کے انہیں چند لمحوں کے لیے ٹالا۔ ڈیگا میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور بتایا کہ پلان پہنچ گیا اور اسے حلق کے اندر اتارنے میں کوئی تکلیف بھی نہیں ہوئی۔ اس نے اس سلسلے میں دو تین نکتے میرے ذہن نشین کرائے' آخر میں نے کہا:

''تمہارا پروگرام اب کیا ہے؟ کیا زندگی بھر اسی جیل میں رہنے کا ارادہ ہے۔''

''اس جیل کی مجھے کچھ پروا نہیں پیپلن' یہاں سے تو میں جب چاہے نکل سکتا ہوں' یوں بھی میں یہاں شرافت سے رہوں تو پانچ سال کی تخفیف ہو سکتی ہے' مگر میں جانتا ہوں کہ یہ حرامی مجھے یہاں رہنے نہیں دیں گے اور کسی نہ کسی چکر میں پھنسا کر بیگنی میں بھیج کر رہیں گے اور بیگنی جیسے جہنم میں جانے سے بہتر ہے کہ آدمی خودکشی کر کے قصہ پاک کر لے۔

پیارے بھائی' میں جیل سے نہیں گھبراتا اور نہ محنت مشقت سے ڈرتا ہوں۔ میری روح فنا ہوتی ہے بیگنی کا نام سن کر..... فرنچ گیانا کے جزائر میں قیدیوں کی یہ کالونی نہایت بھیانک مقام ہے۔ جو وہاں گیا' اس کی حالت مردوں سے بدتر ہوئی۔ میرے گروہ کے کئی آدمی اب بھی وہیں ہیں لیکن کوئی تپ دق میں مبتلا ہے' کوئی فالج میں اور کوئی کوڑھی ہو گیا ہے..... یہ امراض وہاں کے خاص تحفے ہیں۔ ہر سال وہاں کم از کم اسی فی صد قیدی ان امراض میں مبتلا ہوتے ہیں اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر زندگی کے دن کاٹتے ہیں۔ پیلا بخار وہاں عام ہے۔ یہ ایسا موذی مرض ہے کہ ہاتھی کو بھی چند روز میں گھلا گھلا کر لکڑی بنا دیتا ہے۔

''پھر تم انتظار کس بات کا کر رہے ہو؟'' میں نے کہا' ''یہاں سے نکلو۔''

وہ مسکرایا' ''تم ابھی نوجوان اور ناتجربہ کار ہو پیپلن' اس جیل سے نکلے' تو پولیس شکاری کتوں کی مانند ہمارے تعاقب میں لگ جائے گی۔ اور اگر ہم پاتال میں بھی چلے جائیں گے' تو یہ ہمیں وہاں سے کھینچ نکالے گی' جب تک ہم فرانس میں ہیں فرانسیسی پولیس اور فرانسیسی قانون ہمارا ذمہ دار ہے' لیکن یہاں سے ایک بار رخصت ہوتے ہی اور فرنچ گیانا کی عمل داری میں داخل ہوتے ہی فرانسیسی پولیس سے ہمارا رشتہ منقطع۔ اس کے بعد ہم وہاں سے فرار بھی ہو جائیں' تو فرنچ قانون ہمیں دوبارہ گرفتار کرنے سے قاصر ہے۔ سمجھتے ہو؟ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ جب ہم دوسرے قیدیوں کے ساتھ فرنچ گیانا بھیجے جائیں تو ہم وہاں سے بھاگنے کی کوشش کریں..... اور یہ سوچ لو کہ وہاں سے بھاگنا خالہ جی کا گھر نہیں..... چاروں طرف سمندر..... پھر جیل کے اندر جیل..... دن رات کی کڑی نگرانی..... اس کے باوجود بھاگنے والے بھاگتے ہیں اور کبھی کبھی محافظوں کے ہتھے بھی چڑھ جاتے ہیں۔ پھر ان کی زندگی محافظوں کے رحم و کرم پر ہوتی ہے' چاہے تو جان بخش دیں' چاہے تو گولی مار دیں' البتہ روپیہ وہاں بھی ہمارے کام آ سکتا ہے' اسی لیے میں نے ''پلان'' کا انتظام کیا۔''

باہر قدموں کی آہٹ سنائی دی اور میں نے جلدی سے بھاپ کا نل کھول دیا۔ گرم گرم بھاپ میں ''نہانے'' کا اتفاق شاید بہت کم لوگوں کو ہوا ہو' لیکن اگر عذاب الٰہی کوئی مختلف چیز نہیں' تو اس بھاپ کو بھی اس میں شامل کر لینا چاہیے۔ معلوم ہوا جیسے مجھے شعلوں کے اندر پھینک دیا گیا ہے۔ اذیت تو بہت ہوئی لیکن جسم اور کپڑوں کا تمام میل کچیل اچھی طرح دور ہو گیا اور طبیعت میں خاصی تازگی آ گئی۔ ڈیگا نے اشارے سے کہا کہ اب اتوار کے اتوار جیل

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کے گرجے میں ملاقات ہوا کرے گی۔ اسی لمحے دونوں محافظ اندر آ گئے اور میں ان کے ساتھ اپنی کوٹھڑی میں چلا آیا۔

رات کو سونے کے لیے جب بستر پر لیٹا' تو بیگنی کے حالات خود بخود سامنے آ گئے۔ ڈیگا نے جو کچھ بتایا تھا' اگر وہ سچ ہے' تو جہنم اس سے زیادہ اور کیا ہوگا۔ پیلا بخار' خونی پیچش' ملیریا' کوڑھ' خارش' تپ دق..... دہشت زدہ ہو کر میں نے سوچا کہ پھر خودکشی ہی مناسب رہے گی' خارشی کتے یا کوڑھی کی طرح زندگی بسر کرنا میرے لیے ممکن نہیں' اس سے موت لاکھ درجے بہتر ہے۔ آہستہ آہستہ مجھے ایسے قیدی یاد آنے لگے جو ان خطرناک اور مہلک جزیروں سے بھاگ کر فرانس پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اف خدایا! کیسے بھیانک چہرے تھے۔ ان کے' اور کس قدر ان کی حالت عبرت انگیز تھی..... ڈیگا جیسا بدمعاش بھی خوفزدہ تھا جیسے دنیا کی کوئی طاقت ڈرا نہیں سکتی تھی۔ یوں تو ڈیگا کے بے شمار زیر زمین دھندے ایسے تھے جن میں وہ لاکھوں پیدا کر سکتا تھا' مگر اصل کاروبار جعلی کرنسی بنانے اور چلانے کا تھا۔ اس کی کئی خفیہ فیکٹریاں اور ٹکسالیں تھیں۔ جہاں ہر ملک کی کرنسی..... پونڈ' فرانک' لیرے' ڈالر وغیرہ تیار کی جاتی تھی اور اس کے کارندے دنیا بھر میں گھوم پھر کر اس نقلی کرنسی کے عوض اصلی کرنسی حاصل کرتے تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے کچھ عرصے بعد جب حکومت نے نیشنل ڈیفنس بانڈ کی سکیم چلائی' تو ڈیگا نے بھی لاکھوں کی تعداد میں جعلی بانڈ چھاپ دیے۔ ان کا کاغذ اور ان کی پرنٹنگ اتنی نفیس تھی کہ بڑے سے بڑا ماہر بھی اصلی اور نقلی بانڈز کی پہچان نہ کر سکتا تھا سرکاری بنک خوشی سے قبول کر لیتے تھے۔ ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ مال کہاں تیار ہو رہا ہے لیکن کوئی بھی مجرم خواہ کتنا ہی ہوشیار ہو' کبھی نہ کبھی قانون کی نگاہ میں آ ہی جاتا ہے' اور بعض اوقات اس کی معمولی سی غلطی اسے لے بیٹھتی ہے۔ ڈیگا کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا' اس کا ایک ایجنٹ جس کا نام بروئی تھا' موقع پر پکڑا گیا اور اس نے اقرار کر لیا کہ بانڈز جعلی ہیں۔

بروئی نہایت وفادار ملازم تھا۔ اس نے آخر وقت تک پولیس کو ڈیگا کا نام نہ بتایا۔ یہ ذکر ہے۔ 1929ء کا..... ایک رات ڈیگا اپنے عالی شان شراب خانے میں موجود تھا کہ ایک نوجوان اور حسین لڑکی وہاں آئی' اس نے ایک ویٹر سے پوچھا کہ سائنور لوئی ڈیگا کہاں تشریف رکھتے ہیں۔ ڈیگا نے فوراً اپنا تعارف کرایا اور آفس میں لے گیا۔

''فرمایئے مادام' میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔''

''میں بروئی کی بیوی ہوں۔'' لڑکی نے کہا: ''آپ جانتے ہیں وہ جعلی بانڈز چلانے کے جرم میں پکڑا گیا ہے اور آج کل حوالات میں ہے۔ آج میں اس سے ملی تھی' اس نے مجھے آپ کے شراب خانے کا پتہ دیا اور کہا' آپ تک یہ پیغام پہنچا دوں کہ بیس ہزار فرانک کی رقم بطور فیس اس کے وکیل کو ادا کر دیں۔''

یہ سن کر ڈیگا ہنسا اور یہ جانتے ہوئے کہ ایک عورت اس کے راز سے آگاہ ہو گئی ہے اور وہ اس کے ملازم ایجنٹ بروئی کی بیوی بھی ہے' اس نے ایسا جملہ کہا جو ڈیگا جیسے دور اندیش اور سمجھ دار شخص کو کبھی نہ کہنا چاہیے تھا۔ اس نے کہا:

''مادام' میں آپ کے شوہر کو نہیں جانتا کہ وہ کون ہے اور جہاں تک رقم کی ادائیگی کا تعلق ہے' میرے پاس ایک کوڑی نہیں۔ آپ جوان ہیں حسین ہیں..... بیس ہزار فرانک کما لینا آپ کے لیے معمولی بات ہے..... جایئے پیرس کی تاریک گلیوں میں اپنے گاہک تلاش کیجیے''

یہ الفاظ سن کر لڑکی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا مگر وہ کر ہی کیا سکتی تھی' سوائے آنسو بہانے کے..... چنانچہ بے چاری آنسو بہاتی چلی گئی۔ جاتے ہی حوالات میں اپنے شوہر سے ملی اور ڈیگا کے بے ہودہ سلوک کا ذکر کیا..... بروئی یہ قصہ سنتے ہی آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے وعدہ معاف گواہ بن کر سارا بھانڈا پھوڑ دیا' راتوں رات موسیو ڈیگا اپنے ساتھیوں سمیت دھر لیے گئے اور یوں ذرا سی حماقت اور معمولی سی رقم نہ دینے کے عوض زندگی بھر کا عذاب مول لے لیا۔

اس رات ایک لمحے کے لیے بھی مجھے نیند نہ آئی۔ یوں محسوس ہوتا جیسے انگاروں پر لوٹ رہا ہوں۔ کبھی اپنی حالت کو دیکھتا' کبھی ان دشمنوں کا خیال آتا جنہوں نے میری زندگی برباد کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ کبھی پولیس کی دھاندلیاں یاد آتیں اور کبھی وہ پھولے ہوئے جسم اور چندھی آنکھوں والا جج عالم تصور میں دکھائی دیتا جس نے قانون کی پٹی آنکھوں پر باندھ کر مجھے اس جہنم میں دھکیل دیا۔ پھر بوڑھے پادری کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ ذہن میں گونجنے لگتے اور میں دیوار سے اپنا سر ٹکرانے لگتا۔ میری سمجھ میں یہ بات آتی ہی نہ تھی کہ دشمن کو بھی معاف کیا جا سکتا ہے۔

ڈیگا نے جو کچھ بیان کیا تھا اس کی روشنی میں اس جیل سے فرار ہونا بے سود تھا۔ لہٰذا بیگنی یا کسی اور جزیرے پر آباد قیدیوں کی کالونی کی سیر کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اب میں صبر و استقلال سے آنے والے وقت کا انتظار کرنے لگا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

اس وقت کا انتظار زیادہ دیر نہ کرنا پڑا اور صرف دو ہفتے بعد ہی صبح کے چار بجے ہم سات خطرناک عمر قید کے مجرموں کو کوٹھڑیوں سے نکال کر جیل کے صحن میں کھڑا کر دیا گیا' ہمارے چاروں طرف مسلح گارڈ حشرات الارض کی مانند پھیلے ہوئے تھے۔ وارڈن اور جیلر نے ہم میں سے ہر ایک کا چہرہ غور سے دیکھا' پھر اس کی شناخت ہماری تصویروں سے کی اس طرح سے مطمئن ہو کر انہوں نے حکم دیا:

''سب قیدی اپنے جوتے اور کپڑے اتار کر اپنے سامنے رکھ دیں۔''

ہم نے حکم کی تعمیل کی' صبح کے چار بجے' اس سخت ٹھنڈ میں جسم کے سارے کپڑے اتروا کر مادر زاد برہنہ کر دینے کی وجہ سمجھ میں نہ آئی' مگر ہم خاموش رہے۔ ایک نگران نے ہم سب کے کپڑوں کی الگ الگ گٹھڑیاں باندھ دیں۔ ان پر ہمارے نمبر درج کیے اور گٹھڑیاں صحن میں ایک جگہ ڈھیر کر دیں۔ پھر دوسری گٹھڑیاں لائی گئیں' ان میں قمیصیں اور پتلونیں بھری تھیں' جوتے بھی تھے۔ حکم ہوا قیدی ان میں سے اپنے اپنے ناپ کی دو دو قمیصیں اور پتلونیں اور دو دو جوتے اٹھا لیں۔ یہ لباس جس بیہودہ کپڑے کا بنایا گیا تھا' اسے ٹاٹ ہی کہا جا سکتا ہے اور جوتے..... انہیں جوتے کہنا ہی زیادتی ہوگی۔ وہ نہایت ذلیل قسم کی کھڑاویں تھیں۔ جب ہم نے یہ اول جلول کپڑے اور کھڑاویں پہن لیں تو ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگے۔ جیلر چلایا:

''ہنسومت' ایک قطار میں کھڑے ہو جاؤ' ایک کے پیچھے ایک' ریڈی کوئک مارچ دائیں طرف۔''

بیس مسلح محافظوں کے ساتھ ہم فوجیوں کی طرح مارچ کرتے ہوئے چلنے لگے۔ جیل کے پھاٹک کے اندر ایک بڑی پولیس وین کھڑی تھی۔ ہمیں محافظوں سمیت اس وین کے اندر ٹھونس دیا گیا۔ معلوم ہوا اب ہمیں کاین کی بدنام زمانہ جیل بیولیو میں ارسال کیا جا رہا ہے۔ میں اس وقت فکر فردا سے بالکل بے نیاز ڈیگا کے بارے میں سوچ رہا تھا جو وین کے اگلے حصے میں گردن جھکائے خراٹے لے رہا تھا۔

✣ ✣ ✱ ✣ ✣

جونہی ہم بیولیو جیل کے اندر گئے اور وہاں کے حکام نے ہمیں وصول کیا' ہمیں فوراً ڈائریکٹر کے آفس میں لے جایا گیا۔ ڈائریکٹر گویا جیل کا بادشاہ ہوتا ہے اور اس کے احکام کو کوئی شخص جیل کے اندر چیلنج نہیں کر سکتا۔ ہم نے دیکھا کہ ڈائریکٹر صاحب اپنے لمبے چوڑے کمرے میں تین فٹ اونچے پلیٹ فارم پر عدالت کے ججوں کی طرح نہایت شان دار میز کرسی سجائے فرعون بے سامان بنے رونق افروز ہیں۔ انہوں نے ہم پر وہ نگاہ ڈالی جو حقیر کیڑے مکوڑوں پر ڈالی جاتی ہے۔ ہمارے دائیں جانب کھڑے ہوئے ایک گارڈ نے حلق پھاڑ کر کہا:

''اٹن شن۔'' ہم سب اٹن شن ہو گئے۔ ''اب ڈائریکٹر صاحب جیل' تم قیدیوں سے خطاب فرمائیں گے۔'' موصوف پورے وقار اور شان تمکنت سے کھڑے ہوئے اور ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے فرمایا:

''قیدیو! تمہیں معلوم ہے یہ جیل ہے' تمہیں یہاں عارضی طور پر چند روز کے لیے رہنا ہے۔ کتنے روز؟ یہ میں نہیں بتا سکتا' ممکن ہے ایک ہفتہ' ممکن ہے ایک مہینہ' ممکن ہے ایک سال' ممکن ہے ایک صدی..... سمجھے؟ اس کے بعد تمہیں بیگنی روانہ کیا جائے گا۔ تم جب تک یہاں رہو گے' اس عرصے میں ہدایات یہ ہیں کہ کوئی گڑبڑ نہیں' گڑبڑ کرنے کی سزا سخت ہوگی۔ خوب غور سے کان کھول کر سن لو۔ میں کوئی رعایت نہیں دوں گا' کسی قیدی کا کوئی ملاقاتی یہاں نہیں آئے گا۔ کسی کا کوئی خط نہیں آئے گا' کسی قیدی کو خط لکھنے' بھیجنے یا کوئی اور چیز جیل میں اسمگل کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔ یہاں سے فرار ہونے کی کوشش فضول ہے۔ اس جیل کے دو دروازے ہیں' اگلا دروازہ بیگنی کے جہنم کی طرف کھلتا ہے اور دوسرا قبرستان کی طرف۔ تیسرا دروازہ یہاں نہیں ہے۔ کسی کی مکمل قید تنہائی ہے اور خوراک چوبیس گھنٹے میں ایک روٹی اور پانی کا ایک پیالہ۔ دوسری مرتبہ کی سزا رائفل کی گولی..... یہاں تیسری سزا کوئی نہیں ہے۔'' دفعتاً اس نے پیرولی فو کی طرف دیکھا اور کہا:

''میں نے تمہیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے' کیا نام ہے تمہارا؟''

''جناب والا میں آپ کا پرانا خادم پیرولی فو ہوں۔ خوش قسمتی سے میں بیگنی میں کچھ عرصہ رہ چکا ہوں۔ پھر وہاں سے بھاگ نکلنے کا موقع ملا' میں فرار ہو کر اسپین چلا گیا' لیکن مجھ بدنصیب نے وہاں بھی ایک چھوٹی سی واردات کر دی جس کی سزا چھ ماہ قید کی صورت میں ملی۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

رہا ہوا تو اسپین والوں نے مجھے ''بھگوڑا قیدی'' قرار دے کر فرانس گورنمنٹ کے حوالے کر دیا۔ چنانچہ پھرتا پھراتا یہاں آ گیا۔ پہلے بھی اس جیل میں رہ چکا ہوں' جناب کو یاد ہوگا۔ اب بھی میری خدمات حاضر ہیں۔ ایک بار میں نے جناب والا کی اچھی پٹائی کی تھی کہیے تو ایک بار پھر ہڈیاں سینک دوں۔''

پیرولی فو کے یہ الفاظ سن کر میرا کلیجہ لرز گیا۔ خدا کی پناہ' کس قدر بے خوف اور دلیر شخص تھا یہ..... دراصل عادی مجرم ہونے کے باعث اس میں ڈھٹائی کی حد تک نڈر پن آ گیا تھا۔ ڈائریکٹر جیل کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ چند ثانیے وہ پیرولی کو گھورتا رہا پھر دانت پیس کر بولا:

''کتے کے بچے' تجھے اس بدتمیزی کا مزہ چکھنا ہوگا۔'' یہ کہہ کر اس نے محافظوں کو حکم دیا۔ ''اسے پکڑ کر الگ لے جاؤ اور اس کے دماغ کی گرمی اتار دو۔''

ابھی الفاظ بمشکل اس کی زبان سے نکلے تھے کہ پیرولی چیتے کی مانند اچھلا اور اس نے ایک زبردست فلائنگ کک ڈائریکٹر کی توند میں ماری۔ یہ ضرب اتنی شدید تھی کہ ایک ہولناک چیخ کے ساتھ ڈائریکٹر قلابازیاں کھاتا ہوا دیوار سے ٹکرایا۔ پیرولی کے منہ سے گالیوں کا ایک طوفان ابل پڑا۔ چشم زدن میں محافظوں نے چاروں طرف سے اسے جکڑ لیا اور گھونسے' لاتیں' ٹھوکریں مارتے ہوئے لے چلے۔ پیرولی چیخ کر کہہ رہا تھا:

''سؤر کی اولاد' ہمیں آدمی ہی نہیں سمجھتا جاؤ بیٹا' اب ایک ہفتے تک بستر سے نہ اٹھ سکو گے' پیرولی کی کک برداشت کرنا آسان نہیں ہے۔''

اور واقعی ایسا ہی ہوا..... ڈائریکٹر ایک ہفتے تک اس قابل نہ تھا کہ چل پھر سکتا۔ پیرولی کی ایک ہی دولتی نے اس کی ہڈیاں پسلیاں ہلا دی تھیں اور سارا کس بل نکال دیا تھا۔ خود پیرولی پر کیا گزری' اس کا ہمیں کوئی اندازہ نہ تھا۔ صرف اتنا پتہ چلا کہ محافظوں اور سپاہیوں نے مار مار کر اس کا پلیتھن نکال دیا اور اب وہ کسی تاریک کوٹھڑی میں پڑا ہے۔

خوش قسمتی سے ڈیگا کو میرے برابر ہی کی کوٹھڑی میں رکھا گیا اور ابھی ہم آپس میں رابطے کا کوئی طریقہ سوچ بھی نہ پائے تھے کہ ایک نئی آفت نازل ہوئی۔ پیرولی کی بدتمیزی اور گستاخی کو دیکھتے ہوئے نائب ڈائریکٹر نے فیصلہ کیا کہ وہ ساتوں نئے قیدی ایسے ہی خطرناک اور بے باک ہوں گے۔ لہٰذا ان پر نگران سخت لگایا جائے جو ایسی ہی فطرت کا ہو۔

اس جیل میں قتل اور خودکشی میں سزا بھگتنے والا ایک عمر قید کا مجرم بولارڈ بھی تھا جسے قیدیوں کا نمبردار بنا دیا گیا..... اس کا قد چھ فٹ پانچ انچ' ایک آنکھ سے کانا' بال سرخ اور جسم گینڈے کی مانند مضبوط اور قوی' جیل حکام نے اسے ایک ہنٹر بھی مہیا کر رکھا تھا جس سے یہ موذی بے دریغ قیدیوں کی پٹائی کرتا۔ انسانی شکل صورت میں یہ بلاشبہ ایک وحشی درندہ یا دیو تھا جس کی لغت میں رحم' ہمدردی' معافی یا خوش اخلاقی کا کوئی لفظ نہ تھا۔ جیل حکام کی شہ پا کر تو وہ اور کھل کھیلا..... کئی مرتبہ اس کا میرا آمنا سامنا ہوا اور اس نے ایسی حرکتیں کیں جو اچھے خاصے شریف آدمی کو مشتعل کر دینے کے لیے کافی تھیں مگر میں طرح دے گیا' تاہم مجھے اندازہ تھا کہ ایک نہ ایک دن اس کمینے سے مڈبھیڑ ضرور ہوگی۔

اب میں گزشتہ ایک ہفتے سے اپنی کوٹھڑی میں بند تھا۔ اس دوران میں کوئی انسانی چہرہ میں نے نہیں دیکھا' کوئی انسانی آواز میرے کانوں تک نہیں پہنچی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا وہ مجھے کوٹھڑی سے نکالنا ہی بھول گئے ہیں۔ بعض اوقات شدت سے جی چاہنے لگتا کہ کوئی مجھ سے بات کرے خواہ مجھے گالیاں ہی کیوں نہ دے۔ کسی کی صورت دکھائی دے خواہ کسی کی منحوس صورت ہی ہو۔ میں سب برداشت کرنے کے لیے تیار تھا۔ ذہن کی اس ویرانی کا اثر جسم پر ہوا اور میں ہذیانی کیفیت میں چیخنے لگا۔ دیر تک چیختا رہا پھر شاید بے ہوش ہو گیا۔ آنکھ کھلی تو اپنے اوپر دو مسلح محافظوں کو جھکے پایا۔ انہوں نے رپورٹ دی کہ قیدی سخت بخار کی حالت میں ہے۔ چنانچہ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا۔ وہاں مریض قیدیوں کی ایک قطار پہلے سے موجود تھی۔ مجھے بھی دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑا رہنے کا حکم دیا گیا۔ وہاں میں نے جولو بدمعاش کو دیکھا جو ڈیگا کے گروہ کا خاص آدمی تھا۔ جولو نے دبی زبان میں میرا حال پوچھا' میں نے جواب دیا اور ڈیگا کے بارے میں کچھ پوچھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ میری گدی پر ایک ایسا گھونسا پڑا کہ تارے دکھائی دے گئے اور میں چرخی کی طرح گھوم کر دیوار سے ٹکرایا۔ پلٹ کر کیا دیکھتا ہوں کہ وہ وحشی دیو بولارڈ قہر مجسم بنا ہمیں گھور رہا ہے۔ دیوار سے ٹکرانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ میری نکسیر پھوٹ گئی اور آناً فاناً میرے کپڑے اور چہرہ خون میں لت پت ہو گیا۔

''خرگوش کی نسل' آپس میں کیا باتیں کر رہے ہو؟'' بولارڈ نے گرج کر کہا۔ ''تمہیں پتہ نہیں جیل کے اندر قیدیوں کا ایک دوسرے سے باتیں کرنا منع ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس ظالم نے بائیں ہاتھ کا ایک اور گھونسا میری پسلی میں دیا۔ ایک بار پھر میں خاک چاٹتا دکھائی

دیا۔ بولارڈ نے ٹھوکر مار کر مجھے اٹھنے کا حکم دیا اور جب میں نہ اٹھ سکا تو تاڑ تاڑ کئی ہنٹر اس نے میری پیٹھ پر برسا دیئے۔ اذیت اور درد سے میری چیخیں نکل گئیں۔ اپنی دانست میں مجھے نڈھال کر کے وہ جولو کی طرف بڑھا اور شڑاپ سے ہنٹر اسے مارا۔

جولو اس حملے کا منتظر تھا۔ قوت میں وہ بولارڈ سے زیادہ نہ سہی تو کم بھی نہ تھا۔ نہایت چابک دستی سے اس نے ہنٹر پکڑ کر ایسا جھٹکا دیا کہ بولارڈ آگے جھک گیا۔ دوسرے ہی لمحے جولو کا گھونسا بولارڈ کی ناک پر لگا اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھل سکے' دوسرا ہاتھ جولو نے خالص جوڈو کا بولارڈ کی کنپٹی پر دیا۔ دیوزادو حشی کٹے ہوئے شہتیر کی مانند دھڑام سے زمین پر گرا۔ فحش گالیوں کا ایک پٹارہ تھا جو دونوں کے منہ سے بیک وقت کھل گیا۔ محافظ ادھر اُدھر ہٹ گئے۔ غالباً وہ اس لڑائی میں دل چسپی لے رہے تھے۔

''اٹھو خبیث' کتے۔'' جولو نے اس کی پسلیوں میں ٹھوکر ماری اور جونہی بولارڈ لڑکھڑاتا ہوا اٹھنے لگا' جولو نے دائیں لات ایک خاص انداز میں گھما کر اس کے جبڑے پر ماری۔ ایک خوفناک چیخ بولارڈ کے حلق سے نکلی۔ دوسرے ہی لمحے اس نے اٹھ کر جولو کو اپنے بازوؤں کے آہنی شکنجے میں جکڑ لیا۔ اب ان میں ایک ایسی کشتی شروع ہوئی جو یقیناً ایک فریق کی موت ہی پر ختم ہو سکتی تھی۔ دونوں جنگلی بھینسوں کی طرح ایک دوسرے پر گھونسے برسا رہے تھے۔ بولارڈ کا جبڑا جولو کے بے پناہ گھونسوں سے ہل چکا تھا اور جولو کی کنپٹی' ناک اور منہ سے خون کی نلکیاں جاری تھیں۔

دفعتاً بولارڈ نے ایک لات جولو کے پیٹ میں جمائی' وہ دوہرا ہو کر زمین پر گرا اور درد کی شدت سے گھٹی گھٹی آوازیں نکالنے کے بعد بے ہوش ہو گیا۔

''جان سے مار ڈالوں گا سئور کے بچے۔'' بولارڈ نے اسے دبوچ لیا اور دونوں ہاتھوں سے جولو کا گلا گھونٹنے لگا۔ عین اسی لمحے میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر کے کمرے میں کوئلے کے چولہے پر ایک بڑی کیتلی رکھی ہے اور اس میں پانی کھول رہا ہے۔ میں دوڑ کر گیا اور کیتلی اٹھا لایا۔ میں نے پوری قوت سے لوہے کی کیتلی بولارڈ کے سر پر دے ماری۔ ابلتا ہوا پانی اس کے منہ پر گرا۔ بولارڈ نے جولو کو چھوڑ دیا اور ماہی بے آب کی مانند تڑپنے لگا۔ چشم زدن میں اس کے بدن پر بڑے بڑے آبلے پڑ گئے۔ چہرہ مسخ ہو گیا۔ محافظوں نے دوڑ کر مجھے پکڑا اور گھسیٹتے ہوئے وہاں سے لے گئے۔ جیل کے اندر خطرے کے سائرن بھیانک آوازوں

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

میں چلانے لگے۔ چاروں طرف دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں' سپاہیوں اور محافظوں کی للکار' قیدیوں کی چیخ پکار.....اس کے بعد مجھے ہوش نہ رہا۔

معاً دوسری جانب سے دیوار تھپتھپانے کی آواز میرے کانوں میں آئی۔ دھپ.....دھپ.....دھپ.....دھپ.....انداز ایسا تھا جیسے ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی ہو۔ میں سمجھ گیا کہ کوئی اپنا ہی آدمی خفیہ الفاظ کے ذریعے مجھ سے گفتگو کرنا چاہتا ہے۔ ہم نے اسے ''ٹیلی فون'' کا نام دے رکھا تھا۔ جواب دینے کے لیے ضروری تھا کہ میں دو مرتبہ اپنا گھونسا دیوار پر مارتا لیکن یہاں ہاتھوں کا حال یہ تھا کہ انگلیوں کا حرکت میں لانا دشوار.....سخت کوفت ہوئی۔ ادھر ظالم برابر دیوار تھپتھپائے جا رہا تھا۔ اب میری آنکھیں تاریکی سے کچھ کچھ مانوس ہو چلی تھیں' تاہم یہ معلوم کرنا نہایت دشوار تھا کہ میں کہاں پڑا ہوں اور یہاں کوئی دروازہ وغیرہ بھی ہے یا نہیں.....بہرحال میں قیاس سے کام لے کر ایک طرف آہستہ آہستہ سرکنے لگا۔ اس عمل میں شدید اذیت ہوئی مگر یار سے رابطہ قائم کرنا ضروری تھا' جیلوں میں ہم اگر ایک دوسرے سے رابطہ قائم نہ رکھیں' تو مر جائیں۔

خدا خدا کر کے میرا ہاتھ ایک آہنی دروازے سے ٹکرایا۔ یہ دراصل لوہے کی سلاخوں کا ایک چوکھٹا تھا' دروازہ اس کے پیچھے ہوگا۔ بہرحال میں نے ان سلاخوں پر دو مرتبہ ہاتھ مارا' مگر اتنی آواز بھی نہ نکل سکی کہ میں خود ہی سن سکتا۔ ادھر سے دھپ دھپ کا سلسلہ برابر جاری تھا۔ معلوم ہوتا تھا' ادھر والا مجھ سے ملنے کے لیے بے چین ہے۔ مضطرب ہو کر میں نے اس پانی بھری کوٹھڑی کے فرش پر کروٹیں بدلنی شروع کیں اور ادھر اُدھر اندھوں کی طرح ٹامک ٹوئیاں مارنے لگا۔ یکا یک میرا ہاتھ کسی چیز سے ٹکرایا۔ یہ لکڑی کا ایک ٹوٹا ہوا پیالہ تھا جو خدا معلوم کب سے یہاں پڑا تھا اور جس میں کسی بدنصیب قیدی کو اُبلے ہوئے چاول یا مرچوں ملا شوربا پینے کو دیا جاتا ہوگا۔ لکڑی کا پیالہ کیا ملا جیسے کائنات کی بہت بڑی دولت مل گئی۔ میں ایک بار پھر گھسٹتا ہوا لوہے کے چوکھٹے تک پہنچا اور لکڑی کے پیالے سے تھپ تھپ کا جواب دیا۔ معلوم ہوا کہ میرا پیغام ادھر تک پہنچ گیا۔ اب ادھر والے نے تھپ تھپ کے ذریعے پہلے تو تمام حروف تہجی سے مجھے آگاہ کیا۔ پھر تھپ تھپ کی آواز سے ہر حرف کی شناخت کرائی۔ اس کے بعد ہم دونوں میں اس تھپ تھپی کے ذریعے باتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

''تم کون ہو؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔

''پہلے تم بتاؤ۔'' میں نے کہا۔

''نہیں' پہلے تم بتاؤ۔'' ادھر سے پھر سوال ہوا۔

''میں کہہ چکا ہوں پہلے تم بتاؤ۔ اگر نہیں بتاتے تو جہنم میں جاؤ۔ کیوں خواہ مخواہ مجھے تنگ کیا؟''

''اچھا تو سنو میرا نام جولو ہے۔''

''میرا نام پیپلن ہے۔''

اور یوں ہم دو گھنٹے تک باتیں کرتے رہے۔ میں نے جولو کو اپنا حال بتایا اور کہا کہ کھوپڑی بری طرح بھنا رہی ہے۔ سر پر بہت سے چھوٹے چھوٹے زخم آئے ہیں۔ ناک سوج کر فٹ بال بنی ہوئی ہے' ہڈیاں اگرچہ سلامت ہیں' مگر ایک آدھ پسلی فریاد کر رہی ہے' وغیرہ وغیرہ۔ جولو نے اپنا حال زار بتایا جو مجھ سے خاصا ملتا جلتا تھا۔ اس نے میری معلومات میں صرف اتنا اضافہ کیا کہ ہم زیرِ زمین پندرہ بیس فٹ گہری کوٹھڑیوں میں پھینکے گئے ہیں اور یہ کہ بولارڈ کی حالت بہت نازک ہے۔ اسے جیل کے ہسپتال میں لے گئے ہیں۔ اس کا چہرہ خوب جل گیا ہے اور اگر وہ زندہ رہا تو مردوں سے بدتر ہوگا وغیرہ وغیرہ۔

دفعتاً اس نے تین مرتبہ تھپ تھپ کر کے خبردار کیا کہ کوئی آ رہا ہے اور میں نے دم سادھ لیا۔ اتنے میں مجھے آہنی دروازہ کھلنے کی آواز آئی' پھر اس کی روشنی کی چند کرنیں' اس کے بعد ایک شخص نے کرخت لہجے میں مجھے بولا:۔

''او گندی نالی کے کیڑے' دروازے سے پرے ہٹ جاؤ۔ اگر تم نے شرارت کی تو فولادی ڈنڈا میرے پاس ہے' بھیجا اڑا دوں گا۔ ہٹ پرے میں بولارڈ نہیں ہوں سمجھے؟ میرا نام بیٹن ہے اور میں اسم بامسمّٰی ہوں۔ مارتے مارتے آدمی کو گدھا بنا دیتا ہوں۔''

وہ میرے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے آنکھوں کے جھروکے سے دیکھا' بہت لمبا تڑنگا آدمی تھا۔ ایک ہاتھ میں تیل سے جلنے والی لالٹین اور دوسرے ہاتھ سے ایک پیکٹ سا تھامے ہوئے تھا۔ بغل میں واقعی ایک موٹا سا ڈنڈا تھا جس کے سرے پر لوہے کی موٹھ چڑھی ہوئی تھی۔

''یہ لو تمہارے لیے کپڑے اور کھانے کی کچھ چیزیں لایا ہوں۔'' اس نے اپنا کرخت لہجہ بدل کر نرمی سے کہا۔ ''تم نے بولارڈ سے ہمیں نجات دلائی ہے' اس لیے ہم سب تمہارے شکرگزار ہیں اور یہ تحفہ میری طرف سے قبول کرو۔ ''اور تمام روٹی فوراً ہی نہ کھا جانا ورنہ بقیہ چوبیس گھنٹے بھوکا رہنا پڑے گا۔''

میں نے دیکھا کہ وہ مسکرا رہا ہے۔ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے چُپ رہنے کا اشارہ کیا۔ گویا تھوڑی دیر پہلے زور زور سے مجھے گالیاں دینے کا مطلب صرف دوسروں کو یہ بتانا تھا کہ مجھ پر کس قدر سختی کی جا رہی ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس تہہ خانے میں بے شمار کوٹھڑیاں ہیں اور باہر راہداری میں ایک مسلح گارڈ چوبیس گھنٹے پہرے پر حاضر رہتا ہے۔

جب وہ چلا گیا تو میں نے کپڑے پہنے۔ اب میں نے دیکھا کہ کونے میں لوہے کا ایک پلنگ بھی پڑا ہے اور اس پر ایک میلی سی دری کے علاوہ کوئی چادر ہے نہ تکیہ..... پلنگ پر بیٹھ کر میں نے پیکٹ کھولا' اس میں ایک بڑی ڈبل روٹی تھی۔ ابلے ہوئے گوشت کا ایک ٹکڑا' سگریٹ کی ڈبیا اور لائٹر۔ کپڑوں میں ایک پتلون ایک قمیض ایک اونی سویٹر اور ایک زیر جامہ۔ معلوم ہوا کہ یہ شخص بیٹن پچھلے جنم میں کبھی فرشتہ رہا ہوگا۔ اس نے میرے ساتھ وہ سلوک کیا جس کا شکریہ ادا کرنا میرے لیے ممکن نہ تھا۔ واقعہ یہ تھا کہ وہ بھی نمبردار قیدی تھا اور بولارڈ کا نائب لیکن اس کے ظلم و ستم سے تنگ آیا ہوا۔ بیٹن کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ بولارڈیوں درمیان میں سے نکل جائے گا جیسے مکھن میں سے بال اور اس کام کے لیے وہ میرا اور جولو دونوں کا احسان مند تھا۔

تین دن بعد جیسا کہ مجھے وقت گزرنے کا اندازہ ہوا' محافظوں نے مجھے اور جولو کو ان اندھیری کوٹھڑیوں سے نکالا اور سیدھے ڈائریکٹر کے کمرے میں لے گئے۔ پلیٹ فارم کے اوپر لمبی چیئر کے پیچھے تین آدمی دروازے کی طرف منہ کیے بیٹھے تھے۔ ان میں ایک ڈائریکٹر' دوسرے ان کے نائب اور تیسرے وارڈن صاحب تھے۔ معلوم ہوا یہ جیل کا خصوصی ٹریبونل ہے جس کے سامنے ہمیں جواب دہی کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ میں نے دیکھا جولو کی حالت خاصی ابتر تھی۔ اس کا چہرہ اور آنکھیں بری طرح سوجی ہوئی تھیں۔ اسے تیز بخار تھا اور اس کا دایاں بازو بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ ڈائریکٹر صاحب نے گھور کر ہمیں دیکھا اور فرمایا:

''اس دن تم نے قیدی نمبردار بولارڈ سے دنگا فساد کیا' بولو تمہیں کیا سزا دی جائے۔''

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

''جناب میرا ہاتھ ٹوٹا ہوا ہے' تین روز سے سخت بخار کی حالت میں ہوں۔ مہربانی کر کے پہلے میرا علاج کرایا جائے۔'' جولو نے کہا۔

''ہم یہاں تمہارے باپ کے نوکر نہیں ہیں کہ تمہارے احکام پر عمل کریں۔'' ڈائریکٹر نے غرا کر کہا' ''جیل میں لڑنے جھگڑنے کا یہی انجام ہوتا ہے۔ اب بازو ٹوٹ گیا تو ہم کیا کریں؟ تمہیں ڈاکٹر کی آمد کا انتظار کرنا چاہیے۔ وہ کب آئے گا؟ یہ کچھ خبر نہیں ممکن ہے کل ہی آ جائے یا ممکن ہے ایک ماہ بعد آئے.....اب میں تم جیسے مردودوں کے لیے ڈاکٹر کو بلانے سے رہا۔'' یہ کہہ کر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''میں نے سنا ہے تم اپنے وقت کے بڑے مشہور بدمعاش ہو اور تمہارا ہی نام پیپلن ہے۔ بولارڈ کچھلسانے کا کارنامہ تم نے انجام دیا ہے' بولو اس کے عوض تمہیں کیا انعام دیا جائے۔''

''جناب والا میرا انعام صرف یہ ہے کہ ایک مرتبہ مجھے آپ کے منہ پر پوری قوت سے تھوکنے کی اجازت مل جائے۔ اگر چہ آپ کا مکروہ چہرہ اس قابل نہیں کہ میں اپنا قیمتی تھوک اس پر ضائع کروں۔''

میرا جواب سن کر وہ اس قدر سراسیمہ اور حواس باختہ ہوا کہ بیان سے باہر.....دراصل اسے اس کھرے جواب کی توقع ہی نہ تھی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اس کے حضور میں آتے ہی ہم روئیں گے' چیخیں گے' گڑگڑائیں گے اور اس کے قدموں پر گر کر معافیاں مانگیں گے۔ چند سیکنڈ تک اس کی یہی کیفیت رہی۔ نائب اور وارڈن دونوں حیرت سے ہمیں تک رہے تھے۔

اس کے بعد ہمارا کیا حشر کیا گیا؟ اس کی لمبی چوڑی تفصیل بیان کرنے کی حاجت نہیں۔ بس یوں سمجھ لیجیے انہوں نے ہمیں جان سے نہیں مارا.....ہمارے ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ڈالی گئیں۔ ہماری بری طرح پٹائی کی گئی۔ برف کی سلوں پر گھٹنوں بٹھایا گیا' الٹا لٹکایا گیا۔ کھانے کو تین تین دن تک کچھ نہ دیا گیا۔ اس طرح زنجیروں میں جکڑا گیا کہ ہم کتوں کی طرح چلنے پر مجبور تھے۔ ہمارے آگے سوکھی روٹی کے ٹکڑے پھینکے گئے اور مجبور کیا گیا کہ ہم یہ ٹکڑے کتوں کی طرح ہاتھ لگائے بغیر منہ سے اٹھائیں اور چپڑ چپڑ کی آوازیں نکال کر کھائیں۔ ہمیں مجبور کیا گیا کہ بالٹیوں میں جانوروں کی طرح منہ ڈال کر لپ لپ پانی پئیں۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

بارہ روز تک یہی سلوک ہمارے ساتھ کیا گیا اور دوسرے قیدیوں کو بھی ہمارا حشر دکھایا گیا تا کہ وہ عبرت پکڑیں اور جیل حکام کے ساتھ گستاخی کا تصور بھی نہ کریں۔ بعد ازاں ہمارے ننگے جسموں سے ہتھکڑیاں اور بیڑیاں اتاری گئیں۔ ان لوہے کی زنجیروں نے ہمارے جسموں کا قیمہ کر دیا۔ کہنیاں گھٹنے بری طرح چھلے ہوئے تھے۔ رانوں۔ پنڈلیوں اور ٹخنوں پر گہرے زخم تھے' ہماری حالت اتنی ابتر تھی کہ جب وارڈن معائنے کے لیے آیا تو اس کا رنگ خوف سے فق ہو گیا۔ ہم جانتے تھے' اس جیل میں ہمیں امانت کے طور پر رکھا گیا ہے۔ ہم تو اس گروہ میں شامل تھے جنہیں حکومت نے بیگنی کی اس جہنم زار کالونی میں منتقل کر دینے کی منظوری دے دی تھی۔ جہاں ہزاروں قیدی ہر سال بھیجے جاتے ہیں اور بہت کم صحیح سلامت اپنے وطن پہنچنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

وارڈن کے حکم پر ہمیں فوراً ہسپتال میں بھیجا گیا جہاں ڈاکٹر نے پوری توجہ اور ہمدردی سے ہمارے زخم دھوئے' ان پر دوا لگائی اور صاف ستھری پٹیاں باندھیں۔ میرے دونوں بازو حرکت کرنے سے قاصر تھے۔ چنانچہ ایک قیدی کی ڈیوٹی لگائی گئی کہ وہ دونوں وقت ایک خاص تیل کی مالش میرے بازوؤں پر کرے۔ کئی روز تک ہمیں ہسپتال میں رکھا گیا اور اچھی خوراک دی گئی۔ اس کے بعد پھر وہی کال کوٹھڑی تھی اور وہی قید تنہائی۔

بیٹن نے ایک بار پھر ترس کھا کر مجھے سگریٹ مہیا کیے اور بتایا کہ بہت جلد قیدیوں کا ایک قافلہ یہاں سے روانہ ہونے والا ہے۔ بندرگاہ پر جہاز کا انتظام ہو گیا ہے لیکن اس بات کو بھی تین ہفتے ہو گئے وہ قافلہ نہ آج روانہ ہوتا ہے نہ کل۔ ہم پر ایک ایک پل بھاری تھا۔ خدا خدا کر کے پورے ایک ماہ بعد ہمیں کوٹھڑیوں سے نکالا گیا۔ حکم ہوا سب قیدی باری باری گرم پانی سے نہائیں گے۔ اس مقصد کے لیے جراثیم مارنے والا صابن بھی ہمیں دیا گیا۔ تھوڑی دیر کے لیے ہمیں آزادی بھی دی گئی کہ اپنے ساتھیوں سے ہنس بول لیں۔ پیرولی فو اور جولو دونوں بے انتہا خوش تھے۔ جب ہم بال کٹوانے کیلیے جیل کے حجام کی طرف گئے جو ہماری طرح ایک قیدی تھا تو اسے خاصا خوف زدہ پایا۔ معلوم ہوا کہ اسے بھی ہمارے ساتھ ہی بھیجا جا رہا ہے اور چونکہ وہ بیگنی کے حالات سے بخوبی واقف ہے اس لیے خوف کے مارے اس پر نزع کا عالم طاری ہے۔

سہ پہر کو ایک ڈاکٹر نے باری باری سب قیدیوں کو وبائی امراض سے محفوظ رہنے کے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ٹیکے لگائے اور یہ اس بات کی علامت تھی کہ اب کوچ کا واقعی وقت آ گیا ہے۔ شام کو جب ہمیں اپنی اپنی کوٹھڑیوں میں بند کیا جا رہا تھا تو بیٹن میرے پاس آیا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ اس نے چپکے سے کہا:

''پیپلن خدا حافظ..... تم اچھے آدمی ہو۔ میں تمہارے لیے دعا کرتا ہوں کہ تم جلد اس بھیانک مقام سے نکلنے میں کامیاب ہو جاؤ۔ ممکن ہے کبھی آزاد دنیا میں ہماری ایک بار پھر ملاقات ہو سکے۔''

''میری معلومات کے مطابق ہمیں ابھی براہ راست بیگنی نہیں بھیجا جائے گا بلکہ سینٹ مارٹن کی سیر پہلے کرائی جائے گی۔ یہ ہیبت ناک جزیرہ یہاں سے بہت دور ہے اگر ہمارا جہاز ساٹھ میل روزانہ کی رفتار سے چلے تب دس روز میں سینٹ مارٹن تک پہنچے گا۔ پتہ چلا ہے ہمارے قافلے میں کم از کم چھ سو بدنصیب قیدی شامل ہیں۔ بہت سوں کو سینٹ مارٹن ہی میں ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر باقیوں کو شاید بیگنی بھیجا جائے۔

میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا' ''ڈیگا' وہم نہ کرو' خدا نے چاہا تو وہاں سے بھاگنے کی کوئی نہ کوئی صورت نکل ہی آئے گی' حوصلہ نہ ہارو۔''

اس نے محبت سے میرا ہاتھ دبایا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا:

''ٹھیک ہے پیپلن' اب تخت یا تختہ۔''

بندرگاہ پر پہنچانے کے لیے ہمیں چھوٹی چھوٹی پولیس گاڑیوں میں بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھونسا جانے لگا۔ یہ گاڑیاں چاروں طرف سے بالکل بند تھیں۔ ہم نے بہتیرا احتجاج کیا کہ ہوا کی آمد کا راستہ کھولا جائے مگر کسی نے ایک نہ سنی۔ نتیجہ؟ جب بندرگاہ پر پہنچ کر قیدیوں کی گنتی کی گئی تو پتہ چلا کہ دو قیدی راستے ہی میں جاں بحق ہو چکے ہیں۔ ان مردہ قیدیوں کو بھی گنتی پوری کرنے کے لیے ہمارے ساتھ ہی جہاز پر لاد دیا گیا۔ بولیو جیل والوں کا کہنا تھا ہمیں حکم یہی ملا ہے زندہ یا مردہ جو قیدی اس جیل میں ہیں ان سب کو جہاز پر لاد دیا جائے۔ جہاز پر بڑے بڑے آہنی پنجرے دکھائی دیئے' ہر پنجرے میں دس دس قیدیوں کو داخل کر کے آہنی قفل ڈال دیئے گئے۔ پورے سفر کے دوران میں کسی بھی قیدی کو ان پنجروں سے نکلنے کی اجازت نہ تھی۔ ان قیدیوں میں ہر نسل' ہر قوم اور ہر ملک کے آدمی شامل تھے۔ یہ ایک عجیب اور نرالی دنیا تھی۔ دنیا بھر کے بدترین جرائم پیشہ افراد کا یہ عظیم اجتماع تھا۔ قاتل' خونی' ڈاکو'

لٹیرے' اٹھائی گیرے' اچکے' اسمگلر' بڑی بڑی بین الاقوامی مجرموں اور چوروں کی تنظیموں کے ارکان چینی' فرانسیسی' عرب' ہسپانوی' ولندیزی' اطالوی اور نہ جانے کون کون سی زبانیں بولنے والے مجرم مگر سب گویا ایک ہی کنبے کے افراد..... پنجروں میں بند حیوانوں کی مانند لیکن اب بھی ایک دوسرے سے دست و گریباں اور مار دھاڑ کے لیے ہر وقت تیار۔ بار بار کی فائیٹوں کے باوجود ہر دس میں سے ایک کے پاس چاقو چھری موجود..... اور کسی کو پتہ چل جائے کہ میرے ''پڑوسی'' کے حلق میں ''پلان'' موجود ہے جس میں سے دس ہزار فرانک برآمد ہو سکتے ہیں تو گویا اس کا گلا کسی بھی وقت گھونٹا جا سکتا ہے۔ محافظ' قیدیوں کے لڑائی جھگڑے میں مداخلت نہیں کرتے۔ ان کا کام صرف یہ ہے کہ قیدیوں کو زندہ یا مردہ ہر حال میں گنتی کے مطابق جہاں پہنچا دینے کا حکم ہے وہاں پہنچا دیں۔

حسن اتفاق سے مجھے جس پنجرے میں جگہ ملی وہاں جولو' ڈیگا اور پیرولی فو بھی موجود تھے۔ میرے آنے پر چنڈال چوکڑی پوری ہو گئی۔ ہم نے طے کیا کہ باری باری سوئیں گے اور جاگیں گے اور ایک دوسرے کی نگرانی کریں گے۔ اس کے بقیہ چھ آدمی بھی ہمیں گھور گھور کر دیکھتے اور آپس میں کانا پھوسی کرتے۔ جہاز روانہ ہوا کھلے سمندر میں سفر کا بڑا لطف آیا۔ تازہ اور صاف ہوا نے جیسے تھکے ماندے جسموں میں نئی روح بھر دی۔ ایک روز دوپہر کو جب قیدیوں میں روٹیاں تقسیم ہو رہی تھیں' ہمارے پنجرے کا ایک شخص میرے قریب آیا' بیچارہ سوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینک چڑھی ہوئی تھی۔ میں نے استفہامیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا' اس نے آہستہ سے کہا:

''کیا آپ ہی کا نام پیپلن ہے؟''

''بے شک' کہو کیا کام ہے؟''

ڈیگا بھی ہماری باتیں سن رہا تھا' عینک والے نے مشکوک نگاہوں سے ڈیگا کو دیکھا۔ میں نے کہا:

''فکر نہ کرو' یہ بھی اپنے ہی آدمی ہیں۔ تم بلا کھٹکے بات کرو۔''

''میرا نام کلگانی ہے۔'' اس نے کہنا شروع کیا۔ ''اور میں پاسکل کا بہنوئی ہوں۔ آپ پاسکل کو جانتے ہیں نا؟ گزشتہ دنوں وہ بولیو جیل میں مجھ سے ملنے آیا تھا تو اس نے مجھے ہدایت کی تھی کہ اگر کوئی مشکل ہو تو میں آپ سے مل کر بیان کروں۔''

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"ہاں میں پاسکل کو اچھی طرح جانتا ہوں۔" میں نے کہا "..... اب تم مطلب کی بات کرو' جو کچھ میرے اختیار میں ہوگا تمہارے لیے کروں گا۔"

"بات یہ ہے کہ..... کہ..... میرے پاس بھی "پلان" موجود ہے۔ اس نے کچھ ہچکچاتے کچھ ڈرتے ہوئے بتایا۔ مگر اب میرے لیے اس نلکی کو حلق کے اندر دبائے رکھنا ممکن نہیں رہا..... اس نلکی نے میرے حلق کی نالی میں زخم ڈال دیئے ہیں..... سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں' کس پر اعتبار کیا جائے۔ مجھے خدشہ ہے کہ یا تو کوئی نہ کوئی گارڈ اس کا پتہ چلا لے گا یا کوئی مجھے ہلاک کر کے پلان پر قبضہ کرنے کی تدبیر کرے گا۔ مسٹر پیپلن' خدا کے لیے میری مدد کیجیے' میں پورا بھروسا کرتے ہوئے اپنی امانت آپ کے سپرد کرنا چاہتا ہوں۔ اگر میں مر گیا تو آپ کو اجازت دیتا ہوں یہ روپیہ اپنے صرف میں لے آیئے گا۔"

"کتنی رقم ہے آپ کے پاس؟"

"پچیس ہزار فرانک۔"

مزید کوئی لفظ کہے بغیر گلگانی کا پلان میں نے لے لیا۔ یہ نہایت نفیس اور ہلکی ٹیوب تھی جسے میں نے گلگانی کے سامنے ہی نگل لیا۔ ڈیگا نے تعجب کا اظہار کیا کہ میں خاصا سخت جان ہوں۔ اپنے معدے میں دو دو پلان کیونکر اٹھائے پھروں گا۔

سترہ دن مسلسل سفر کے بعد ہمارا جہاز سینٹ مارٹن پہنچ گیا۔ دور سے یہ ایک سرسبز و شاداب جزیرہ نظر آیا جس کے اردگرد سمندر کا پانی بالکل سیاہ تھا۔ جا بجا لکڑی کے بے شمار کیبن بنے ہوئے تھے۔ جہاز کی وسل سن کر ان کیبنوں سے مقامی باشندے برآمد ہونا شروع ہوئے۔ یہ سب کے سب سیاہ فام تھے' ہم جیسے قیدیوں کو دیکھنا ان کے لیے روزمرہ کا تماشا تھا۔ لہٰذا انہیں کوئی حیرت نہ تھی۔ جزیرے کی پولیس نے ان باشندوں کو پرے پرے ہٹا دیا۔ جہاز سے اتار کر ہمیں ایک وسیع و عریض میدان میں لے جایا گیا جس کے چاروں طرف بارکیں بنی تھیں۔ ان بارکوں کے پیچھے سات آٹھ فٹ اونچی چار دیواری تھی۔ اس دیوار کے بعد لوہے کے خاردار تاروں کی ایک خاصی گھنی اور اونچی باڑ بھی باندھی گئی تھی۔ چاروں کونوں پر دو دو منزلہ لکڑی اور گھاس پھونس کے بنے ہوئے واچ ٹاور تھے جن پر سرچ لائٹ کا انتظام تھا اور ہر ٹاور پر کئی کئی سپاہی مشین گنیں سجائے بیٹھے تھے۔ پتہ چلا کہ بیگنی کی منزل تو دور ہے اور ابھی ہمیں کئی ماہ اس جزیرے پر قیام کرنا ہوگا۔

تمام نئے قیدیوں کو کئی قطاروں کی شکل میں کھڑا کیا گیا۔ کھڑے کھڑے ہماری ٹانگیں شل ہونے لگیں۔ آخر کیمپ کا کمانڈنگ آفیسر وہاں آیا۔ اس کا عہدہ کرنل کا تھا۔ اس کے ساتھ تین چار اور افسر' مسلح محافظ' دو تین ڈاکٹر اور ایک پادری بھی تھا۔ ہمیں توقع تھی ابھی "اٹن شن" کی آواز فضا میں گونجے گی لیکن ایسا نہ ہوا۔ کمانڈنگ آفیسر نے لاؤڈ اسپیکر اپنے منہ سے لگا لیا۔

"قیدیو! جو کچھ میں کہتا ہوں غور سے سنو..... اب تم لوگ فرنچ گیانا کی انتظامیہ کے دائرہ عمل میں آ گئے ہو۔ اس کا انتظام فوج کے سپرد ہے..... اور فوجی انتظامیہ کا مرکز شہر کایئنی میں ہے۔ یہاں بالکل ان قواعد پر عمل کیا جائے گا جو ہم نے قیدیوں کے لیے وضع کیے ہیں۔ فرانسیسی گورنمنٹ نے تم لوگوں کو ہماری تحویل میں دیا ہے۔ اگر کوئی شخص ان قواعد کو توڑے گا تو اس کی سزا ہم اپنے قوانین کے تحت تجویز کریں' جس کی اپیل کا حق بھی ہمیں ہوگا..... وارڈن بیرٹ۔"

ایک فوجی افسر نے آگے بڑھ کر کرنل کو سلیوٹ کیا۔

"وارڈن بیرٹ' میں ان تمام نو وارد قیدیوں کو تمہارے سپرد کرتا ہوں' فہرست سے مقابلہ کرو اور دیکھو کہ سب قیدی حاضر ہیں۔"

چنانچہ "رول کال" شروع ہوئی فلاں ابن فلاں؟..... حاضر جناب..... اس کام میں مزید دو گھنٹے لگ گئے۔ بعد ازاں دونوں افسروں نے چند کاغذات پر دستخط کر کے اس رسم سے فرصت پائی۔ اب وارڈن بیرٹ نے لاؤڈ اسپیکر سنبھالا اور قیدیوں کو سینٹ مارٹن کے قواعد و ضوابط بتانے کے ساتھ ساتھ دھمکیاں بھی دیں:

"تم لوگوں کی آخری منزل بیگنی ہے۔" اس نے بتایا "لہٰذا کسی شخص کو قانون توڑنے کی فکر نہ کرنی چاہیے۔ ہم بے جا سختی کے قائل نہیں۔ آپ لوگ آپس میں ایک دوسرے سے مل سکتے ہیں' گانا بجا سکتے ہیں۔ سگریٹ وغیرہ پی سکتے ہیں۔ علاج معالجے کی سہولتیں بھی ہم آپ کو دیں گے..... مگر یہ تمام رعایتیں ان کے لیے ہیں جو کیمپ ڈسپلن کی پابندی کریں گے۔ خلاف ورزی کی صورت میں....." وہ ایک لمحے کے لیے رکا پھر بولا: بس خدا ہی آپ پر رحم کرے۔"

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

قیدیوں کو ان کے نمبر الاٹ کیے گئے اور لمبی لمبی بیرکوں میں داخل کر دیا گیا..... یہاں دیواروں کے ساتھ ساتھ پلنگ بچھے تھے۔ لکڑی کی بنی ہوئی چھوٹی چھوٹی میزیں اور الماریاں تھیں جن میں ہم نے اپنے فالتو کپڑے اور برتن وغیرہ رکھ لیے۔ جولو اور ڈیگا میرے دائیں بائیں تھے' گلگانی بھی اسی بیرک میں تھا۔

آدھی رات کے وقت بیرک میں ایک ہولناک چیخ بلند ہوئی۔ سب ہڑبڑا کر اٹھے۔ تیس چالیس مسلح گارڈ دوڑے دوڑے آئے' برقی ٹارچوں کی روشنیاں ہر طرف پھیل گئیں۔ معلوم ہوا ایک قیدی خون میں لت پت غسل خانوں کے قریب پڑا ہے۔ کسی نے پلان کے لالچ میں اس کی گردن میں چاقو گھونپ دیا۔ ہم سب غسل خانوں کی طرف دوڑے لاش پر پہلی نظر پڑتے ہی میرے ہوش اڑ گئے۔ وہ گلگانی تھا' چاقو کا آٹھ انچ لمبا پھل اس کی گردن میں پوری طرح اتر چکا تھا۔ خون ابھی تک زخم سے ابل رہا تھا۔ ڈیگا نے دہشت زدہ ہو کر زور سے اپنی انگلیاں میرے بازو میں گاڑ دیں۔ آناً فاناً کیمپ کے سائرن بھیانک آوازوں میں چلا اٹھے۔ بے شمار فوجی بوٹوں کی آوازیں۔ چند لمحوں میں وارڈن بیرٹ اور کمانڈنگ آفیسر وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے لاش کا معائنہ کیا' مسلح گارڈوں نے اپنی اپنی بندوقوں کا رُخ قیدیوں کی طرف کر رکھا تھا' قیدی دم بخود تھے۔

''ہر شخص باہر میدان میں چلا جائے۔'' کمانڈنگ آفیسر نے حکم دیا' گارڈوں نے قیدیوں کو بندوقوں کے اشارے سے باہر چلنے کا حکم دیا' باہر آتے ہی دوسرا حکم ملا:

''اپنے تمام کپڑے اتار دو۔''

قیدیوں نے حکم کی تعمیل کی ایک چھوٹا سا نہایت تیز دھار کا چاقو میرے پاس تھا جو بولیو جیل سے رخصت ہوتے وقت بیٹن نے چپکے سے دے دیا تھا۔ میں نے چاقو اپنے نیفے سے نکال کر دائیں پیر کے تلوے تلے رکھ لیا اور خود اپنے کپڑے اتار کر خاموش کھڑا ہو گیا۔ محافظوں نے کپڑوں کی تلاشیاں لینی شروع کیں۔ ادھر بیرک کے اندر بھی ہر جگہ دیکھ بھال جاری تھی۔ سب کے سب نامعلوم خوف سے بری طرح کانپ رہے تھے۔ تلاش کا نتیجہ برآمد ہوا..... تین چاقو..... پیچ کس اور ایک سونے کا پلان..... وارڈن بیرٹ نے چھ قیدیوں کو اس قطار سے نکال کر الگ کھڑا کر دیا۔ پھر حکم ہوا باقی قیدی اپنے اپنے کپڑے پہن سکتے ہیں۔ میں نے کپڑے پہن لیے اور آنکھ بچا کر چاقو دوبارہ پتلون کے اندر اڑا لیا۔ چھ

ننگ دھڑنگ قیدی چپ چاپ کھڑے ہمیں گھور رہے تھے۔ بیرٹ اور آفیسر نے قریب جا کر ہر قیدی کی شکل غور سے دیکھی۔ ایک مسلح گارڈ نے پہلا چاقو اٹھایا اور کرنل سے کہا:

''جناب' یہ چاقو اس قیدی کے کپڑوں سے برآمد ہوا ہے۔''

''بے شک یہ چاقو میرا ہے۔'' قیدی نے اقرار کیا۔

''خوب'' بیرٹ نے کہا'' گارڈ اس قیدی کو لے جاؤ اور کوٹھڑی اٹھارہ میں بند کر دو۔''

پھر انہوں نے باری باری ایک چاقو' پیچ کس اور دونو کیلے سوؤں کے چاروں مالکان سے اقرار کروایا اور انہیں بھی گارڈوں کے ساتھ اس ننگ دھڑنگ حالت میں مختلف نمبر کی کوٹھڑیوں میں بھجوا دیا۔ اب میدان میں صرف ایک چاقو' ایک سونے کا پلان اور ایک قیدی باقی رہ گیا۔ یہ ایک تندرست توانا' طویل القامت جوان تھا اور نہایت بے خوفی سے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ گارڈ نے سونے کے پلان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''یہ تمہارا ہے؟''

''جی ہاں' میرا ہے۔''

''کیا کچھ ہے اس میں؟'' وارڈن نے بیرٹ سے پوچھا اور پلان اٹھا کر اس کا معائنہ کرنے لگا۔

''کچھ زیادہ نہیں جناب۔'' نوجوان نے جواب دیا۔ ''صرف تین سو انگلش پاؤنڈ امریکی ڈالر اور پانچ پانچ قیراط وزنی دو ہیرے۔''

''اجازت ہو تو میں اسے کھول کر دیکھ لوں؟'' بیرٹ نے طنز سے کہا اور جواب میں ہاں لیے بغیر اسے کھول لیا۔ چند لمحہ بعد ہم نے سنا وہ کہہ رہا تھا'' جو کچھ تم نے بتایا تمام سامان اس میں موجود ہے تمہارا نام؟''

''سالویڈیا رومیو۔''

''اطالوی ہو۔''

''جی جناب۔''

''بہر حال پلان کے بارے میں چونکہ تم نے اقرار کر لیا لہٰذا اس پر تمہیں سزا میں کمی ہو گی' البتہ چاقو رکھنا سخت جرم ہے.....''

''معاف فرمایئے جناب' چاقو میرا نہیں ہے۔''

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"لیکن یہ تمھارے کپڑوں میں سے برآمد ہوا ہے۔" گارڈ نے احتجاج کیا۔

"میں پھر اپنی بات دہراتا ہوں چاقو میرا نہیں۔"

"کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں۔" گارڈ غصے سے چلایا۔

"میں یہ نہیں کہتا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔" نوجوان نے سکون سے کہا "تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"ہوں..... تب پھر یہ کس کا ہے؟" وارڈن بیرٹ نے کہا "اگر یہ تمہارا نہیں تو پھر کون اس کا مالک ہے؟"

"بہرحال یہ میرا نہیں اس کے سوا میں کیا عرض کروں۔"

بیرٹ کا چہرہ طیش سے مسخ ہو گیا۔ کرنل خاموشی سے ان کے مکالمے سن رہا تھا اب اس نے بھی زبان کھولی:

"دیکھو نوجوان بہتر ہے سچ سچ بتا دو کہ چاقو کس کا ہے؟ اگر یہ تمہارا نہیں تو پھر تمہارے جوتے میں سے کیسے برآمد ہوا؟"

"میں کچھ نہیں جانتا جناب والا۔"

"ہمیں تشدد پر مت مجبور کرو نوجوان۔" کرنل نے گرج کر کہا۔ "چاقو تمہارے جوتے کے اندر سے برآمد ہوا اور تم نہیں جانتے کس کا ہے؟ تمہارا خیال ہے ہم لوگ احمق ہیں؟ اس بات کا فیصلہ ابھی ہو گا کہ چاقو تمہارا ہے یا کسی اور کا؟ بولو....."

"جناب میں پہلے کہہ چکا ہوں چاقو میرا نہیں۔ اب رہا سوال کہ کس کا ہے؟ یہ میں نہیں جانتا۔"

"گارڈ" کرنل غصے سے بے قابو ہو کر چیخا۔ "اس قیدی کے دونوں ہاتھ پشت پر باندھ دو۔"

آناً فاناً اطالوی نوجوان کے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے گئے میں نے دانت پیس کر زیر لب ڈیگا سے کہا: "یہ اطالوی ہوتے ہی پاگل ہیں گدھا کہیں کا..... کیوں نہیں جان چھڑانے کے لیے یہ کم بخت اقرار کر لیتا کہ چاقو اسی کا ہے۔" خواہ مخواہ سب پر آفت لائے گا۔"

"میں دس تک الٹی گنتی گنوں گا۔" کرنل نے کہا "اگر اس دوران میں تم نے نہ بتایا تو گنتی ختم ہوتے ہی تمہیں گولی سے اڑا دیا جائے گا ہمارے پاس اتنا وقت نہیں کہ تم سے سر کھپاتے رہیں۔"

کرنل کا اشارہ پاتے ہی گارڈ نے دھکیل کر قیدی کو ایک تختے کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ دوسرے ہی لمحے پانچ مسلح سپاہی ہاتھوں میں رائفلیں تانے لائن میں کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے رائفلوں سے نوجوان کی کھوپڑی اور سینے کا نشانہ لیا۔ کرنل نے گنتی شروع کی "دس..... نو..... آٹھ..... سات..... چھ....." ایک لمحے کے لیے وہ رکا۔ رومیو اسی طرح بے خوفی سے کھڑا تھا۔ ڈیگا بے چین ہو کر بولا: "واقعی یہ احمق مارا جائے گا۔" کرنل کی آواز گونجی۔ "پانچ..... چار..... تین..... دو....." دفعتہً ڈیگا قطار میں سے نکل کر آگے بڑھا اور مدھم آواز میں بولا:

"جناب میں اقرار کرتا ہوں کہ چاقو اس نوجوان کا نہیں میرا ہے۔"

اس جملے پر ایک ہیبت ناک سناٹا چھا گیا۔ ہر شخص کی نگاہیں ڈیگا پر جمی تھیں۔ میں حیران تھا ڈیگا نے یہ خطرناک قدم کیوں اٹھایا۔ پچھلے پہر کا آسمان ٹمٹماتے ستاروں سے روشن تھا فضا میں خاصی خنکی تھی کیمپ کے چاروں طرف پھیلے ہوئے درخت خاموش کھڑے تھے دور کہیں کتے کے بھونکنے کی مسلسل آواز آ رہی تھی۔

رومیو کے ہاتھ کھول دیئے گئے ایک گارڈ نے ڈیگا کو اپنے نشانے کی زد میں لے لیا۔ کمانڈنگ آفیسر وارڈن بیرٹ اور سبھی مسلح گارڈ ڈیگا کو گھور رہے تھے جو بے خوفی سے سینہ تانے کھڑا تھا۔

"قتل کی یہ واردات تم نے کی ہے؟" کرنل نے سرد لہجے میں ڈیگا سے پوچھا ڈیگا مسکرایا۔ "جناب چاقو میرا ہے قتل سے مجھے کیا واسطہ؟ میں نے آج تک کسی کو قتل نہیں کیا اور نہ ایسا ارادہ ہے۔"

"اسے کوٹھڑی نمبر بائیس میں لے جاؤ۔" کرنل نے حکم دیا۔ "اور صبح دس بجے دوسرے قیدیوں کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کرو۔"

جب میں بیرک میں پہنچ کر پلنگ پر لیٹا تو نیند کوسوں دور تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس دوزخ سے نکلنا کیسے ممکن ہو گا خدا جانے یہ وحشی ڈیگا کے ساتھ کیا سلوک کریں۔ گلگانی کو کس نے قتل کیا؟ اگر اصل قاتل نہ ملا تو یقیناً ڈیگا مارا جائے گا..... اور ڈیگا کو ہر قیمت پر بچانا ضروری تھا۔

✣ ✣ ✱ ✣ ✣

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

.....2.....

ڈیگا میرا دوست تھا نہ کبھی مجھے اس کے ساتھ کام کرنے کا اتفاق ہوا۔ محض سرسری دعا سلام تھی' لیکن سینٹ مارٹن کی اس ہولناک رات جب میں اپنی بیرک میں نہایت تکلیف دہ بستر پر لیٹا' تو یوں محسوس ہوا جیسے ڈیگا اور میں جنم جنم کے دوست ہیں اور ہماری رفاقت اتنی قدیم ہے کہ اسے توڑا نہیں جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈیگا کا وجود میرے لیے بڑا ذہنی سہارا تھا۔ میں سمجھتا تھا وہ نہ ہوگا' تو میں کوئی کام نہ کر سکوں گا۔ بعض شخصیتیں ہوتی ہی ایسی ہیں جن کی موجودگی میں آدمی بڑی سے بڑی مہم ہنس کھیل کر سر کر لیتا ہے۔ ڈیگا بھی اسی قسم کی ایک شخصیت تھا۔ اس بے وقوف اطالوی نوجوان کو بچانے کے لیے ڈیگا نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ لی تھی اور میں نہیں جانتا تھا' کیمپ کے یہ نام نہاد افسر اب اس سے کیا سلوک کرنے والے تھے۔ تمام رات میں کروٹیں بدلتا رہا اور پیچ و تاب کھاتا رہا۔ کوئی تدبیر ذہن میں نہ آئی اور یہ طے تھا کہ اگر گلگانی کے قاتل کا پتہ نہ چل سکا یا جو چاقو اطالوی نوجوان کے پاس سے برآمد ہوا ہے' اس کے مالک کا سراغ نہ ملا' تو ڈیگا کا گولی سے اڑا دیا جانا یقینی ہے۔

ہم لوگ کیمپ میں نو وارد تھے اور ہمیں کچھ پتہ نہ تھا کہ کون شخص ہماری مصیبت میں کام آ سکتا ہے یا کس پر ہم بھروسہ کر سکتے ہیں۔ ہم میں صرف جولو ایسا آدمی تھا' جو پہلے بھی اس جہنم کی سیاحت کر چکا تھا۔ لیکن اس کی سٹی بھی گم تھی' ہوش و حواس پریشان تھے۔ تاہم وہ بار بار یہی کہتا گھبرانے کی کوئی بات نہیں' روپے پیسے کے بل پر دنیا کا ہر کام کیا اور کرایا جا سکتا ہے۔ ہمارے پاس خاصی بڑی رقم موجود ہے اور رقم کے ضرورت مند ہر جگہ مل جاتے ہیں۔

پھانسی کے تختے پر سے بھی مجرم کو روپے پیسے کے زور سے اتروایا جا سکتا ہے' وغیرہ وغیرہ۔ وہ صبح تک اسی طرح تسلی اور تشفی کی باتیں کرتا رہا اور اس دور کے حالات سناتا رہا جب وہ یہاں بھیجا گیا تھا' اردگرد کے جزائر کے بارے میں اس کی معلومات حیرت انگیز تھیں۔ ہر

جزیرے پر قیدیوں کا ایک نہ ایک کیمپ کھلا ہوا تھا۔ سینٹ مارٹن سے کوئی پچانوے میل دور ایک اور جزیرہ تھا جسے سینٹ جین کا نام دیا گیا تھا۔ اس جزیرے میں سب سے خطرناک قیدی رکھے جاتے۔ پھر ان میں سے بھی چھانٹی ہوتی اور اعلیٰ درجے کے بدمعاش وہاں روانہ کر دیئے جاتے۔ ڈسال ایک ایسی بھیانک جگہ تھی کہ یہاں سے کسی کا فرار ہونا یا بچ کر مہذب دنیا میں چلے جانا ممکن نہ تھا۔ جزیرے میں عجیب و غریب ہوائیں چلتیں اور روزانہ ایک نہ ایک قیدی قید حیات سے آزاد ہو جاتا۔ مشرق مغرب' شمال جنوب' ہر طرف ایسے ہی جزیرے تین سو مربع میل کے علاقے میں پھیلے ہوئے تھے۔ انہی میں دیبابل کا کیمپ بھی شامل تھا جہاں ان سیاسی قیدیوں کو رکھا جاتا جن سے حکومت فرانس عاجز آ جاتی تھی۔

دریائے میرونی کے کنارے ایک اور کیمپ تھا جسے سینٹ لارن کہتے تھے۔ دراصل یہ بیگنی کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ یہیں قیدی مختلف گروپوں میں تقسیم کیے جاتے یعنی اول' دوم اور سوم درجے کے خطرناک قیدی۔ جولو کو دیبابل کیمپ کے سوا ہر جگہ قیام کرنے کا شرف حاصل تھا۔ سینٹ لارن میں دوسرے درجے کے قیدی بھیجے جاتے جن سے کھیتوں اور باغوں میں مشقت لی جاتی۔ کوئی قیدی شرارت کرتا یا کام نہ کرتا' لڑائی' دنگے اور فساد پر اتر آتا تو اس کا تبادلہ مزید سخت' لیکن چھوٹے چھوٹے کیمپوں میں کر دیا جاتا۔ ان کیمپوں میں فورسٹر چار دن' کاسیکنڈ اور فورٹی کیلومیٹر کیمپ بہت بدنام تھے۔ آخر الذکر ''موت کا کیمپ'' بھی کہلاتا۔

ان تمام کیمپوں میں قیدیوں سے بارہ بارہ اور سولہ سولہ گھنٹے مسلسل کام لیا جاتا جولو نے بتایا: ''ہر کیمپ میں ورکشاپ' فیکٹری' لانڈری اور درزی خانے موجود ہیں' جس کام میں قیدی کو دلچسپی ہو' وہی اس سے کرایا جاتا ہے۔ کوئی کام نہ آتا ہو تو دوسرے قیدی سکھانے پر مامور ہیں۔ زیادہ تجربے کار اور پرانے قیدی نگران بنا دیئے جاتے ہیں۔ کام سے بچنے کا ایک ہی راستہ ہے' آدمی اپنے آپ کو زخمی کر لے اور کیمپ کے ہسپتال میں پہنچ جائے۔ میں ہمیشہ ایسا ہی کرتا تھا اور اب بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ اگر ان بدمعاشوں نے مجھ سے مشقت لینے کا ارادہ کیا تو میں اپنا کوئی ہاتھ پیر زخمی کر کے مزے سے ہسپتال چلا جاؤں گا۔''

''لیکن اس طرح تو ہر قیدی کام سے بچ سکتا ہے۔'' پیرولی فو نے اعتراض کیا' ''خود کو زخمی کرو اور ہسپتال میں آرام کرنے چلے جاؤ۔''

"نہیں..... ایسا نہیں ہے۔" جولو نے کہا "صرف ماہر فن قیدی ہی ایسا کر سکتے ہیں۔ کیمپ کے افسروں کو علم ہو جائے کہ قیدی نے جان بوجھ کر اپنے آپ کو زخمی کیا ہے تو ہسپتال کے بجائے اسے قبرستان بھیج دینے کا انتظام ہونے لگتا ہے یعنی مشقت ڈبل کر دیتے ہیں اور خوراک نصف: لہٰذا اپنے آپ کو اس انداز میں زخمی کرنا پڑتا ہے کہ پہلی نظر میں یہ کوئی حادثہ معلوم ہو۔ فرار ہونے کے مواقع بھی اس دوران میں ملتے رہتے ہیں بشرطیکہ قیدی ان سے بھرپور فائدہ اٹھانے کو تیار ہو' لیکن ایک بار کوٹھڑی میں بند کر دینے کی سزا مل جائے' تو فرار ہونا ممکن نہیں رہتا۔ وہاں سے صرف موت کا فرشتہ ہی آزادی دلا سکتا ہے۔ زخمی ہونے کے بعد جب تم ہسپتال میں علاج کراؤ تو وہاں سے نکل بھاگنے کے مواقع بڑی جلدی پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ ہسپتال کے تمام ادنیٰ درجے کے لوگ رشوت خور ہیں اور معمولی سی رقم کے عوض وہ کشتی اور خوراک وغیرہ کا انتظام کر کے قیدی کو بھاگ نکلنے میں مدد دیتے ہیں لیکن فرار ہونے کے بعد اگر تم راستہ بھول گئے اور انہی جزیروں میں سے کسی ایک پر جا نکلے جہاں کیمپ بنے ہوئے ہیں تو سمجھ لو تمہاری خیر نہیں۔

بعض اوقات کیمپ کے افسر بھانپ جاتے ہیں کہ فلاں شخص فرار ہونے کے لیے پر تول رہا ہے۔ چنانچہ اسے گاؤں میں مشقت کے لیے بھیجنے کے بجائے کیمپ کے اندر ہی کسی کام پر لگا دیتے ہیں۔ ایسا ہو جائے تو فرار کی راہ مسدود سمجھو' کوشش کرو تمہاری ڈیوٹی کیمپ سے باہر لگے۔ یہ کام کسی بھی نگران یا پہرے دار کو کرنسی نوٹ رشوت دے کر ہو سکتا ہے۔ ان دیہاتوں اور گاؤں میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو عمر قید کاٹ کر آزادانہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان میں ایسے آزاد کردہ قیدی شامل ہیں جو نیک چلنی کے باعث قید کے دوران ہی میں کانسٹیبل بنا دیے گئے یا پھر وہ چینی باشندے ہیں جو صدیوں سے ان جزائر میں آباد ہیں۔ ان لوگوں پر جزیرے کی کوئی بلا ذرہ برابر اثر نہیں کرتی۔ یہ لوگ بہت معمولی رقم کے عوض بھاگنے میں مدد دیتے ہیں۔ پیارے پیپلن اور عزیز پیرولی فو ہمیشہ یاد رکھو کیمپ کے اندر رہنا موت کو دعوت دینا ہے۔ ایسے کیمپ یہاں عام ہیں جہاں رہ کر تین مہینے کے اندر اندر قیدی لازماً اپنی موت کے وارنٹ پر دستخط کر دیتا ہے۔"

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

جولو سورج طلوع ہونے تک اپنے مشاہدات اور تجربات سے ہمیں مستفید کرتا رہا۔ اس نے اپنی پتلون کے اندر سے ایک پتلا اور حد درجہ تیز دھار کا چھوٹا سا چاقو نکال کر دیکھا اور اشارے سے کہا وہ اس چاقو سے اپنا گھٹنا اس انداز میں زخمی کرے گا کہ کسی کو شبہ بھی نہ ہو سکے گا یہ کام دانستہ کیا گیا' اس نے دعویٰ سے کہا: "تم دیکھ لینا پیپلن! میں دو دن کے اندر اندر ہسپتال میں داخل ہونے والا پہلا قیدی ہوں گا۔"

✣ ✣ ✱ ✣ ✣

اٹھارہ دن گزر گئے۔ اس دوران میں ڈیگا اور ان قیدیوں کا پتہ نہ چلا جنہیں پہلی ہی رات پکڑا گیا تھا۔ ہمارا خیال تھا انہیں عدم آباد کی طرف چلتا کر دیا گیا۔ ہم نے ادھر اُدھر سے سُن گن لینے کی کوشش کی' مگر بے سود۔ گارڈ اور دوسرے نگرانوں سے بارہا پوچھا' لیکن ہر بار انہوں نے نفی میں گردنیں ہلائیں۔ جولو اپنے وعدے کے عین مطابق دوسرے روز ہی ہسپتال پہنچ گیا۔ ایک سیڑھی پر چڑھتے ہوئے وہ بری طرح گرا اور جب اسے دوسرے قیدیوں نے اٹھایا' تو اس کا دایاں گھٹنا لہولہان تھا۔ چند لمحوں میں درد کی شدت سے جولو "بے ہوش" ہو چکا تھا۔ وارڈن بیرٹ نے اسے تشویش کی نگاہوں سے دیکھا اور حکم دیا قیدی کو فوراً ہسپتال پہنچایا جائے۔ میں نے اور دو تین قیدیوں نے اس کے ہاتھ پیر پکڑے اور ایک گارڈ کی نگرانی میں ہسپتال کی طرف لے چلے۔ راستے میں یکا یک جولو نے پلکیں اٹھا کر میری طرف دیکھا' مسکرایا اور دوسرے ہی لمحے اس کا چھوٹا سا حیرت انگیز چاقو میرے ہاتھ میں تھا جو اس نے کمال ہوشیاری سے مجھے تھما دیا۔ گارڈ نے ہمیں ہسپتال کے اندر نہ جانے دیا۔ وہاں سے دو آدمی اسٹریچر لے کر نمودار ہوئے' جولو کو اس پر ڈالا اور اندر لے گئے۔ اس دوران میں بہت سے پرانے "آزادی قیدی" ہمیں دیکھنے اور ملنے کے لیے جمع ہو گئے۔ ان میں مختلف نسلوں اور قوموں کے آدمی تھے۔ معلوم ہوا وہ سب کے سب وہ ہیں جو اپنی سزا کی میعاد پوری کر چکے ہیں۔ لیکن ابھی تک یہیں مقیم ہیں۔ جو کام کاج یہ لوگ کرتے ہیں' اس کا معاوضہ انہیں باقاعدگی سے ملتا ہے ان میں مصری' حبشی' چینی' اطالوی' فرانسیسی' ولندیزی' الجزائری' شامی اور عراقی عرب بھی شامل تھے۔ تین چار یونانی اور ایک دو جاپانی بھی نظر آئے۔ سب کے سب خوش و خرم اور ان میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جو اپنے وطن جانے کی خواہش رکھتا ہو۔

ایسا معلوم ہوتا تھا وطن کی ذرا بھی کشش ان کے دلوں میں باقی نہیں رہی۔ ان میں سے اکثر ایسے تھے جنہوں نے اچھے اور عمدہ کپڑے پہن رکھے تھے اور ان کے چہروں سے آسودگی کا اظہار ہوتا تھا۔ وہ ہم سے کچھ فاصلے پر اس طرح کھڑے تھے جیسے ہمارے نزدیک آنے سے کسی چھوت کی بیماری میں مبتلا ہو جائیں گے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں اور بچے بھی' وہ بڑی دلچسپی سے ہم آفت زدہ نئے قیدیوں کو دیکھ رہے تھے۔ میں نے دل میں کہا:

''پیپلن! یہ بھی تو ممکن ہے پندرہ برس بعد جب تم ''عمر قید'' کاٹ چکو' تو انہیں لوگوں میں شامل ہو جاؤ' یہیں تمہاری شادی ہو جائے اور زندگی کے بقیہ دن تم یہیں اپنے بال بچوں میں کاٹ دو۔'' یہ تصور اس وقت اتنا پریشان کن تھا کہ میں بے اختیار وہاں سے بھاگ اٹھا سیدھا بیرک میں آیا اور بستر پر گر پڑا۔ مجھے یاد نہیں میں کتنی دیر بستر پر پڑے پڑے روتا رہا' دفعتہً ایک آواز میرے قریب سے بلند ہوئی: ''کیا حال چال ہے پیپلن؟''

میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا' ایک ادھیڑ عمر کا آدمی ہسپتال کے اردلی کی سفید وردی پہنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ مجھے تعجب ہوا اس شخص کو میرا نام کیونکر معلوم ہوا۔ میری نگاہوں میں استفہامیہ کیفیت بھانپ کر بولا۔

''شاید تم نے مجھے پہچانا نہیں؟ میرا نام سائری ہے اور میں الجزائر کا رہنے والا ہوں۔ مدت ہوئی ہماری ملاقات پیرس کی دانتے جیل میں ہوئی تھی۔''

اور تب مجھے یاد آیا کہ اس الجزائری شخص کو میں نے پہلے پہل وہیں دیکھا تھا۔ وہ کسی بڑے جرم کی پاداش میں نہ جانے کتنے برس کی قید بھگت رہا تھا۔ غالباً اسی سلسلے میں اسے یہاں بھیج دیا گیا تھا۔

''میں نے پہچان لیا یار' یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ تم یہاں آ چکے ہو۔ دانتے جیل میں جب اکٹھے تھے' تو غالباً یہ سن اٹھائیس انتیس کی بات ہے اور اب 33ء چل رہا ہے۔''

''ہاں' ان گزشتہ پانچ برسوں میں تقدیر کی گردش نہ جانے کہاں کہاں لے گئی۔ پھر یہاں لے آئی اور اب محسوس کر رہا ہوں یہاں سے کہیں اور جانا مجھے نصیب نہ ہوگا۔''

سائری کی آواز بھرا گئی اور دو آنسو اس کے پھولے ہوئے سرخ گالوں پر ڈھلک آئے۔ میں اپنا رونا دھونا بھول گیا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بستر پر بٹھا لیا۔ اس نے گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھا اور چپکے سے کہا:

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

''یہاں نئے اور پرانے قیدیوں کا آپس میں باتیں کرنا سخت شبے کا باعث بن جاتا ہے۔ ایسا نہ ہو ہم دونوں پر کوئی آفت آئے۔ میں پھر کسی وقت تم سے ملنے آؤں گا۔ دیکھو اگر مشقت سے بچنا چاہتے ہو تو اپنے آپ کو کسی نہ کسی ''بیماری'' میں ہمیشہ مبتلا رکھو۔ ہاں اب ذرا زور زور سے کھانسنے لگو۔

میں نے فوراً حلق پھاڑ پھاڑ کر بری طرح کھانسنا شروع کر دیا اور سینہ پکڑ کر بستر پر ذبح کیے ہوئے بکرے کی طرح لوٹنے لگا۔ دو گارڈ میرے قریب آن کر رک گئے۔

''بے چارہ دمے کا مریض ہے۔'' سائری نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔ ''جوان حوصلہ کرو۔ میں ابھی تمہارے لیے دوا لیکر آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ گارڈ بھی آگے بڑھ گئے۔ مجھے سائری کی حاضر دماغی پر حیرت تھی۔ ٹھیک گیارہ بجے وہ دواؤں سے بھری ہوئی ایک ٹرالی دھکیلتا ہوا آیا۔ آگے آگے ایک ڈاکٹر گلے میں ربڑ کی نلکی ڈالے چل رہا تھا۔ باری باری ہر شخص کا معائنہ کرتے ہوئے وہ میرے قریب بھی آیا۔ میں نے ایک بار پھر کھانسی کے دورے کا مظاہرہ کیا' ڈاکٹر نے سیاہ رنگ کا ایک کڑوا مکسچر میرے حلق میں انڈیلنے کی ہدایت کی اور آگے بڑھ گیا۔

اور یوں سائری دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں کئی بار آنے جانے لگا۔ میں نے اس سے ڈیگا کا تذکرہ کیا اور التجا کی کہ وہ اس کا سراغ لگائے۔ سائری بھی ڈیگا کو اچھی طرح جانتا تھا لیکن کوشش کے باوجود اسے معلوم نہ ہو سکا کہ ان لوگوں کو کہاں رکھا گیا ہے۔ صرف اتنا پتہ چلا وہ ابھی زندہ ہیں اور قید تنہائی میں ہیں۔ گلگانی کے قتل کی تفتیش ابھی جاری ہے۔ تفتیش مکمل ہو گئی تو شاید انہیں قید تنہائی سے نکال کر بیرک میں بھیج دیا جائے ورنہ.....

یہ ادھیڑ عمر کا الجزائری اتنا رحم دل اور خدا ترس تھا کہ کسی طرح یقین نہ آتا کہ اس نے قتل کی واردات کی ہوگی۔ وہ ہر شخص کے پاس جاتا اس کو دوا دلانے یا پلانے کی پوری پوری کوشش کرتا۔ کبھی کبھی کہتا: ''پیپلن' میں بہت گناہگار آدمی ہوں اور چاہتا ہوں مرنے سے پہلے ان گناہوں کی کچھ نہ کچھ تلافی کر دوں۔''

ایک روز وہ میرے پاس آیا تو اس کے ساتھ ایک عمر رسیدہ اور دبلا پتلا گارڈ بھی تھا۔ کہنے لگا۔ ''پیپلن' ان سے ملو یہ میرے افسر اعلیٰ بارٹیلونی ہیں۔ یہ ہسپتال میں گارڈ ہیں بلکہ سب کے افسر..... میں نے ان سے تمہارا ذکر کیا اور یہ تم سے ملنے کے لیے بے چین ہو گئے۔''

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

میں نے بارٹیلونی سے مصافحہ کیا۔ یہ شخص بھی یہاں گزشتہ سال سے تھا اور آزاد قیدیوں میں اس کا بڑا درجہ تھا۔ حکام بھی قابل اعتماد سمجھتے تھے اور اسی لیے ہسپتال جیسی اہم جگہ میں بطور افسر گارڈ کام کر رہا تھا۔ چند منٹ کی گفتگو سے معلوم ہو گیا کہ یہ شخص ہمارے لیے مفید ثابت ہو سکتا ہے بشرطیکہ اسے کرنسی نوٹوں کی ہلکی سی جھلک دکھا دی جائے۔ اس نے ہسپتال کی ''سیر'' کرانے کا بھی وعدہ کیا۔ دوسرے روز گیارہ بجے سائری نے بیرک میں آ کر بتایا کہ ٹیلونی ہسپتال میں تمہارا منتظر ہے' میں اس کے ساتھ ہو لیا۔ ایک وسیع و عریض میدان عبور کر کے ہسپتال کی چھوٹی سی عمارے کے نزدیک پہنچا' میرا خیال تھا وہ وہاں ہو گا اور خوب ''عیش'' کر رہا ہو گا لیکن سائری نے بتایا وہ ایک اور عمارت میں منتقل کیا جا چکا ہے کیونکہ اس نے ہسپتال سے فرار ہونے کی کوشش کی اور اب وہ کڑے پہرے میں ہے۔ حکم دے دیا گیا ہے کہ اگر جولوا اپنی کوٹھڑی سے باہر نظر پڑے' تو فوراً اسے شوٹ کر دیا جائے۔

عمارت بڑی پرانی تھی اور سفید سفید دیواروں پر سرخ کراس کے نشان دور ہی سے بتا رہے تھے کہ یہ ہسپتال ہے۔ ایک وسیع ہال میں ساٹھ ستر مریض موجود تھے۔ ان میں نئے بھی تھے پرانے بھی..... میں بھی ان میں شامل ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ سامنے ہی ڈاکٹر کا کمرہ تھا۔ باری باری ہر شخص اس کمرے میں جاتا اور معائنہ کرانے کے بعد باہر آ جاتا۔ سائری ہر مریض کا نمبر پکارتا اور اسے ڈاکٹر کے پاس جانے کی اجازت دیتا۔ میرے قریب ہی تین عمر رسیدہ قیدی بیٹھے تھے۔ سائری نے ان تینوں سے چینی زبان میں بات کی' دفعتاً میں نے ان میں سے ایک آدمی کو پہچان لیا۔ اس کا نام فرینڈیز تھا۔ اس نے پیرس کے کیفے ڈی میڈرڈ میں ارجنٹائن کے تین آدمی دن دیہاڑے قتل کر دیئے تھے۔ سائری اس شخص کے ساتھ چینی زبان میں نہ جانے کیا باتیں کرتا رہا۔ پھر وہ دونوں اٹھ کر ہال کمرے کے پرلی جانب بنے ہوئے غسل خانے کی طرف چلے گئے۔ چند لمحے بعد سائری تنہا واپس آیا اور اس نے دبے لہجے میں مجھ سے کہا:

''پیپلن' تم خوش قسمت ہو کہ تمہارے لیے ایک اچھا موقع خود بخود نکل آیا۔ اچھا یہ بتاؤ کچھ مال وال بھی ہے تمہارے پاس؟''

''ہاں' کچھ ہے تو سہی' لیکن زیادہ نہیں۔'' میں نے کہا۔

''اگر تم مجھے پانچ سو فرانک دو' تو میں کل صبح ہی ہسپتال میں تمہارے داخلے کا بندوبست

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کر دوں۔ تمہیں کرنا یہ ہو گا کہ صبح سویرے بستر سے اٹھتے ہی چیخنے چلانے اور کھانسنے لگنا اور تکلیف سے نڈھال ہونے کے بعد مرے ہوئے لہجے میں گارڈ سے کہنا کہ ہسپتال جائے اور اردلی کو بلا لائے۔ میں اسی وقت آ جاؤں گا۔ ڈاکٹر سے میں نے بات کر لی ہے۔ وہ تمہارا معائنہ کرے گا اور ہسپتال میں داخلے کی سفارش کر دے گا۔ اس طرح تمہیں ایک ہفتے تک یہاں رہنے کی اجازت مل جائے گی۔ اس دوران میں میں ان طریقوں پر غور کروں گا جن سے تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو فرار ہونے کا موقع مل سکے۔''

''لیکن میں ڈیگا کے بغیر یہاں سے بھاگنا نہیں چاہتا' تمہیں اس کے لیے بھی کچھ کرنا ہو گا۔'' میں نے زور دے کر کہا۔

سائری کے چہرے پر کرب کے آثار نمودار ہوئے' اس نے دانت پیس کر کہا: ''پیپلن' تم نرے احمق ہو۔ ارے بندہ خدا اپنی جان بچانے کی فکر کرو' ڈیگا کے پیچھے دیوانے نہ بنو' اس کے پاس بہت مال دولت ہے۔ وہ آسانی سے نکل جائے گا۔ بہرحال میرا فرض تمہاری مدد کرنا تھا' اب تم جانو تمہارا کام.....''

میں نے دیکھا وہ ناراض ہو گیا ہے' چنانچہ وعدہ کیا میں کل سوچ کر بتاؤں گا کہ مجھے ان حالات میں کیا کرنا چاہیے۔ کیا کوئی ذریعہ ایسا نہیں کہ ڈیگا تک میرا پیغام پہنچایا جا سکے اور اس کا جواب..... تحریری جواب مجھے مل جائے؟ اس طرح فیصلہ کرنے میں سہولت رہے گی۔''

سائری نے ایک لمحہ غور کیا پھر گردن جھٹک کر بولا:

''یار' یہ کام تم نے سخت بتایا۔ اگر کسی کو پتہ چل گیا تو میری ہڈی پسلی سلامت نہ رہے گا۔ بہرحال تم اپنے پرانے دوست ہو' تمہاری خاطر یہ خطرہ مول لینا ہی پڑے گا۔ اس خدمت کا معاوضہ یعنی ایک پیغام لانے اور لے جانے کا..... صرف ایک سو فرانک ہو گا..... بولو' منظور ہے..... خدا کی قسم بڑی رعایت کر رہا ہوں تمہارے ساتھ.....'' فرینڈیز غسل خانے سے نکلا اور اس نے پانچ سو فرانک کے نوٹ سائری کے ہاتھ میں تھما دیئے۔ اب سائری نے مجھے اشارہ کیا' میں ٹہلتا ہوا غسل خانے کی طرف گیا' اندر سے چٹخنی چڑھا کر میں نے حلق میں سے اپنا ''پلان'' برآمد کیا۔ اس میں سے پندرہ سو فرانک کے نوٹ نکالے' پلان دوبارہ اپنی جگہ پہنچایا اور غسل خانے سے سیٹی بجاتا ہوا باہر نکلا' سامنے دو گارڈ رائفلیں لیے کھڑے تھے۔

انہوں نے غور سے میری طرف دیکھا' میں نے ان کی طرف ایک دلفریب تبسم پھینکا اور سائری کے پاس جا کھڑا ہوا۔ گارڈ اب بھی میری طرف ہی دیکھ رہے تھے۔ سائری نے بھی انہیں ادھر دیکھتے ہوئے دیکھ لیا۔ وہ ہونٹ بھینچ کر بڑبڑایا۔

''یہ حرامزادے ہر کام میں حصہ بٹانے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ انہوں نے بھانپ لیا ہے کہ تم مجھے کچھ رقم دو گے۔ بہرحال فکر نہ کرو' میں ان سے نپٹ لوں گا۔''

میں نے سائری کو پانچ سو کے بجائے پندرہ سو فرانک دیئے تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس نے کہا: جو بات طے پائی ہے میں اس سے زیادہ ایک کوڑی نہ لوں گا۔ پانچ سو فرانک ہسپتال میں داخلے کے' ایک سو فرانک ڈیگا تک پیغام بھیجنے کے۔ اور لانے کے اور مزید ایک سو فرانک ان موذی گارڈوں کا منہ بند کرنے کے لیے اور ہاں ایک سو فرانک مجھے اور دے دو' شاید ڈیگا پر مسلط پہریداروں کو دینے پڑ جائیں..... یہ کل کتنے فرانک ہوئے؟ بس اتنے ہی فی الحال بہت ہیں..... یقین کرو پیپلن' اس رقم میں سے ایک فرانک بھی میری ذات کے لیے حرام ہے۔ یہ سب دوسروں کی جیب میں جائے گی۔ کبھی تم خیال کرو میں اپنے لیے یہ رقم تم سے اینٹھ رہا ہوں۔ کیا ہم پرانے دوست نہیں؟''

میں بھلا کیا کہتا؟ سب کچھ سمجھ رہا تھا کہ کس خوبی سے میری جیب کاٹی جا رہی ہے اور پھر گردن پر احسان کا احسان۔

اگلے روز علی الصبح میں نے وہی کھانسنے کا ڈرامہ کھیلا اور سائری کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے آدھ گھنٹے کے اندر اندر ہسپتال میں داخل ہو چکا تھا۔ مجھ سے اگلے بستر پر فرینڈیز لیٹا ہوا تھا۔ پتہ چلا وہ تو آدھی رات ہی کو ہسپتال میں آ گیا تھا' کیونکہ اس کے معدے میں شدید ''درد'' تھا..... ہسپتال کے جس ''وارڈ'' میں ہمیں رکھا گیا وہاں ایک اور اردلی سے سابقہ پڑا۔ ان صاحب کا نام تھا چاتل..... عمر ہوگی چونتیس پینتیس برس کی۔ نہایت چست چالاک اور چلتا پرزہ' آنکھوں سے شرارت اور مکاری گویا ہر وقت ٹپکی پڑتی تھی۔ بات چیت میں نہایت بااخلاق اور نرم لیکن اندر سے زہر میں بجھا ہوا خنجر۔ سائری نے میرے کان میں کہہ دیا اس بدمعاش چاتل سے بنا کر رکھنا ورنہ تم پچھتاؤ گے۔''

ڈیگا کے بارے میں اس نے بتایا کہ اس سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور جونہی یہ کوشش کامیاب ہوئی میرا پیغام اس تک پہنچ جائے گا۔ بس کچھ مہلت درکار ہے۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

اس دوران میں چاتل زیادہ تر میرے اردگرد ہی گھومتا رہا۔ غالباً وہ بھانپ گیا تھا کہ میں کوئی موٹی اسامی ہوں۔ دوسرے روز میں نے باتوں باتوں میں اس سے پوچھا:

''میرا ایک دوست جس کا نام جولو ہے اور جو سیڑھی پر سے گر کر زخمی ہو گیا تھا خدا جانے کیمپ کے کس حصے میں رکھا گیا ہے' کیا تمہیں معلوم ہے وہ کہاں ہے؟''

چاتل کے لبوں پر معنی خیز تبسم نمودار ہوا۔ اس نے اثبات میں گردن کو جنبش دی اور کہا:

''ہاں مجھے معلوم ہے' میں اس خرذات کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ ایک بار اس نے گھونسا مار کر میری گردن توڑنے کی کوشش کی تھی۔ وہ کچھ اچھا آدمی نہیں مسٹر پیپلن' میں حیران ہوں اس سے آپ کی دوستی کیونکر ہوئی۔''

''یہ ایک لمبا قصہ ہے جو پھر کبھی سن لینا' تم میرا پیغام اس تک پہنچا سکتے ہو؟ اس خدمت کے عوض کچھ پیش کروں گا۔''

''اس تکلف کی کیا ضرورت ہے۔'' اس نے ہنس کر کہا: ''آپ سائری کے دوست ہیں اور سائری کسی زمانے میں میرا باس رہ چکا ہے۔ لہٰذا آپ سے کچھ لیتے ہوئے شرم آتی ہے فرمایئے' کیا پیغام ہے جولو کے لیے۔''

''صرف یہ کہ وہ کس حال میں ہے اور اس کا پروگرام کیا ہے؟''

چاتل ایک بار پھر مسکرایا اور چلا گیا۔

میں نے اوپر جس وارڈ کا ذکر کیا ہے' وہ دس فٹ لمبا اور سات فٹ چوڑا ایک کمرہ تھا جس کی چھت اتنی نیچی تھی کہ ایک اچھا طویل قامت شخص اسے ہاتھوں سے چھو سکتا تھا۔ اس کمرے کا ایک ہی آہنی دروازہ تھا جس پر موٹی موٹی سلاخیں لگی تھیں۔ روشن دان بھی ایک تھا اور اس میں بھی سلاخیں تھیں۔ میرے اور فرینڈیز کے علاوہ اس کمرے میں تین اور مریضوں کے پلنگ بھی بچھے تھے۔ دروازے کے باہر تین مسلح گارڈ چوبیس گھنٹے پہرہ دیتے۔ ان کی ڈیوٹیاں تبدیل ہوتی رہتیں مگر تعداد ہمیشہ ایک ہی رہتی۔ ایک دروازے کے قریب اور دو کچھ فاصلے پر۔ باہر برآمدے میں ایک گرانڈیل حبشی جو نہ معلوم کس چکر میں یہاں آن پھنسا' ان گارڈوں کا اسسٹنٹ تھا۔ اس کا کام صرف مریضوں کی گنتی کرنا تھا۔ وہ چوبیس گھنٹوں میں دو یا تین مرتبہ آتا اور یہ معلوم کر کے چلا جاتا کہ سب مریض زندہ ہیں۔ ڈاکٹر صبح و شام صرف دو مرتبہ آتا اور مریضوں کے سینے اور پسلیاں ٹھونک بجا کر چلا جاتا۔ کھانے پینے کی کوئی

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

تکلیف نہ تھی۔ مریض ڈاکٹر کے رحم و کرم پر تھے۔ وہ جب تک چاہے کسی بھی شخص کو ہسپتال میں روکے رکھنے پر قادر تھا اور صرف وہی مریض ڈاکٹر کی خدمات سے فائدہ اٹھا سکتے جن کے حلق میں کرنسی نوٹوں سے بھرے ہوئے ''پلان'' موجود ہوتے۔

خدا کا لاکھ لاکھ شکر کہ یہاں ایکسرے کرنے والی کوئی مشین نہ تھی ورنہ یہ پتہ چلانا دشوار نہ ہوتا کہ پلان کس کس کے حلق میں فٹ ہے۔ ہسپتال کی بلڈنگ اور اس قید خانے کے درمیان جہاں جولو مقید تھا' ایک خوبصورت باغ حائل تھا جس میں سینکڑوں قسم کے عجب و غریب پھول کھلے ہوئے تھے۔ اس قید خانے میں ایسے مجرموں کو رکھا جاتا جو انتہائی خطرناک اور دلیر ہوتے یا جو پہلے فرار ہو جانے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ جولو بھی انہی میں سے ایک تھا۔

چاتل کا فن دیکھیے صرف دس منٹ کے اندر اندر وہ کاغذ کا ایک پرزہ لے کر میرے پاس آیا جس پر جولو کے ہاتھ کی تحریر تھی۔ اس نے لکھا تھا: ''میں یہاں مزے سے ہوں۔ اسی قید خانے کے آخری سرے پر ڈیگا اور اس کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی بند ہیں۔ ایک اطالوی نوجوان جس کا نام رومیو ہے اس نے ڈیگا پر تشدد کرنے والے ایک گارڈ کو بری طرح پیٹا ہے اور رومیو کو ہلاک کرنے کی تدبیریں سوچی جا رہی ہیں۔ بہرحال ڈیگا بچ جائے گا کیونکہ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اس نے محض رومیو کو بچانے کی خاطر چاقو کی ملکیت کا اقرار کیا تھا..... تم کوشش کرو کہ زیادہ سے زیادہ دن ہسپتال میں رہو۔ اگر موقع ملا تو میں بھی ہسپتال میں آنے کی کوشش کروں گا اور ڈیگا کو بھی ساتھ لاؤں گا۔ چاتل کو مہربانی کر کے دو سو فرانک ادا کرنا نہ بھولنا۔''

چونکہ جولو کی تحریر دیکھنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا اس لیے مجھے یہ تسلیم کرنے میں تامل تھا کہ یہ تحریر واقعی اس کی ہے یا چاتل نے مجھے فریب دے کر دو سو فرانک اینٹھ لیے ہیں مگر اسے جھٹلانے کا میرے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا اس لیے میں نے دو سو فرانک ادا کر دیئے۔ اگلے روز ایک تدبیر چاتل کو پرکھنے کی میرے ذہن میں آئی۔ میں نے اس سے کہا اگر وہ جولو تک میرا ایک اور پیغام پہنچا دے تو میں اسے مزید پچاس فرانک ادا کروں گا۔ چاتل فوراً تیار ہو گیا۔ میں نے پیغام بھیجا کہ بولیو جیل میں جس شخص سے ہماری ہاتھا پائی ہوئی تھی' میں اس کا نام بھول گیا ہوں۔ تمہارے ذہن میں ہو تو بتاؤ۔ چاتل اسی وقت گیا اور آدھ گھنٹے بعد واپس آ

کر کہنے لگا: ''جولو کہتا ہے: ''اس شخص کا نام بولارڈ تھا اور وہ تو اب مر بھی چکا ہوگا۔ تمہیں سینٹ مارٹن میں اس کی یاد کیوں ستانے لگی؟''

میں مطمئن ہو گیا۔ چاتل کی پہنچ جولو تک صحیح تھی اور اس کے لائے ہوئے دونوں پیغام درست تھے۔ میں نے اسے ڈیگا کے معاملے میں بھی استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے یقین تھا کہ سائری کے بجائے چاتل اپنی تمام مکاری اور عیاری کے باوجود میرے لیے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ جولو کے بارے میں بھی اس کی معلومات حیرت انگیز تھیں بلکہ ایسا کہیے کہ وہ زیر زمین دنیا کے باسیوں کی چلتی پھرتی انسائیکلو پیڈیا تھا۔ اس نے جولو کے متعلق جو باتیں مجھے بتائیں' وہ پہلے میرے علم میں بھی نہ تھیں۔

''شاید آپ جانتے ہوں مسٹر پیپلن! آپ کا دوست جولو اپنے وقت کا سب سے دلیر ڈکیت رہ چکا ہے؟ جرائم کی دنیا میں وہ ''ہتھوڑے والا'' کہلاتا ہے۔ اس نے کبھی رات کی تاریکی میں چوروں کی طرح چھپ کر اور ڈر کر وارداتیں نہیں کی۔ وہ دن دہاڑے اپنی کار میں نکلتا۔ اس کے پاس پستول ہوتا نہ رائفل۔ صرف معمولی سا ہتھوڑا۔ آپ جانتے ہیں پیرس میں جوہریوں کی بڑی بڑی دکانوں کی کمی نہیں اور ان دکانوں کے شوکیس ایسے ہیں جن میں لاکھوں روپے کے زر و جواہر سجے رہتے ہیں۔ جولو کسی ایسی ہی بڑی دکان کے شوکیس کے سامنے اپنی کار کھڑی کرتا۔ اس کا انجن چلتا رہتا۔ وہ کار سے اترتا ہتھوڑے کی ایک ہی ضرب سے شوکیس کا شیشہ توڑتا اور آناً فاناً جتنے زیور اور جواہر اس کی مٹھی میں آتے سمیٹ کر کار میں بیٹھتا اور برق رفتاری سے کار چلاتا ہوا اڑنچھو ہو جاتا۔ ہر واردات میں وہ خاصا وقفہ دیتا تھا چنانچہ اس نے لوین اینجرز ٹورز اور لی ہارف کے علاقوں میں کئی کامیاب ڈاکے۔ مارے پولیس اس کے پیچھے شکاری کتوں کی طرح لگی ہوئی تھی لیکن جولو پر ہاتھ ڈالنا آسان نہ تھا۔ تنہا ہونے کے باوجود وہ تنہا نہ تھا۔ ڈیگا کا پورا گروہ اس کی پشت پر تھا اور بہت سے پولیس افسروں سے جولو کا خاصا یارانہ بھی تھا۔ وہ باقاعدگی سے ان افسروں کا حصہ ان تک پہنچا دیتا لیکن بکرے کی ماں کب تک خیر مناتی؟ ایک نہ ایک دن اسے چھری تلے آنا ہی تھا اور وہ آ کر رہی۔ سہ پہر کے ٹھیک تین بجے وہ اپنی کار میں پیرس کے ایک بارونق بازار میں ایک مشہور جیولر کی دکان کے سامنے رکا اور نہایت اطمینان سے اپنے تھیلے میں سے ہتھوڑا نکال کر شوکیس توڑ دیا۔ پھر کوئی ایک لاکھ فرانک کی مالیت کے جواہر نکال کر بھاگ نکلا' لیکن اتفاق

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

سے اس کی کار میں کچھ گڑبڑ ہوگئی اور وہ دھر لیا گیا اور بیس سال قید بامشقت کی سزا دے کر یہاں بھیج دیا گیا' مگر چار سال بعد ہی وہ فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا' اب اسے دوبارہ لا گیا ہے۔ لیکن میں شرط لگاتا ہوں وہ یہاں رکنے والا نہیں۔ دیکھ لینا ایک نہ ایک دن غائب ہوجائے گا۔ جولو جیسے مجرم زیادہ دیر تک جیل کے اندر نہیں رہ سکتے۔''

''جولو کے بارے میں تمہاری معلومات قابل رشک ہیں۔'' میں نے کہا' ''مگر یہ بتاؤ تمہیں ان تفصیلات کا علم کیونکر ہوا؟ تم تو خاصی مدت سے یہاں ہو۔''

چاتل کے ہونٹوں پر حقارت آمیز مسکراہٹ ابھری۔ پھر میری طرف دیکھ کر آہستہ سے کہا: ''میرا بھی جولو کے قریبی ساتھیوں اور دوستوں میں شمار ہوتا تھا آہ! وہ دن جو بھلائے نہیں جاسکتے۔''

''اس کا مطلب یہ ہے تم بھی اعلیٰ درجے کے ڈکیت ہوگے؟''

چاتل نے ادب سے اپنی گردن خم کردی۔

مجھے ہسپتال میں پڑے پڑے ایک ہفتہ گزر گیا' مزید ایک ہفتہ کاٹنے کے لیے میں نے چاتل کی معرفت سائری کو دوسو فرانک کی رقم اور بھجوائی۔ فرینڈیز نے بھی ایسا ہی کیا۔ مجھے ابھی تک ڈیگا کی جانب سے کسی اور پیغام کا انتظار تھا۔ یہ پتہ نہ چل سکا کہ وہ کب تک اپنی بیرک میں واپس آرہا ہے۔ خدا کا شکر کہ گلگانی کی رقم میرے پاس تھی ورنہ بڑی مشکل پیش آتی۔ ایک رات ہم نے مشین گنوں کے چلنے کی آواز سنی' گولیاں اولوں کی طرح برس رہی تھیں۔ خدا ہی بہتر جانتا تھا' یہ فائرنگ کیوں کی جارہی تھی۔ شاید قیدیوں کو ڈرانے کے لیے ہوگی۔ اگلی صبح معلوم ہوا جولو فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ مجھے یہ خبر چاتل ہی نے سنائی۔ وہ جولو کو استاد کہتا تھا۔ اس نے ہانپتے ہوئے کہا' ''پیپلن! استاد کل رات پنجرے سے اڑ گیا.....اور مجھے یقین ہے وہ اب ان کے ہاتھ آنے والا نہیں۔''

جولو کا فرار ہوجانا کوئی معمولی بات نہ تھی' کیمپ کے حکام سخت سراسیمہ اور دہشت زدہ تھے۔ ایک بار پھر ایک ایک قیدی کی پڑتال اور تلاشی لی گئی۔ پھر متعدد چھرے' چاقو' پلان اور ایک آدھ ریوالور گولیوں سمیت برآمد ہوا۔ نگرانی کے انتظامات ڈبل کردیے گئے' گارڈوں کی ڈیوٹیاں تبدیل کی گئیں۔ پتہ چلا جولو کی تلاش میں سمندر کی جانب مسلح سپاہیوں کی ایک جماعت روانہ کی گئی ہے۔ اسے حکم ہے کہ بھگوڑے قیدی کو زندہ یا مردہ ہر حالت میں گرفتار کرکے لایا جائے۔

بے اختیار میرے دل سے جولو کی سلامتی کے لیے دعائیں نکلنے لگیں اور خود بخود آنکھیں بھر آئیں.....ٹھیک پندرہ سال بعد۔ مجھے ایک کام کے سلسلے میں ہائتی جانے کا اتفاق ہوا جہاں ایک نیز ولین کروڑ پتی کی فرمائش پر جوئے کا بڑا بھاری کلب کھولا جارہا تھا اور سرمایہ دار چاہتا تھا کہ میں اسے مفید مشورے دوں۔ ایک رات میں کلب میں بیٹھا پی رہا تھا اور کروڑ پتی کی سیاہ فام محبوبہ بھی وہیں تشریف رکھتی تھی' باتوں باتوں میں اس لڑکی نے بتایا میری بوڑھی وادی اپنے علاقے کی مشہور جادوگرنی ہیں۔ کچھ عرصہ قبل انہوں نے ایک فرانسیسی سے شادی کرلی۔ یہ ایک عجیب وغریب آدمی ہے۔ کام کاج کچھ نہیں کرتا۔ اردگرد کے سبھی بدمعاش اس سے ڈرتے ہیں حالانکہ وہ بوڑھا ہوچکا ہے۔ ایک زمانے میں وہ فرانس کا نامور ڈاکو تھا اسی سلسلے میں اسے ایک بار عمر قید کی سزا ہوئی اور وہ فرنچ گیانا کے جزیروں میں مشقت کے لیے بھیجا گیا۔ وہاں سے بھاگ نکلا۔ اس کا محبوب مشغلہ دن رات شراب پینا ہے یا گالیاں بکنا.....''

میں نے بڑی دلچسپی سے باتیں سنیں اور غیر شعوری طور پر پوچھ لیا۔

''گویا یہ صاحب رشتے میں تمہارے دادا جان ہوئے؟ کیا نام ہے ان کا؟''

''جولیس ماریٹو عرف جولو۔''

جوش اور جذبات کا ایک ریلا آیا اور مجھے بہا کرلے گیا۔ گزشتہ زندگی کے تمام مناظر حیرت انگیز سرعت سے نگاہوں کے سامنے سے گزر گئے۔ جولو میرا پرانا دوست.....میں کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے اضطراب کو چھپاتے ہوئے کہا:

''خاتون' مجھے فوراً ہی اپنے اس دادا کے پاس لے چلو۔ میں اس سے ملنے کے لیے بے تاب ہوں۔''

پندرہ منٹ بعد ہم ایک گھنی اور گندی بستی میں کھڑے تھے جو سمندر کے کنارے آباد تھی۔ ہر طرف سیاہ فام ننگ دھڑنگ بچے گھوم رہے تھے اور جابجا غلاظت کے ڈھیر مکانوں کے آگے لگے تھے۔ لڑکی مجھے ایک دومنزلہ مکان میں لے گئی۔ دروازہ ایک بڑھیا نے کھولا جس کا قد خدا جھوٹ نہ بلوائے چھ فٹ سے کچھ زیادہ ہی ہوگا اور جسم بھاری۔ اس کے سر کے بال چاندی کے تاروں کی مانند سفید تھے اور آنکھیں کوڑیوں کی مانند گھومتی تھیں اس نے سر سے پیر تک میرا جائزہ لیا' پھر مقامی زبان میں اپنی نواسی سے باتیں کرنے لگی۔

اس لے بعد اس نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا' میں ایک تاریک اور وسیع کمرے میں کھڑا تھا جس کے ایک گوشے میں تیل سے جلنے والا لیمپ روشن تھا۔ ایک جانب سمندری مچھلیوں کے سڑے بسے ڈھیر میں سے بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ بڑھیا نے ایک ٹوٹے اسٹول پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ پھر وہ حلق پھاڑ کر چلائی:

''جولو..... جولو..... دیکھ تمہارا کوئی ملاقاتی آیا ہے۔''

جواب میں اوپر کی منزل سے کسی جانور کے غرانے کی سی آواز سنائی دی پھر کوئی شخص لکڑی کی سیڑھیاں اترتا دکھائی دیا۔ اس کے جسم پر ڈھیلا ڈھالا لباس تھا' دائیں ہاتھ میں شراب کی بوتل جس سے منہ لگا کر وہ ایک گھونٹ بھرتا اور ایک سیڑھی اترتا..... دفعتہً اس نے گالی دے کر پوچھا:

''کوں آیا ہے اس وقت..... یہ کس کے پیٹ میں مروڑ اٹھا ہے؟''

وہ میرے قریب آن کھڑا ہوا اور غور سے چہرہ دیکھنے لگا' یک لخت اس نے بوتل ایک طرف پھینک دی' اس کے چہرے پر حیرت اور مسرت کے ملے جلے آثار نمودار ہوئے اور گالیوں کا ایک ختم نہ ہونے والا سلسلہ اس کی زبان سے جاری ہو گیا۔ ایسا سلسلہ جس میں ایک بچھڑے ہوئے دوست کی محبت اور شکوے شکایتوں کا انبار جمع ہوتا ہے۔

''کتے کے بچے..... سؤر کے پلے..... حرامزادے..... یہ تم ہو..... پیپلن؟

خدا کی پناہ! تم ابھی زندہ ہو خبیث..... یہ کہہ کر وہ مجھ سے چمٹ گیا اور ایک معصوم بچے کی طرح سسکیاں لے لے کر رونے لگا۔ میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے اور جواب میں میں نے بھی ایسی ہی دس بیس گالیوں سے نواز دیا..... جولو نے بڑھیا کو گالی دے کر کہا' لیمپ قریب لاؤ تا کہ میں اپنے دوست کا چہرہ اچھی طرح دیکھ سکوں۔

بڑھیا حیرت سے یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔ جولو نے اسے حکم دیا جاؤ اور پیارے دوست کے لیے بہترین کھانا تیار کرو' آج ساری رات ہم باتیں کریں گے۔ میں نے بڑی مشکل سے جولو کو سمجھایا' رات بھر قیام کا موقع نہیں۔ پھر کبھی آؤں گا اور کھانا بھی کھاؤں گا' اس وقت تو صرف یہ معلوم کرنے آیا ہوں کہ سینٹ مارٹن سے فرار ہونے کے بعد تم پر کیا بیتی' اس نے فلک شگاف قہقہہ لگایا:

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

''آہاہا..... جنگل کے شیر کو پنجرے میں کون بند کر سکتا ہے؟ انہوں نے مجھے دوبارہ پکڑنے کی بہت کوشش کی مگر شیر پھر شیر ہے..... میں وہاں سے اس طرح نکلا جیسے کڑی کمان سے تیر نکلتا ہے۔ راستے میں آفتیں آئیں اور مصیبتیں اٹھائیں۔ ان کا ذکر کروں تو ایک کتاب تیار ہو جائے' یوں سمجھ لو کولمبیا میں رہا..... وہاں سے بھاگا اور پانامہ پہنچا' ظالموں نے وہاں بھی چین نہ لینے دیا۔ آخر کوسٹاریکا گیا پھر آب و دانہ جیکا لے گیا۔ کام کاج کچھ آتا نہیں تھا جو پرانا دھندا تھا' وہی اختیار کیا۔ پولیس ہر جگہ وحشی بھیڑیوں کی مانند میرے تعاقب میں تھی۔ بخدا کیا زندگی تھی اور کیا دور تھا! دن کہیں گزرتا تھا' رات کہیں' مدتوں جنگلوں میں چھپا رہا۔ سینٹ مارٹن سے جب بھاگا تو سمندر میں ایک ہفتے تک بھٹکتا رہا۔ بہرحال یہ کالی کلوٹی جادوگرنی یہاں مجھ پر عاشق ہو گئی اور تب سے اس کی قید میں ہوں۔ مزے میں کٹ رہی ہے یار..... اب یہاں کیونکر آئے اور آئندہ کیا ارادے ہیں..... کوئی مار پیٹ کا دھندہ ہو تو مجھ سے کہہ دینا گلے گلے پانی ساتھ دوں گا۔''

جولو کے فرار کی خبر نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ رہ رہ کر اپنی بے بسی اور بدنصیبی پر تاؤ آتا۔ چاتل میرا یہ اضطراب دیکھتا اور مسکراتا' مجھے سخت طیش آیا اور ایک ہاتھ اس کی کھوپڑی پر ایسا دیا کہ بچے کو دن میں تارے دکھائی دے گئے۔ کھوپڑی سہلاتا ہوا بھاگ گیا۔ فرینڈیز نے قہقہہ لگایا اور بولا: ''پیپلن! طبیعت خوش ہو گئی' خدا کی قسم اگر تم اس مردود کو نہ مارتے تو میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا اور میں اس کی پٹائی کرتا۔ خواہ بعد میں میرا کچھ بھی حشر ہوتا۔ میں نے سنا ہے' جولو بھاگ گیا۔ کیا یہ شخص تمہارا جاننے والا تھا؟''

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ اپنے بستر سے اٹھ کر میرے پاس آ بیٹھا اور دبے لہجے میں کہنے لگا دیکھو یار میں صاف آدمی ہوں اور تم بھی مجھے اپنے ہی کینڈے کے نظر آتے ہو اس لیے بات کر رہا ہوں۔ خود میرا جی بھی اس بے ہودہ ماحول سے اکتا گیا ہے۔ تین چار قتل پہلے کر چکا ہوں ایک آدھ اور سہی..... اپنا تو مشغلہ یہی ہے۔ یہ ذلیل قیدیوں کی سی زندگی اپنے سے بسر نہیں ہوتی' کسی دن تاؤ آیا تو ایک آدھ گارڈ کے چھرا گھونپ دوں گا۔ رشوت دیتے دیتے عاجز آ گیا ہوں اور ان سالوں کے منہ ہی سیدھے نہیں ہوتے۔ بولو بھیا تمہارے کیا ارادے ہیں؟ اگر جولو اتنے کڑے پہرے میں سے بھاگ نکلا تو یہاں زیادہ آسان ہے۔ میری ایک شخص سے پچھلے دنوں کچھ شناسائی ہوئی ہے۔ پرانا پاپی ہے۔ اس نے

وعدہ کیا ہے کہ اگر ہم کچھ رقم ڈھیلی کریں تو وہ ہمارے بھاگ نکلنے کا پورا پورا انتظام کر دے گا۔ اس سمندر میں بے شمار جزیروں کا جال بچھا ہوا ہے۔ ہم کسی بھی جزیرے میں آسانی سے پناہ لے سکتے ہیں پھر موقع پا کر ان جزائر سے کسی بھی بحری جہاز کے ذریعے نام تبدیل کر کے جا سکتے ہیں۔

میں نے فرینڈیز کو یقین دلایا کہ میں اس منصوبے پر عمل کرنے کے لیے بالکل تیار ہوں۔ سنا ہے بیگنی کیمپ میں پہنچنے کے بعد فرار ہونا ممکن نہیں لہٰذا مجھے تو ہر صورت میں یہاں سے نکل جانا ہے۔ میں صرف اپنے دوست ڈیگا کی آمد کا منتظر ہوں۔

''بہت بہتر میں بھی ڈیگا کا انتظار کرتا ہوں۔'' اس نے کہا' ''مجھے معلوم ہے' ڈیگا کون ہے اور کیا کرتا ہے۔ اگر اس شخص کی معیت نصیب ہو جائے تو کیا کہنے!''

چند روز کے اندر اندر ہم دونوں خاصے بے تکلف ہو گئے اور ہم نے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ یہاں سے فرار ہوں گے تو اکٹھے ہی ہوں گے۔ ابھی ہم ہسپتال میں مزید چند روز قیام کرنے کا پروگرام بنا ہی رہے تھے کہ ڈاکٹر نے ہم دونوں کو رخصت کیے جانے کا آرڈر کر دیا۔ شاید اسے ان دو بستروں کے لیے کسی اور جانب سے کوئی بھاری رقم رشوت میں پیش کر دی گئی ہو گی۔ بہر حال خون کے گھونٹ پیتے ہوئے ہم بڑی بیرک میں واپس پہنچے اور یہ معلوم کر کے پیروں تلے کی زمین نکل گئی کہ بہت سوں کو بیگنی روانہ کیا جا چکا ہے اور بہت جلد ہماری باری بھی آنے والی ہے۔

21 نومبر کی رات کا ذکر ہے' جان کلاز کو ہماری بیرک میں لایا گیا۔ میں اس کی حالت دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں' پیشانی پر خون کے لوتھڑے سے جمے ہوئے تھے۔ وہ کسی زمانے میں ہمارا قریبی دوست تھا' آدمی جانباز اور ہوشیار تھا میں نے اس سے پوچھا کہ ہوا کیا؟ اس نے بتایا کہ پیشاب کرنے جا رہا تھا کہ کسی نے سر پر لوہے کے سریے سے ضرب لگائی اور جب زخمی ہو کر گرا تو اس کی آنکھوں میں کوئی سیال شئے ڈال دی جس سے اس قدر تکلیف ہوئی کہ میں بے ہوش ہو گیا۔ شاید اسی لمحے کوئی اور بھی ادھر آ نکلا اس لیے دشمن کو مزید وار کرنے کا موقع نہ مل سکا اور بھاگ گیا۔

دشمن جان کو ہلاک کر کے اس کے ''پلان'' پر قبضہ جمانا چاہتا تھا جس میں تین ہزار فرانک کی رقم محفوظ تھی۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

غیظ و غضب سے جان کی بُری حالت تھی' اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا: ''پیپلن' کیا تم چوہوں کی طرح مرنا پسند کرو گے؟ بولو' جواب دو' ایسی زندگی سے تو موت ہزار درجے بہتر ہے۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں' جونہی میری طبیعت درست ہوئی میں یہاں سے نکل جاؤں گا خواہ انہیں بعد میں میری لاش واپس لانی پڑے۔''

میں نے اس کا ہاتھ دبا کر آہستہ سے کہا:

''گھبراؤ نہیں' میں تمہارے ساتھ ہوں' ایک اور دوست بھی ہمارا شریک ہے۔ مجھے فقط ڈیگا کا انتظار تھا مگر اب یہ انتظار بے سود معلوم ہوتا ہے۔ ہمیں بہت جلد اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانا ہو گا۔''

میں نے اسے اپنا منصوبہ سمجھایا اور وہ یہ تھا کہ بیرک سے باہر پہرہ دینے والے تین مسلح گارڈوں پر قابو پا کر ان کے کپڑے پہنے جائیں اور بھاگ نکلیں۔ فرینڈیز نے جس شخص کا ذکر کیا تھا اب اس سے ملنا بہت ضروری تھا۔ ظاہر ہے ہم اپنی ٹانگوں کے بل بوتے پر زیادہ دور نہ جا سکتے تھے جب کہ چاروں طرف گہرا سمندر تھا' ہمیں یہ بھی معلوم نہ تھا اس سمندر میں کتنے دن اور کس جانب سفر کرنا پڑے گا' کس جزیرے میں پناہ مل سکے گی اور راہ کی کٹھن دشواریوں اور مصائب پر کیونکر قابو پایا جا سکے گا۔

فرینڈیز کی معرفت اگلے ہی روز میری ملاقات اس شخص سے ہوئی جس نے رقم کے عوض فرار کے انتظامات کر دینے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ نہایت گھاگ اور پرانا مجرم تھا اور گزشتہ بیس برس سے سینٹ مارٹن میں آزاد قیدی کی حیثیت سے مقیم تھا۔ کیمپ کے فوجی حکام سے اس کی راہ و رسم تھی.....اس کا نام تھا جیس.....دبلا پتلا' طویل قامت' سوکھی ہڈیوں کا ڈھانچہ - لبوترے چہرے پر دو گہرے زخموں کے نشان - ایک آنکھ سرخ دوسری نیلی.....سرخ آنکھ گندگی کی پوٹ اس میں سے ہر دم بہتا ہوا پانی.....نہ جانے اس شخص کو دیکھتے ہی میرا جی کیوں متلانے لگا اور میری چھٹی حس نے مجھے بتایا یہ آدمی بالکل ناقابل اعتبار ہے۔

''میں آپ کے لیے کشتی کا انتظام کر سکتا ہوں۔ ایسی کشتی جس میں چار پانچ آدمی آسانی سے سفر کر سکیں۔'' اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا'' اس کے علاوہ پانی کا ایک کنستر' بسکٹ' کافی اور تمباکو بھی مہیا کر سکتا ہوں۔ تین چپو' چار بڑی بڑی خالی بوریاں'

سوئی' دھاگا' ایک لمبی رسی' چاقو' قطب نما اور شراب کی پانچ بوتلیں.....اس سامان کے عوض آپ سے صرف ڈھائی ہزار فرانک وصول کروں گا۔ آئندہ تین راتیں چاند نہ نکلنے کی وجہ سے بے حد تاریک ہوں گی۔ اپنے فرار کی پلاننگ انہی راتوں میں کریں تو زیادہ بہتر ہے۔ میں ہسپتال کی دیوار کے پاس آپ لوگوں کا انتظار کروں گا' کشتی ہسپتال کی شمالی دیوار کے بالکل سامنے موڑ کے پاس ہی مل جائے گی۔ آپ دیوار کے ساتھ ساتھ ہاتھ سے ٹٹول کر راستہ طے کریں گے اور جونہی آپ کا ہاتھ موڑ کو چھوئے' جان لیجیے کشتی بالکل سامنے ہے۔''

میں اس کی تقریر صبر وسکون سے سنتا رہا۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ اس کی کسی بات پر بھی دل نہ ٹھکتا تھا مگر میں نے کوئی اعتراض نہ کیا اور ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ دل میں کہتا رہا' تمہاری ان ہدایات کی ایسی تیسی اور تم جاؤ جہنم میں.....میں رخصت ہونے لگا تو اس نے جھجک کے بغیر خالص کاروباری انداز میں کہا:

''آپ رقم کب ادا کریں گے؟ ہر صورت میں رقم پیشگی وصول کی جاتی ہے۔ اس میں کسی قسم کی رعایت نہ ہوگی۔''

یہ سن کر میں نے اسے دل ہی دل میں کئی مغلظ گالیاں دیں مگر زبان سے کہا: ''فکر نہ کرو جیسس' پوری رقم تمہیں سائری کی معرفت پہنچ جائے گی۔'' سائری کے نام پر وہ چونکا اور کسی قدر خوش دکھائی دیا۔

''جی ہاں سائری بہتر آدمی ہے۔ آپ بے شک اسی کے ذریعے رقم بھجوا دیں۔ رقم پہنچتے ہی آپ کا کام ہو جائے گا۔''

اب میری نفرت وحقارت انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ گویا یہ شخص ہمیں اتنا ہی احمق سمجھتا ہے کہ کسی ضمانت کے بغیر ڈھائی ہزار فرانک کی خطیر رقم ہم اسے تھما دیں گے۔

ہم ایک دوسرے سے ہاتھ ملائے بغیر رخصت ہو گئے۔

میں نے جان کلاز اور فرینڈیز سے اس گفتگو کا ذکر کیا' وہ دونوں بھاگ نکلنے کے لیے اس قدر بے قرار تھے کہ سوچے سمجھے بغیر ''رسک'' لینے کو تیار ہو گئے۔ انہوں نے مجھ پر زور دیا کہ رقم ادا کر دی جانی چاہیے۔ چنانچہ اسی روز سائری کی معرفت ڈھائی ہزار فرانک جیسس کو بھجوا دیئے گئے۔ جان کلاز بہت پُر امید اور خوش تھا۔ یہی کیفیت فرینڈیز کی تھی مگر میرا دل مجھے بار بار ملامت کر رہا تھا کہ ڈیگا کو مصیبت کے عالم میں چھوڑ کر بھاگ جانا شرافت سے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

بعید ہے۔ سہ پہر چاتل کے ذریعے ڈیگا کا پیغام موصول ہوا اسے ہمارے منصوبے کا علم ہو گیا تھا اور اس نے ہمیں موقع سے فائدہ اٹھانے کی خوشی سے اجازت دے دی تھی۔ یہ پیغام پا کر میرے دل کا بوجھ کچھ ہلکا تو ہوا لیکن پھر بھی میں اداس تھا۔

ہم تین آدمی فرار کے منصوبے میں ایک دوسرے کے شریک کار اور رازدار تھے لیکن بیرک کے مسلح پہرے داروں اور اس حبشی چوکیدار سے نپٹنے کے لیے تین غیر مسلح آدمی بالکل ناکافی تھے اور چاہتے تھے کہ کم از کم ایک یا دو اور آدمی اس مہم میں شریک ہو جائیں مگر سوال یہ تھا وہ آدمی کون ہوں اور کہاں سے لائے جائیں۔ پیرولی فواس کام کے لیے بے حد موزوں تھا لیکن وہ کہیں اور منتقل کیا جا چکا تھا۔ بیاگی نام کا ایک شخص کارسیکا کا رہنے والا ہمارے قریب ہی تھا۔ میں نے اندازہ کیا کہ آدمی جیدار اور بھروسے کے لائق ہے مگر فرینڈیز کا کہنا تھا کہ ان کارسیکا والوں پر اعتماد کرنا پرلے درجے کی حماقت ہے۔ یہ لوگ غدار' بزدل اور بے وقوف ہوتے ہیں۔

ہم اس مسئلے پر غور وفکر کر رہے تھے کہ ماترو ادھر سے گزرا اور ہمارے پاس آن کھڑا ہوا۔ یہ اٹھارہ برس کا نہایت حسین اور صحت مند لڑکا تھا جسے ایک ٹیکسی ڈرائیور کو قتل کرنے کے جرم میں سزا ہوئی تھی۔ واردات قتل کے وقت اس کی عمر سولہ سترہ برس سے زائد نہ تھی۔ کیمپ کی وہ ہر دلعزیز شخصیت تھا۔ جو بات میں کہنا چاہتا ہوں' اس کا اصل مطلب آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ قیدی ہی نہیں بعض گارڈ' سپاہی اور افسر بھی اس لڑکے میں دلچسپی لیتے تھے۔

''کیا حال ہے ماترو؟'' میں نے مسکرا کر کہا ''کیسی گزر رہی ہے؟''

''جی رہا ہوں مسٹر پیپلن۔'' اس نے اپنی زنانہ آواز میں کھلکھلا کر جواب دیا۔ ''ماچس ہوگی آپ کے پاس؟''

''ہاں ہاں یہ لو'' میں نے اسے ماچس نکال کر دی۔ پھر ایک سگریٹ بھی تھما دیا۔ سگریٹ دیکھ کر وہ بہت خوش ہوا۔ اتنے میں وہ حبشی دیو ادھر سے گزرا اور ماترو کو دیکھ کر اپنے سفید دانت نکال دیئے اور پالتو کتے کی طرح دم ہلانے لگا' ماترو نے نفرت بھری نگاہ سے اسے دیکھا اور منہ پھیر کر بولا۔

''مسٹر پیپلن' اس منحوس کی شکل دیکھی آپ نے؟ لیکن آپ خود کو حسین سمجھتے ہیں اور اس غلط فہمی میں مبتلا کہ میں بھی ان پر فدا ہو جاؤں گا۔'' یہ کہہ کر ماترو معنی خیز انداز میں ہنسنے لگا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

دفعتاً ایک عجیب خیال بجلی کی مانند میرے ذہن کے پردے پر کوند گیا۔ اگر ماترو کے ذریعے اس گرانڈیل حبشی پر قابو پا لیا جائے تو بقیہ تین مسلح گارڈوں سے نمٹنا دشوار نہ ہوگا۔ میں نے الگ ہو کر پہلے اس سے وعدہ لیا کہ وہ گفتگو کا ایک لفظ بھی کسی سے نہ کہے گا ورنہ اس کی لاش کیمپ کے مردہ خانے میں پڑی ملے گی۔

تب میں نے اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا اور کہا کہ وہ اگر چاہے تو حبشی کو ''دام محبت'' میں گرفتار کر کے اپنے اشاروں پر چلا سکتا ہے۔ ہم چاہتے ہیں اسے بیرک کے اندر آدھی رات کے بعد بلایا جائے تاکہ کسی ذریعے سے اس پر قابو پا سکیں۔ اس کے بعد گارڈوں سے نمٹنا آسان ہو جائے گا۔

''بولو اس خدمت کے عوض تم کتنی رقم چاہتے ہو'' میں نے پوچھا ''یا ہمارے ساتھ ہی اس جہنم سے بھاگ نکلنے پر رضامند ہو؟''

''میں آپ کے ساتھ چلوں گا مسٹر پیپلن! میں یہاں کسی قیمت پر رہنا نہیں چاہتا۔ اس منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے میں جان کی بازی بھی لگا سکتا ہوں۔ آپ مجھ پر ہر طرح اعتماد کر سکتے ہیں۔''

''بس تو پھر طے ہے تم جتنی جلد ممکن ہو حبشی کو رام کرو۔''

میں نے واپس آ کر جان کلاز اور فرینڈیز کو بتایا کہ معاملہ خوش اسلوبی سے طے پا گیا ہے۔ اسی رات آٹھ بجے کے قریب حبشی دیو جھومتا جھامتا بیرک میں آیا۔ ماترو اس کے قدموں کی آہٹ پا کر اٹھ بیٹھا اور اس انداز میں مسکرایا کہ حبشی پر فدا ہو گیا ہو۔ اس نے ادھر اُدھر چور نظروں سے بیرک کا جائزہ لیا ہم سب اپنے اپنے بستروں میں دبکے پڑے تھے۔ کوئی شخص بھی حبشی کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا' ماترو نے دبے لہجے میں چند لمحے حبشی سے راز و نیاز کیے میں نے ایک آنکھ کھلی رکھی تھی اور چپکے چپکے جائزہ لیتا رہا۔

رات دس بجے حبشی پھر آیا وہ لڑکا بے خبر سو رہا تھا' حبشی نے ماترو کا پیر پکڑ کر ہلایا۔ لڑکا جاگ گیا' حبشی نے بیت الخلا کی طرف اشارہ کیا اور ادھر چلا گیا۔ ماترو نے اٹھ کر میری جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ میں نے بھی ہاتھ کے اشارے سے اسے حبشی کے پیچھے جانے کی ہدایت کی۔ پندرہ منٹ بعد ماترو واپس آیا اور اپنے بستر میں جا دبکا۔ حبشی نے بیرک کا چکر لگایا اور مطمئن ہو کر واپس چلا گیا۔

اگلے روز ہم نے ماترو کو سمجھایا کہ حبشی کو آدھی رات کے بعد آنے کی ہدایت کرے۔ نومبر کی 27 تاریخ تھی' سہ پہر کے چار بجے چاتل بیرک میں آیا اور اس نے سائری کا پیغام دیا کہ جیسس نے سب انتظام کر لیا ہے۔ آج رات سے وہ اپنے وعدے کے مطابق مقررہ مقام پر انتظار کرے گا۔ پیغام ملتے ہی ہم نے اپنے پلنگ کا ایک پایہ ڈھیلا کیا' فرینڈیز نے کہیں سے لوہے کی ایک دو فٹ لمبی سلاخ تلاش کر کے پہلے ہی سے اپنے بستر کے نیچے چھپا رکھی تھی۔ رات آٹھ بجے حبشی حسب معمول بیرک کے راؤنڈ پر آیا اور سیدھا ماترو کی طرف گیا۔ ماترو نے اسے آدھی رات کے بعد آنے کو کہا' حبشی رضامند ہو گیا۔ کیمپ کے چوکیدار نے جونہی آدھی رات کا گجر بجایا ہم مستعد ہو گئے۔ حبشی سوا بارہ بجے دبے پاؤں آیا' اس نے لڑکے کا پیر ہلایا۔ وہ چابی سے چلنے والے کھلونے کی مانند اٹھا اور سیدھا بیت الخلا کی طرف ہو لیا۔ حبشی پہلے ہی ادھر جا چکا تھا۔ میں نے لپک کر پلنگ کا آہنی پایہ سنبھالا۔ بیرک میں سناٹا اور اندھیرا تھا۔ ہر شخص اپنے اپنے بستر میں دبکا سو رہا تھا۔ باہر غضب کی ٹھنڈ تھی' جان کلاز خالی ہاتھ تھا جب کہ فرینڈیز نے لوہے کی سلاخ تھام رکھی تھی۔ ہم تینوں دبے پاؤں نہایت خاموشی سے بیت الخلا کی طرف بڑھے۔ جان کلاز سب سے آگے تھا۔ اس کے پیچھے میں اور میرے پیچھے فرینڈیز' ہمارے دل بری طرح دھڑک رہے تھے اور ہاتھ پیروں میں سنسناہٹ سی تھی۔

جان کلاز اس بیت الخلا کے باہر جا کھڑا ہوا جس میں ماترو اور حبشی گئے ہوئے تھے۔ چند لمحوں بعد حبشی باہر آیا اور جان کو دیکھ کر حیرت سے بولا:

''تم یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو بدمعاش؟ چلو اپنے بستر میں جا کر سو جاؤ۔''

اس سے پیشتر کہ وہ مجھے دیکھتا' میں نے پوری قوت سے پلنگ کا پایہ حبشی کی کھوپڑی پر دے مارا۔ ہلکی سی آواز نکالے بغیر وہ کٹے ہوئے شہتیر کی مانند گرا' ہم نے جلدی جلدی اس کی کئی من وزنی لاش گھسیٹ کر بیت الخلا کے پچھلے حصے میں ڈال دی۔ فرینڈیز نے احتیاطاً اپنی آہنی سلاخ کا ایک اور وار اس کی کنپٹی پر کر دیا تاکہ اس کے زندہ رہ جانے کا امکان ہی ختم ہو جائے۔ اب میں نے جلدی جلدی حبشی کی وردی اتاری اور خود پہن لی۔ اگرچہ وہ میرے بدن پر ڈھیلی ڈھالی تھی لیکن رات کی تاریکی میں مسلح گارڈوں کو دھوکا دینے کے لیے کافی تھی۔ اب میں نے اپنے ساتھیوں کو دروازے کے دائیں بائیں دبک جانے کی ہدایت کی اور

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

ہاتھ میں وہی پلنگ کا پایہ پکڑ لیا۔ پھر ہدایت کے مطابق ماترو نے دروازے پر دستک دی۔ ایک گارڈ نے باہر سے دوہرے دروازے کا ایک پٹ کھول کر اندر جھانکا اور ماترو کو دیکھتے ہی ہنس کر بولا:

''کیا بات ہے لڑکے' کیا تکلیف ہے؟'' ''جناب' حبشی بیت الخلا کے اندر بے ہوش پڑا ہے' شاید گیس چڑھ گئی ہے' ابھی میں وہاں گیا تو اسے اس حال میں دیکھا۔''

''خدا غارت کرے اسے.....'' گارڈ نے ایک فحش گالی بک کر کہا اور رائفل سمیت دوسرا دروازہ کھول کر اندر آیا۔ چشم زدن میں میرا اور فرینڈیز کا ہاتھ بیک وقت حرکت میں آئے اور اس گارڈ کا بھی وہی حشر ہوا جو حبشی کا ہو چکا تھا۔ جان کلاز نے بڑی پھرتی سے اس کی وردی اتاری اور پہن لی۔ رائفل اس کے ہاتھ میں تھی' نہایت اطمینان سے اس نے باہر جا کر دونوں گارڈوں کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ بے چارے بری طرح اونگھ رہے تھے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ پانچ منٹ کے اندر اندر ہم انہیں بھی دنیا و مافیہا سے بے خبر کر کے ان کے کپڑوں اور ہتھیاروں پر قبضہ جما چکے تھے۔

بیرک کے باہر ہیبت ناک سناٹا تھا اور تاریکی ایسی کہ خدا کی پناہ.....ہم ایک دوسرے سے فاصلہ برقرار رکھے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ ہمارے اور ہسپتال کے درمیان کوئی دو سو گز کا فاصلہ تھا اور ہسپتال سے اتنی ہی دور وہ مقام جہاں جیسس نے انتظار کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ دریا کا پانی ہسپتال کی دیوار کو چھوتا ہوا گزرتا تھا۔ یخ بستہ پانی کا تصور کرتے ہی میرے جسم میں تھرتھری سی چھٹ گئی۔ ہم اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے آگے بڑھتے رہے۔ ایک ایک قدم بھاری تھا اور ہر لمحہ موت ہم سے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ دفعتاً سرچ لائٹ روشن ہو گئی۔ ہم فوراً اوندھے منہ لمبی گھاس میں گر گئے' روشنی ہم پر سے گھومتی ہوئی شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب کی طرف نکل گئی۔ اتنی تیز روشنی تھی کہ ہماری آنکھیں چندھیا گئیں۔ کئی منٹ تک سرچ لائٹ گھومتی رہی پھر بند ہو گئی۔ ہمارے ذہن اس قدر ماؤف تھے کہ یہ بھی یاد نہ رہا۔ ہم نے گارڈوں کی وردیاں پہن رکھی ہیں اور رائفلیں ہمارے ہاتھوں میں ہیں۔ اگر کوئی ہمیں دیکھ بھی لے تو کچھ شک وشبہ نہ کرے گا۔ بہت جلد ہم کیمپ کی دیوار کے پاس پہنچ گئے جو تقریباً آٹھ فٹ اونچی تھی۔ اس سے پہلے ہمیں خاردار تاروں کی ایک باڑ سے بھی گزرنا پڑا۔ سچ تو یہ ہے ہمیں اس مصیبت کا اندازہ نہ تھا اور ہم نے اس تار کو پھلانگنے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

یا کاٹنے کا کوئی انتظام نہ کیا تھا لیکن ماترو نے شاید ایسے ہی موقع کے لیے نہ جانے کہاں سے ایک پلاس حاصل کر رکھا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے کئی تار کاٹ دیئے اور اتنا راستہ بنا لیا کہ ہم سب مڑ تڑ کر اس راستے میں سے نکل گئے۔ پتھر کی دیوار چڑھنے کا معاملہ کچھ زیادہ دشوار نہ تھا۔ ہم میں فرینڈیز سب سے قوی تھا۔ وہ گھٹنوں کے بل جھکا اور اس نے مجھے کندھوں پر سوار ہونے کا اشارہ کیا۔ پلک جھپکنے میں میں دیوار پر چڑھ گیا۔ پھر جان کلاز بھی آ گیا۔ اس کے بعد ماترو کو بھی پھول کی مانند ہم نے اٹھا لیا۔ اب فرینڈیز کی باری تھی میں نے اور جان کلاز نے بڑی مشکل سے ڈھائی من کے اس آدمی کو ہاتھ پکڑ کر دیوار پر چڑھنے میں مدد دی لیکن دوسری جانب کودتے ہوئے جان کلاز کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ معلوم ہوا وہ کسی گہرے گڑھے میں جا گرا ہے اور اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔ اندھیرے میں بڑی مشکل سے ٹٹول ٹٹول کر ہم نے جان کو اس قبر نما گڑھے میں سے باہر نکالا۔ تکلیف اور سردی کی شدت سے اس کا برا حال تھا۔ اس نے التجا کی کہ ہم اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں اور کشتی میں بیٹھ کر بھاگ جائیں مگر ہم نے اس کی بکواس پر دھیان نہ دیا۔ اب ہم ہسپتال کی شمالی دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ جان کلاز بڑی مشکل سے چل رہا تھا۔ اندھیرا اتنا شدید کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا۔ دیوار ٹٹول ٹٹول کر ہم آگے بڑھ رہے تھے۔ آخر ہم دیوار کے اس موڑ پر پہنچ گئے جس کا پتہ جیسس نے دیا تھا۔ یہاں چند لمحے ہم دم لینے کے لیے رُکے۔

میں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور میرا پاؤں گہری دلدل کے اندر دھنستا ہی چلا گیا۔ پھر میں اوندھے منہ اس دلدل میں گرا' فوراً ہی دبی دبی ایک آواز فضا میں ابھری:

''پیپلن! کیا تم آ گئے؟''

''ہاں کون بول رہا ہے۔ جیسس یہ تم ہو؟''

یکا یک روشنی کا ایک شعلہ سا تاریکی کا سینہ چیر گیا۔ جیسس نے ماچس کی تیلی جلائی تھی۔ میں نے دیکھا کوئی پچیس فٹ دور دو آدمی کھڑے ہیں.....میں لڑکھڑاتا اور کانپتا ہوا ان کی طرف بڑھا۔ جلتی ہوئی تیلی بجھ گئی اور ایک بار پھر اندھیرا مسلط ہو گیا۔

''جیسس' میرے ایک ساتھی کو چوٹ لگ گئی ہے۔ وہ چل نہیں سکتا۔ کشتی کہاں ہے اور بقیہ سامان کشتی میں رکھ دیا گیا ہے؟''

''ہاں کشتی موجود ہے اور تین چو میرے پاس ہیں۔ آپ اپنے ساتھی کو جلدی سے کشتی

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

میں سوار کر دیجیے۔ ٹھیک آدھ گھنٹے بعد دریا میں سے نگران کشتی پر سپاہی گزریں گے۔ آپ کو ان کے آنے سے پہلے پہلے خاصی دور نکل جانا چاہیے۔ تاخیر نہ کیجیے اپنے ساتھی کو بلائیے۔''

میں جس جگہ کھڑا جیسس سے باتیں کر رہا تھا کشتی وہاں سے سو گز دور تھی۔ وقت نازک اور کم۔ جان کلاز چلنے سے معذور۔ عجب وقت آن پڑا تھا۔ ہم نے اسے اپنے کندھوں پر چڑھا لیا اور دلدل اور پانی میں سے گزر کر وہاں پہنچے۔ چار ہم تھے اور پانچواں جیسس۔ اس کا نامعلوم ساتھی وہیں پر کھڑا تھا جب ہم کشتی پر سوار ہو گئے تو جیسس نے دبی زبان سے کہا:

''کشتی کو پانی کے بہاؤ پر بہنے دو۔ خبردار کوئی شخص ابھی چپو چلانے کی کوشش نہ کرے۔ چپو کی آواز اس سناٹے میں دور دور تک سنی جاتی ہے۔''

یہ ایک ہولناک اور کڑا سفر تھا جس میں ہم داخل ہو رہے تھے۔ ایک نامعلوم منزل کی جانب، جس میں قدم قدم پر موت اپنا بھیانک جبڑا کھولنے کے لیے تیار تھی۔ بہاؤ خاصا تیز تھا اور کشتی بڑی سرعت سے چلی جا رہی تھی۔ ایک میل تک ہم اس طرح بہتے رہے۔ کوئی شخص نہ بولا جان کلاز سردی اور تکلیف کی شدت سے بیہوش ہو گیا تھا۔ جیسس نے آہستہ آہستہ ایک چپو کے ذریعے کشتی کو صحیح راستے پر رکھنے کی کوشش شروع کر دی۔ پروگرام یہ تھا کہ وہ ہمیں کسی محفوظ جگہ پر چھوڑ کر کشتی واپس لے جائے گا مزید دو میل دور نکل جانے کے بعد جیسس نے کہا:

''اب ہم کسی حد تک خطرے سے نکل چکے ہیں۔ یہاں بولنے بات کرنے پر پابندی نہیں۔ آپ چاہیں تو سگریٹ پی سکتے ہیں۔ براہ کرم مجھے بتائیے مسٹر پیپلن کہ آپ بیرک سے نکلنے میں کیونکر کامیاب ہوئے۔ بخدا مجھے بالکل یقین نہ تھا کہ آپ لوگ آج رات ہی آ جائیں گے۔ میں سمجھ رہا تھا نہ جانے مجھے کتنی راتیں آنکھوں میں کاٹنی پڑیں گی۔''

میں نے اسے مختصر الفاظ میں حالات سے آگاہ کیا۔ چند لمحے بعد وہ بولا: ''کیا آپ نے اطمینان کر لیا تھا کہ وہ حبشی مر گیا ہے اور کیا گارڈوں میں سے کوئی زندہ تو نہیں؟''

''گارڈوں کے بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا، ممکن ہے وہ تینوں زندہ ہوں یا ان میں سے ایک آدھ چل بسا ہو۔ البتہ حبشی کے بارے میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کے بچ جانے کے امکانات کم ہیں۔ ضرب ایسی شدید تھی کہ میں نے اس کی کھوپڑی چٹخ جانے کی آواز صاف سنی ہے۔''

''خیر، خیر، دیکھی جائے گی۔'' جیسس نے کہا۔ ''وہ آپ لوگوں کی تلاش میں زمین آسمان ایک کر دیں گے۔ میرا خیال ہے انہیں اب تک واردات کا پتہ چل گیا ہو گا تاہم صبح صادق تک ہم ان کی پہنچ سے باہر ہوں گے۔''

جان کلاز کے کراہنے کی آواز سنائی دی اسے ہوش آ گیا تھا۔ اس نے نحیف لہجے میں کہا ''ہم کدھر جا رہے ہیں۔ اس کم بخت ہڈی کو بھی ابھی ٹوٹنا تھا سارا مزا کرکرا کر دیا۔''

میں نے اسے دلاسا دیا: ''گھبراؤ نہیں، ہم بہت جلد کسی محفوظ مقام پر پہنچ کر تمہاری دیکھ بھال شروع کر دیں گے۔ اب چپ چاپ پڑے رہو۔''

''یہاں سے بارہ میل دور یہ دریا دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔'' جیسس نے کہنا شروع کیا۔ ''دریا کے اس حصے میں ایک وسیع و عریض پہاڑوں سے گھری ہوئی وادی ہے۔ اس وادی کے اندر بہت سے قدرتی غار ہیں اور پورا علاقہ گھنے جنگل سے پٹا پڑا ہے۔ آپ اس وادی کے کسی بھی غار میں آسانی سے پناہ لے سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے آپ آٹھ روز تک چھپے رہیں، اس کے بعد وہاں سے نکلنے کی تدبیر کریں۔ مقامی باشندے ادھر کثرت سے آمد و رفت رکھتے ہیں۔ ان کی مدد سے ایک اور کشتی، لباس اور خوراک وغیرہ حاصل کی جا سکتی ہے۔ دریائے میرونی میں آپ ہمیشہ رات کو سفر کریں۔ یہی دریا سمندر تک پہنچا دے گا۔ دن رات مسلح سپاہیوں کی بے شمار ٹولیاں بغیر انجن کی کشتیوں میں سوار سمندر میں گھومتی رہتی ہیں۔ آپ اگر گارڈوں کی وردیاں پہنے رہیں تو زیادہ بہتر رہے گا۔ ان کے علاوہ موٹر بوٹس بھی وہ کبھی کبھی استعمال کرتے ہیں۔ رات کے وقت سفر کے دوران ماچس کی تیلی جلانا، کھانسنا، باتیں کرنا آپ کے لیے سخت مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔''

صبح کے چار بج رہے تھے جب ہماری کشتی اس مقام تک پہنچی جہاں دریا دو حصوں میں بٹ جاتا ہے۔ یہاں اونچی اونچی قدرتی چٹانیں تھیں جنہوں نے دریا کو دو حصوں میں بانٹ دیا تھا۔ ایک حصہ غالباً سمندر کی طرف جاتا اور دوسرا اس وادی کی طرف جس کا ذکر جیسس نے کیا تھا۔ صبح کاذب کے اس دھندلکے میں کچھ فاصلے پر اونچی اونچی پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ فضا میں سردی بے پناہ تھی اور ہمارے ہاتھ پیر اور چہرے سن ہو چکے تھے۔ ہم باری باری چپو چلا کر اپنے جسم گرم کرتے..... کنارے پر پہنچ کر ہم نے خوراک کے تھیلے اور ضروری سامان کشتی سے نکالا، کندھوں پر لادا، جان کلاز کو ماترو نے سہارا دے رکھا تھا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

''اب مجھے واپس جانا ہے' خدا آپ سب کا نگہبان ہو!'' جیسس نے کہا۔ ''میں ایک لمبا چکر کاٹ کر جاؤں گا کیونکہ بہاؤ کے خلاف کشتی لے جانا مجھ اکیلے کے بس کی بات نہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے سب سے ہاتھ ملایا اور کشتی میں سوار ہو کر چند لمحوں میں نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

ہم اس وقت سخت آفت اور اذیت میں مبتلا تھے لیکن آزادی کی نعمت سے سرشار تھے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں بھیانک خواب دیکھنے کے بعد بیدار ہوا ہوں۔ وہ دل جو قید و بند میں مر چکا تھا دوبارہ زندہ ہو رہا تھا۔ ہم چار افراد جو چند روز پہلے تک ایک دوسرے کے لیے قطعی اجنبی تھے مشترکہ مصیبت نے ہمیں آپس میں ساتھی اور رازدار بنا دیا تھا۔

ماترو..... اٹھارہ برس کا نسائیت سے بھرپور لڑکا..... نہایت سخت جان اور حوصلہ مند نکلا' تمام راستے اس نے زبان سے شکایت کا ایک لفظ بھی نہ نکالا۔ جان کلاز جس کی زندگی میں نہ جانے کتنے حادثے بھرے پڑے تھے اور جو سنگدلی کی حدیں پھلانگ چکا تھا' زخمی ہونے کے بعد ایک معصوم بچے کی مانند میرے گلے سے لگ کر سسکیاں بھر رہا تھا اور بار بار کہتا تھا۔

''پیپلن' تم مجھے کہاں اٹھائے اٹھائے پھرو گے۔ تم میرے لیے اپنے آپ کو آفت میں نہ ڈالو۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ میں نہیں چاہتا میری وجہ سے تم اور تمہارے ساتھی دوبارہ پکڑے جائیں۔ اگر ایسا ہوا تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہ کروں گا۔''

جب اس کا اصرار ہذیان کی حدوں کو چھونے لگا تو میں نے بے حد سنجیدہ لہجے میں کہا' ''دیکھو مسٹر جان کلاز' مرد بنو اور ایسی بیہودہ باتیں چھوڑ دو۔ ہم نے ایک منصوبہ اکٹھے ہی بنایا' اکٹھے ہی اس پر عمل کیا اور کامیاب ہوئے۔ خدا کی قسم میں سچ کہتا ہوں کہ مرتے دم تک تمہارا ساتھ نہ چھوڑوں گا' تمہیں اس حال میں چھوڑ کر جانا مردانگی اور غیرت کے خلاف ہے۔ فرض کرو یہ حادثہ میرے ساتھ پیش آتا تو تم مجھے چھوڑ کر چلے جاتے؟ اب ہم اکٹھے ہی جئیں گے اکٹھے ہی مریں گے۔''

مشرقی افق خاصا روشن ہو چکا تھا اور اونچے اونچے درختوں کی شاخیں ہوا کے جھونکوں سے جھوم رہی تھیں۔ پانی کے بہاؤ میں نرمی آ گئی تھی۔ جوں جوں سورج پہاڑ کے پیچھے سے بلند ہو رہا تھا' فضا میں پھیلی ہوئی ٹھنڈک کم ہو رہی تھی۔ یہ نہایت دلفریب اور حسین مقام تھا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے ہم جہنم سے نکل کر کسی جنت ارضی میں داخل ہو گئے ہیں۔ چاروں طرف

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

اونچی نیچی پہاڑیوں کے سلسلے تھے اور ان پہاڑیوں پر چیل اور دیودار کے ان گنت درخت سر اٹھائے کھڑے تھے۔ چوٹیوں پر چمکیلی دھوپ یوں پڑ رہی تھی جیسے سونا پگھل رہا ہو۔ دریا کا سرمئی پانی اب چاندی کی ایک دمکتی لکیر میں بدل گیا تھا۔

ماترو اور فرینڈیز نے آناً فاناً جنگل میں سے موٹی موٹی لکڑیاں چنیں اور ایک بھدا سا سٹریچر تیار کر کے جان کلاز کو اس پر لٹایا۔ اس کے بعد ہم اس وادی کی طرف روانہ ہوئے جس کا ذکر جیسس نے کیا تھا۔ جنگل خاصا گھنا تھا اور درختوں کی شاخیں ایک دوسرے سے گتھی ہوئی تھیں۔ زمین نرم اور گیلی تھی اور جانوروں کے پیروں اور پنجوں کے نشان کہیں کہیں نمایاں تھے۔ ابھی تک ہمیں کسی انسانی قدم کے نشان دکھائی نہ دیئے تھے۔ ایک میل چلنے کے بعد جنگل اور گھنا ہو گیا۔ درختوں پر بندر کثرت سے تھے جو شاخوں پر جھولا جھولتے' ہمیں دیکھ کر خوخیاتے اور منہ چڑاتے تھے۔ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جا رہے تھے راستہ کٹھن اور دشوار گزار ہوتا جاتا تھا بلکہ یوں کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ وہاں سرے سے کوئی راستہ تھا ہی نہیں۔ سورج آسمان پر خاصا بلند ہو چکا تھا لیکن گھنی شاخوں اور پتوں کے باعث دھوپ بمشکل زمین تک پہنچ پاتی تھی البتہ روشنی اتنی ضرور تھی کہ ہم آسانی سے آگے بڑھ رہے تھے۔

پہاڑ ابھی دور تھے' یکا یک ہم نے اپنے آپ کو ایک پایاب ندی کے کنارے پایا۔ یہاں ہیبت ناک سناٹا تھا۔ اردگرد کے درخت بندروں اور پرندوں سے بالکل خالی۔ ہم نے وہاں تھوڑی دیر ستانے کا فیصلہ کیا۔ جان کلاز کی تکلیف میں اب کسی قدر کمی تھی مگر نقاہت کے مارے اس کا برا حال تھا۔ اس کے ٹخنے کی ہڈی ٹوٹی نہ تھی اتر گئی تھی اور جب میں نے اس کی پتلون ہٹا کر ٹخنہ دیکھنے کی کوشش کی تو اسے بے حد اذیت ہوئی' ٹخنہ سوج کر کپا بن چکا تھا اور سوجا ہوا حصہ خون کی مانند سرخ تھا۔

ماترو ایک بار پھر چھوٹی چھوٹی لکڑیاں اور شاخیں جمع کر کے لایا' آگ جلائی گئی اور میں نے اپنی قمیض کا ایک حصہ پھاڑ کر اس کے ذریعے جان کے ٹخنے کی سکائی شروع کی۔ آہستہ آہستہ سوجن کم ہونے لگی لیکن اس سخت سردی کے باوجود جان کا چہرہ پسینے سے تر ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بے خبر سو گیا۔ اب ہمیں بھوک نے ستایا۔ جیسس نے خوراک کے دو تھیلے ہمارے حوالے کیے تھے۔ ہم نے ان میں سے ایک کھولا' اس میں چند گلے سڑے پھل' سوکھی روٹیوں اور بھنے ہوئے چنوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہ بے ہودہ خوراک بھلا کتنے دن ہمارا ساتھ

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

دے سکتی تھی اس تھیلے کے اندر ہم نے چار انچ لمبے پھل کا ایک پرانا چاقو بھی پایا۔ دوسرے تھیلے میں بھی یہی سامان تھا۔ صرف ایک ٹوٹی پھوٹی بیکار قطب نما اور دس بارہ انچ لمبی رسی کا بوسیدہ ٹکڑا اس میں زائد تھا۔

دفعتاً ماترو پاگلوں کی طرح چیخنے چلانے لگا اور اگر میں پھرتی سے ہٹ نہ جاتا تو وہ موذی میرا کام تمام کر گیا تھا۔ یہ کالے رنگ کا ایک ہیبت ناک ناگ تھا جو درخت کے اوپر سے گرا تھا اور اب پھن پھیلائے اپنی زرد زرد آنکھوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ اس کی لمبی سرخ زبان نہایت سرعت سے بار بار اندر باہر نکلتی۔ مجھ سے اس کا فاصلہ کوئی ایک گز کا ہوگا۔ ناگ کے تیور انتہائی خطرناک تھے اور وہ اتنا مستعد کہ اگر میں ذرا بھی جنبش کرتا تو وہ پلک جھپکنے میں مجھے ڈس لیتا۔ میں نے اپنے اوسان بحال رکھے اور جسم کو حرکت دیئے بغیر فرینڈیز سے کہا فائر کرو لیکن فرینڈیز جو پیرس کے ایک کیفے میں تین آدمیوں کو بیک وقت قتل کر چکا تھا' ناگ کو دیکھتے ہی پتھر کا بت بن گیا۔ جان کلاز پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی میری طرف دیکھتا کبھی ناک کی طرف۔ میں نے دوبارہ چلا کر فرینڈیز کو فائر کرنے کی ہدایت کی۔ اس مرتبہ اسے کچھ ہوش آیا مگر اب رائفل نہیں اٹھتی تھی۔ میں نے دیکھا اس کے ہاتھ تھر تھر کانپ رہے ہیں' ناگ موقع پا کر کچھ اور آگے آ گیا۔ اب اس میں اور جان کلاز کے پھیلے ہوئے زخمی ٹخنے میں ایک فٹ کا فاصلہ تھا۔ موت کا سایہ اپنے اوپر دیکھ کر جان کلاز کا چہرہ ایک بار پھر پسینے میں تر ہو گیا' میں نے آہستہ سے کہا:

''جان' جس طرح لیٹے ہو اسی طرح بے حس و حرکت لیٹے رہو۔'' یہ کہہ کر میں ایک قدم پیچھے ہٹا۔ ناگ غضب ناک ہو کر جھوما اور فوراً آگے بڑھا۔ اب وہ پورے قد سے اٹھا ہوا جھوم رہا تھا۔ اس کے پھن کی چوڑائی کم از کم آٹھ انچ ہوگی۔ اتنے میں فرینڈیز نے فائر کر ہی دیا۔ گولی بہت قریب سے چلائی گئی تھی اور مجھے امید نہ تھی کہ نشانے پر بیٹھے گی۔ مگر خدا کو ہم میں سے کسی ایک کی جان بچانا ابھی منظور تھا اس لیے گولی ناگ کے پھن پر پڑی اور اس کا دھڑ اپنے ساتھ ہی لیتی گئی۔ بقیہ دھڑ دیر تک تڑپتا اور لوٹتا رہا۔ آخر سرد پڑ گیا۔ پھر اس کا گوشت آپ ہی آپ گلنا شروع ہو گیا۔ چند لمحوں بعد ہم نے دیکھا وہاں سیاہ رنگ کے لیس دار پانی کے سوا کچھ نہ تھا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

''اگر یہ نر سانپ تھا تو اس کی مادہ بھی قریب ہی ہوگی۔'' جان کلاز نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''پیپلن' اسے تلاش کرو ورنہ وہ ہم میں سے ایک آدھ کو ضرور ڈس لے گی۔''

ہم نے رائفلیں سنبھالیں اور اردگرد کی زمین اور درختوں کی جڑوں کا بغور معائنہ کیا۔ وہاں سانپوں کے رینگنے کے بہت سے نشان دکھائی دیئے۔ معلوم ہوا ہم تو سانپوں کی بستی میں آ گئے ہیں۔ اسی میں عافیت جانی کہ وہاں سے بھاگنے کی کوشش کریں۔ شدید تھکے ماندے ہونے کے باوجود ہم نے جان کاسٹریچر سنبھالا اور ندی پار کر کے وادی کی طرف چلنے لگے۔

✣ ✣ ✱ ✣ ✣

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

.....3.....

جنگل میں سفر کرتے ہوئے ہمیں دو گھنٹے ہو گئے۔ ایسا ہیبت ناک مقام اس سے پہلے کبھی نظر سے نہ گزرا تھا' وہ فلک بوس پہاڑ جو اتنے قریب دکھائی دیتے تھے اب ہر لحظہ ہم سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ شدید سردی کے باوجود ہم سب پسینے سے شرابور تھے۔ جان کلارز بھدے سے اسٹریچر پر بے ہوش پڑا تھا۔ فرینڈیز اور ماترو بری طرح ہانپنے لگے تو چند منٹ کے لیے میں نے انہیں دم لینے کی اجازت دی۔ خدا کی پناہ..... ہمارے اردگرد کس قدر ہولناک خاموشی پھیلی ہوئی تھی: جنگل اس قدر گھنا اور تاریک جیسے یہاں سورج کی کرن کبھی نمودار نہ ہوئی ہو۔ نامعلوم خوف سے میرے بدن کے رونگٹے بار بار کھڑے ہونے لگتے اور میں اس وحشی ہرن کی مانند چاروں طرف دیکھنے لگتا جس کا تعاقب خونخوار چیتا کر رہا ہو۔ ہمیں ابھی تک کسی انسان کی شکل نظر نہ آئی تھی۔ جس راستے پر ہم چلے جا رہے تھے اسے راستہ کہنا ہی غلط ہوگا۔ راستہ ہم خود بنا رہے تھے۔ خودرو جھاڑیاں کثرت سے تھیں اور ان میں جا بجا ڈیڑھ ڈیڑھ انچ لمبے نوکیلے کانٹے لگے تھے۔ ہمیں جھاڑیاں کاٹ کاٹ کر آگے بڑھنا پڑتا تھا۔ اس کوشش میں کپڑے تار تار ہو گئے اور بدن زخموں سے چور..... زخموں سے رسنے والا سرخ خون اب جم کر سیاہ رنگ میں بدل چکا تھا تاہم ہمیں ان زخموں کا کوئی احساس تھا نہ پروا..... ہم جلد سے جلد کسی محفوظ مقام پر پہنچ جانا چاہتے تھے۔ بعض اوقات مجھے یوں لگتا جیسے ہم اس کرہ ارضی پر نہیں کسی اور سیارے پر سفر کر رہے ہیں۔ ایسا سیارہ جہاں بے شمار حشرات الارض ہیں اور ان گنت درندے پرندے اور چرندے! جہاں کی آب و ہوا اور فضا مختلف اور جہاں کوئی انسان نہیں بستا..... عجیب و غریب احساسات اور تصورات کی دنیا تھی جس میں مجھے مشیت کے نادیدہ ہاتھ نے پھینک دیا تھا اور کچھ معلوم نہ تھا ہم پر کیا گزرنے والی ہے۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

اچانک ہمیں ایک جانور چھپکلی سے ملتا جلتا دکھائی دیا۔ جھاڑیوں میں ان کی حد درجہ کثرت تھی۔ لمبائی میں دو اڑھائی فٹ۔ ایک فٹ لمبی تو دم ہی ہوگی۔ کھال کا رنگ گہرا مٹیالا زرد' کچھ کچھ کچھوے کی کھال سے مشابہت۔ بڑی بڑی گول آنکھیں جن کی پتلیاں سرخ اور ان پتلیوں کے گرد پیلے رنگ کے دائرے۔ ان دائروں میں سرخ پتلیاں لٹو کی مانند گردش کرتیں' منہ مگرمچھ کی تھوتھنی کی مانند لمبوترا اور جبڑے میں دونوں طرف آدھ آدھ انچ لمبے نکیلے سفید دانتوں کی قطار..... ان دانتوں سے اندازہ ہوا کہ یہ جانور گوشت خور ہے تاہم ہمیں دیکھ کر یہ خوفزدہ ہو کر جھاڑیوں میں چھپ جاتا۔

اب دور ہٹتے ہوئے پہاڑ خاصے قریب آ گئے تھے یا یوں کہیے کہ ہم گرتے پڑتے آخر کار ان کے قریب پہنچ ہی گئے۔ جنگل رفتہ رفتہ کھلا اور ہموار ہوتا جا رہا تھا۔ سورج کی کرنیں بھی زمین تک آسانی سے آ رہی تھیں۔ ایک پہاڑی چشمے کے پاس رک کر ہم نے دم لیا۔ پانی اس قدر سرد اور شیریں تھا کہ دو گھونٹ پیتے ہی جان میں جان آ گئی۔ اس دوران میں کلارز کو ہوش آ چکا تھا اور اسٹریچر پر چت لیٹا گردن گھما گھما کر گردوپیش کا حیرت سے جائزہ لے رہا تھا۔

''پیپلن' یہ کونسی جگہ ہے؟..... کیا میں ابھی تک زندہ ہوں؟''

''جگہ کا تو مجھے علم نہیں کونسی ہے۔'' میں نے جواب دیا ''ہاں یہ یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ تم ابھی تک زندہ سلامت ہو۔''

''کاش! میں مر جاتا۔'' اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور وہ آستین سے منہ ڈھانپ کر بچوں کی مانند سسکیاں لینے لگا۔

''یار تم جیسا بزدل آدمی نہیں دیکھا۔'' میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا' ''ذرا سی ٹانگ کی چوٹ پر تمہاری بیزاری کا یہ عالم ہے۔ کچھ حوصلہ کرو بھائی' چند روز کے اندر اندر مجھے امید ہے تم چلنے پھرنے لگو گے۔ خدا کا شکر کرو ہڈی وڈی نہیں ٹوٹی۔''

چشمے کے ساتھ ہی ایک چٹان کے اوپر تنگ سا غار تھا۔ ہم نے اس کے اندر پناہ لینے کا ارادہ کیا۔ غار کا اچھی طرح سروے کرنے کے بعد اندازہ ہوا کہ اس سے بہتر جگہ چھپنے کے لیے فی الحال مشکل سے ملے گی۔ سب سے بڑی سہولت یہاں پانی کی تھی اور یہ بھی ہم نے دیکھ لیا تھا کہ سڑی بسی خوراک کا جو ذخیرہ ہمارے پاس موجود ہے اگر وہ ختم ہو جائے تو ہم

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

جنگلی پھلوں اور جانوروں کا شکار کر کے ان کے گوشت سے پیٹ کی آگ بخوبی بجھا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں کسی کا ہمارے علم و اطلاع کے بغیر پہنچ پانا ممکن نہ تھا۔ چٹان تین طرف سے کچھ اس طرح سینہ تانے اور گردن اٹھائے کھڑی تھی کہ ان اطراف سے انسان تو کجا کوئی چوہا بھی غار کی جانب نہیں آ سکتا تھا۔ غار کا منہ مشرق کی طرف تھا اور اسے چھپانے کے لیے ہم نے جھاڑیاں اکھاڑ کر اس طرح دہانے پر کھڑی کر دی تھیں کہ کسی کو شبہ بھی نہ ہو سکتا تھا کہ یہاں کوئی چھپنے کی جگہ ہو گی۔ غار میں وسعت اتنی تھی کہ پچاس افراد آسانی سے سما سکتے تھے۔

چشمے کے ہر آن ابلتے ہوئے پانی نے کچھ فاصلے پر ایک پایاب ندی کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس ندی کے کنارے ہم نے بہت سے جانوروں کے قدموں اور پنجوں کے نشان بھی دیکھے..... غار کی صفائی میں کچھ وقت صرف ہوا اور اس کے اندر رہنے والے حشرات الارض کو جب ہم نے بھگا دیا تب ہم اطمینان سے پاس پاس لیٹ کر گہری نیند سو گئے۔ احتیاطاً میں نے فرینڈیز کی ڈیوٹی لگا دی کہ جب تک ہم سوئیں وہ دہانے کے نزدیک رائفل لیے پہرہ دے گا۔ اگرچہ بے چارے کا تھکن سے برا حال تھا لیکن جان کس کو پیاری نہیں ہوتی؟ بڑی پھرتی سے یہ ناگوار فرض ادا کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔

ایک گھنٹے بعد اس نے مجھے جگا دیا اور خود دھڑام سے پتھریلی زمین پر گر کر سو گیا۔ چند لمحوں میں اس کے بے پناہ خراٹوں سے پورا غار گونج رہا تھا۔ میں تازہ ہوا پھیپھڑوں میں بھرنے کے لیے دہانے سے جھاڑیاں ہٹا کر باہر نکلا۔ میری نظروں کے سامنے ایک حسین اور دلفریب منظر تھا..... سرپہر کے جنگل کا منظر..... حیوانی زندگی کی چہل پہل اپنے عروج پر تھی۔ کیا دیکھتا ہوں۔ ندی پر پانی پینے کے لیے دس بارہ سوروں کا ایک غول گردنیں جھکائے اور نتھنوں سے فوں فوں کی بھیانک آوازیں نکالتا چلا آ رہا ہے۔ یہ ایک نرالا تماشا تھا جو میری آنکھوں نے دیکھا۔ شریر بچوں کی طرح یہ جانور ندی میں گھس گئے اور ایک دوسرے سے کھیلنے لگے۔ ان میں بڑے بڑے سور بھی تھے اور چھوٹے بھی۔ میرے دیکھتے دیکھتے پانی کے اندر سے ایک مہیب مگرمچھ نے لمبی سی تھوتھنی باہر نکالی اور ایک سور کی ٹانگ اپنے جبڑے میں دبالی..... سور نے بھیانک آواز میں چلانا شروع کیا..... آناً فاناً دوسرے سور اس کی مدد کو جمع ہو گئے اور انہوں نے مگرمچھ پر حملہ کر دیا مگرمچھ لٹو کی مانند پانی میں گھومنے لگا کبھی کبھی اس کی

لمبی دم کسی سور کو لگتی اور وہ فضا میں چند فٹ اونچا اڑ کر دھم سے دوبارہ پانی میں آن گرتا۔ اتنے سور مل کر بھی مگرمچھ کا کچھ نہ بگاڑ سکتے۔ کئی بار میرے دل میں خیال آیا کہ فائر کر کے مگرمچھ کو ختم کر ڈالوں لیکن یہ سوچ کر رک گیا ممکن ہے فائر کی آواز کسی ''دشمن'' تک پہنچ جائے اور ہم دھر لیے جائیں۔

چند منٹ کے اندر اندر مگرمچھ نے کئی سور ہلاک کر دیئے۔ ان کی لاشیں پانی پر تیرنے لگیں اور ان کے خون سے ندی کا پانی سرخ ہو گیا۔ اب ایک عجیب بات ہوئی۔ سوروں نے مگرمچھ کو تو چھوڑ دیا اور اپنے مرے ہوئے ساتھیوں کی لاشوں پر ٹوٹ پڑے اور انہیں نوچ نوچ کر اور بھنبھوڑ بھنبھوڑ کر ہڑپ کرنے لگے۔ یہ ہنگامہ کوئی آدھ پون گھنٹے جاری رہا۔ مگرمچھ اپنا شکار لے کر پانی میں غائب ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد سور بھی جدھر سے آئے تھے ادھر چلے گئے۔ اس کے بعد جب تک ہم وہاں رہے مگرمچھ دوبارہ دکھائی نہ دیا۔

شام کو سورج چھپنے سے ذرا پہلے ہم سب چاق چوبند ہو چکے تھے' سوکھی لکڑیاں جلا کر لوہے کے ایک لمبوترے برتن میں قہوہ بنایا گیا اور سب نے مزے لے لے کر پیا۔ جان کلاز کی حالت اب کسی قدر بہتر تھی۔ ایک بار پھر ہم نے مل کر اس کے زخم کی سکائی کی۔ جیسس کا کرم ملاحظہ فرمایئے کہ اس نے سیاہ رنگ کے سے صابن کا ایک ٹکڑا بھی تھیلے میں ڈال دیا تھا۔ ہم نے اس صابن سے منہ اور جسم کا میل اتارا۔ جوں جوں شام کے سائے گہرے ہوتے جاتے تھے' جنگل کی زندگی انگڑائیاں لیتی ہوئی بیدار ہو رہی تھی۔ غار کے آس پاس ہم نے کئی بال دار لمبی دمیں دیکھیں جو ذرا سی آہٹ پاتے ہی دوڑ کر درختوں کے تنوں پر چڑھ جاتیں۔ ہم نے باسی روٹی کے ٹکڑے ان کی طرف پھینکے تو یہ وہاں جمع ہو گئیں اور ان پر شوق وذوق سے ٹوٹ پڑیں۔

فضا میں سردی بہت بڑھ گئی تو ہم نے سوچا کہ آگ کا الاؤ روشن کرنا ہی پڑے گا۔ ہمارے پاس گرم کپڑے نہ ہونے کے برابر تھے۔ سوال یہ تھا الاؤ روشن کرنا تباہ کن تو نہ ہو گا۔ فرینڈیز اور جان کلاز کی رائے تھی کہ ایسا کرنا خطرے کا سبب بن سکتا ہے..... ماترو چپ تھا اور ٹکر ٹکر کبھی میری طرف دیکھتا۔ کبھی دوسروں کی طرف۔ اس بے چارے کی کوئی رائے نہ تھی۔ میں نے کہا' یہ خطرہ مول لیے بغیر چارہ نہیں' فضا میں ٹھنڈ کا سر شام یہ حال ہے تو رات بیتنے پر کیا ہو گا؟ کیا یہ مناسب ہو گا کہ صبح تک ہم سب کی اکڑی ہوئی لاشیں اس غار میں سجی

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

ہوں اور یہ گلہریاں ہمارے بدن نوچ نوچ کر کھا جائیں؟ اس تصور سے فرینڈیز نے جھرجھری لی اور ایک بار پھر اٹھ کر جنگل میں گیا اور تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو اس کے سر پر خشک لکڑیوں کا ایک انبار لدا ہوا تھا۔

وہ رات ہم نے کچھ سو کر اور کچھ جاگ کر باری باری پہرے دے کر اور نہایت ڈراؤنے ڈراؤنے خواب دیکھ کر کاٹی' صبح آنکھ کھلی تو سب اپنے آپ کو صحیح سلامت پا کر خوش ہوئے۔ جان کلاز کا سوجا ہوا ٹخنہ حیرت انگیز طور پر خود بخود ٹھیک ہوتا جا رہا تھا اس نے چلنے کی کوشش کی اور محسوس کیا پہلے سے خاصا آرام ہے۔ الاؤ کے گرد ہم نے بندروں' گلہریوں اور ایک نامعلوم جانور کے پنجوں کے نشان بھی دیکھے۔ ندی پر جا کر نے ہاتھ منہ دھویا۔ جنگلی پھلوں' باسی روٹی اور قہوے کا ناشتہ کیا۔ خدا جانتا ہے شدید بھوک اور پریشانی کے عالم میں ان چیزوں نے وہ مزہ دیا جو بعد ازاں تمام عمر لذیذ سے لذیذ کھانوں میں بھی میسر نہ آیا۔ ماترو نہایت ہوشیار نکلا' اس نے اپنا چاقو ایک پتھر پر خوب تیز کیا۔ پھر ہنستا ہوا میرے پاس آیا اور پھل کی دھار پر انگوٹھا پھیرتے ہوئے بولا:

''مسٹر پیپلن' آپ کی حجامت خاصی بڑھ چکی ہے اور حجامت بڑھی ہوئی شکلیں مجھے پسند نہیں' آیئے آپ کی شیو بنا دوں۔''

''دیکھو میاں لڑکے' کہیں میرا یہ خوبصورت چہرہ لہولہان نہ کر ڈالنا۔'' میں نے کہا۔

''آپ دیکھیے تو سہی' شیو کے بعد شکل ہی کچھ اور نکل آئے گی۔'' اس نے ماہر حجاموں کی طرح چاقو کا پھل اپنی بائیں ہتھیلی پر رگڑتے ہوئے کہا۔ پہلے اس نے پانی سے میری ٹھوڑی اور کلے اچھی طرح تر کیے۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ چاقو کا پھل میرے رخساروں پر پھیرنے لگا۔ چند لمحوں بعد جب اس نے جیب سے آئینے کا پرانا ٹکڑا نکال کر میرے سامنے رکھا تو میں دنگ رہ گیا۔ ظالم نے اس حسن سے داڑھی مونڈی تھی کہ چہرے پر ہلکی سی خراش بھی نہ آنے پائی اور ہلکے سے ہلکا رواں بھی صاف ہو چکا تھا۔ اب تو دوسرے بھی اس کی خوشامد کرنے لگے۔ ماترو نے تھوڑی دیر میں ان کی بھی حجامت بنا دی۔

ہمارے پاس دن کا بڑا حصہ بے کار تھا۔ سوچا اب کیا کیا جائے۔ دوستوں کی رائے ہوئی کہ جنگل کی سیاحت کی جائے۔ ممکن ہے چھپنے کی زیادہ اچھی جگہ مل جائے۔ اس کے علاوہ یہ بھی مقصد تھا کہ جنگلی پھل جمع کیے جائیں۔ خشک لکڑیاں رات کے الاؤ کے لیے اکٹھی کی جائیں اور مناسب ہو تو بندوق کے ذریعے کوئی چھوٹا موٹا جانور بھی شکار کر لیا جائے۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ابھی ہم یہ پروگرام بنا ہی رہے تھے کہ بندروں کا ایک غول خوخیاتا اور اچھلتا کودتا ہمارے قریب آن کر رک گیا۔ یہ خاصے بڑے بڑے اور موٹے تازے بندر تھے۔ ان کے جسموں پر لمبے گھنے سیاہ اور بھورے بال تھے' ناکیں لال اور انگارہ سی اور ہاتھوں کے پنجے از حد نوکیلے..... وہ ہم سے پچاس فٹ کے فاصلے پر نیم دائرے کی صورت میں دھرنا مار کر بیٹھ گئے۔ ان کے تیور جارحانہ تھے..... درمیان میں ایک بوڑھا بندر اپنے ہم جنسوں کی صف سے کچھ آگے نکل کر نہایت شاہانہ انداز سے بیٹھا تھا۔ اس نے ادھر اُدھر غور سے دیکھا' پھر منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا۔ ہم نے اپنی اپنی رائفلیں سیدھی کر لیں' ماترو نے وہی چاقو نکال کر ہاتھ میں سختی سے تھام لیا جس سے چند لمحے پیشتر وہ ہماری حجامتیں بنا چکا تھا۔ جان کلاز غار کی ایک دیوار کے سہارے بیٹھ گیا' رائفل اس کے ہاتھ میں تھی اور انگلی لبلبی پر۔

''جب تک میں اشارہ نہ کروں' کوئی شخص فائر نہ کرے۔'' میں نے دبی زبان میں جان اور فرینڈیز کو ہدایت کی۔ بندروں کا سردار اپنی جگہ سے اٹھا اور دائیں بائیں گھوم پھر کر جائزہ لینے لگا کہ وہ ہم پر کس رخ سے حملہ آور ہو سکتا ہے۔ دیکھتے دیکھتے کوئی پانچ چھ سو بندر وہاں جمع ہو گئے۔ ندی کے چپے چپے پر ان کا قبضہ تھا اور ارد گرد کے درختوں کی کوئی شاخ ایسی نہ تھی جس پر وہ جھولا نہ جھول رہے ہوں۔ ایسا نظر آتا تھا انہیں ہمارا اس جگہ قیام کرنا پسند نہیں آیا۔ ہر لحظہ ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا اور میں دھڑکتے دل سے سوچ رہا تھا۔ ہم محدود کارتوسوں کے بل بوتے پر کتنی دیر اس فوج کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ غار کے دہانے کا سامنے والا حصہ چھوڑ کر وہ چٹان کے تینوں اطراف میں پھیل رہے تھے۔ عقب کا حال چونکہ میری نگاہوں سے پوشیدہ تھا اس لیے کہہ نہیں سکتا وہ ادھر بھی پہنچے یا نہیں تاہم ان کا بوڑھا سردار ایک تجربہ کار اور ہوشیار جرنیل کی مانند اپنی جنگلی زبان میں بڑبڑ کر کے ہدایات برابر جاری کر رہا تھا۔ میں نے دیکھا آہستہ آہستہ نہایت چالاکی سے وہ اپنا دائرہ ہمارے گرد تنگ کرتے جا رہے ہیں۔ اب ہمارے لیے اس کے سوا کوئی صورت نہ تھی کہ اپنی مدافعت میں فائر کریں۔

میرا اشارہ پاتے ہی بیک وقت فرینڈیز اور جان کی رائفلوں نے شعلے اگلے۔ ادھر میں نے بوڑھے سردار کو اپنا نشانہ بنایا' ایک ہولناک شور سے جنگل کی فضا گونج اٹھی۔ ایسا شور جس نے چند ثانیوں کے لیے ہم پر سکتہ طاری کر دیا۔ میں نے صرف اتنا دیکھا کہ کئی بندر خاک و خون میں لوٹنے لگے۔ خوں' خوں' خوں اور چڑ چڑ کی ملی جلی آوازوں نے ایک قیامت

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

برپا کردی' بندر چھلاؤں کی مانند اچھلتے کودتے اور دانت نکال کر بھیانک شکلیں بناتے ہوئے ہمارے دائیں بائیں دوڑنے لگے۔ بعض اتنے قریب آ گئے کہ ہمیں دوبارہ فائر کرنے پڑے۔ ایک بار پھر چند بندر خون میں نہا گئے۔ میرا خیال تھا فائرنگ کے بعد وہ خوفزدہ ہو کر بھاگ نکلیں گے لیکن ان کے جوش وخروش اور غیظ وغضب میں مطلق کمی واقع نہ ہوئی۔ پھر میں نے اس بوڑھے بندر کو بھی دیکھ لیا جس پر گولی چلائی تھی' وہ مرا نہیں تھا البتہ اس کے دائیں شانے سے خون کا فوارہ جاری تھا۔ مگر ظالم اس حالت میں بھی اپنی بے پناہ فوج کی کمان سنبھالے ہوئے تھا۔ بار بار وہ خوفناک چہرہ اٹھا کر ہمارے غار کی جانب دیکھتا اور حلق پھاڑ کر چلاتا۔ میں نے اس کی کھوپڑی کا نشانہ لیا اور رائفل سے شست لی ہی تھی کہ وہ بھانپ کر ایک درخت کے تنے کے پیچھے جا چھپا۔ اتنے میں فرینڈیز کے منہ سے چیخ نکلی۔ ایک قدآور بندر اچھل کر اس کے سر پر آیا۔ فرینڈیز نے رائفل گھما کر اس کا بٹ اس کی کھوپڑی پر مارا مگر وہ اس قدر پھرتیلا تھا کہ وار بچا گیا اور دوبارہ حملہ آور ہوا۔ بے چارہ فرینڈیز اس قدر بدحواس ہو چکا تھا کہ اس مرتبہ اپنا بچاؤ بھی نہ کر سکا۔ پلک جھپکتے میں بندر نے اس کا دایاں ہاتھ بھنبھوڑ ڈالا مگر میں نے اسے بھاگنے نہ دیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ میری گولی کھا کر ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ ابھی یہ لڑائی شدت سے جاری تھی۔ بندروں کے غل غپاڑے اور فائرنگ کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی اور ہمیں یہ احساس ہو رہا تھا کہ ان وحشیوں سے جان بچا لے جانا ممکن نہیں۔ دفعتاً ایک معجزہ رونما ہوا۔ ایسا معجزہ کہ اتنے برس بعد آج بھی اسے یاد کرتا ہوں' تو خدا کی قدرت کاملہ پر ایمان از سر نو تازہ ہو جاتا ہے۔

بندروں کی ایک اور عظیم فوج نمودار ہوئی۔ یہ پستہ قامت تھے۔ ان کے چہرے سرخ اور دمیں لنگوروں کی دموں کی مانند لمبی۔ انہوں نے آتے ہی کالے اور بھورے بندروں کو اپنی دموں کے کوڑوں پر دھر لیا۔ پھر تو دونوں فریقوں میں ایسی خوفناک جنگ ہوئی کہ دیکھتے ہی دیکھتے کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ ہر طرف خون ہی خون اور حریف بندروں کی لاشیں ہی لاشیں بکھر گئیں۔ یہ میدان کارزار کوئی آدھ گھنٹے تک گرم رہا۔ اس کے بعد کالے بندروں کی فوج پسپا ہونے لگی۔ غالباً ان کا سردار مارا گیا تھا۔ فتح یاب سرخ بندر اپنے شکست خوردہ حریفوں کے تعاقب میں چیختے چلاتے بھاگ گئے۔ تھوڑی دیر میں وہاں خاموشی کے سوا کچھ نہ تھا۔ ہم دم بخود اپنی اپنی جگہ سہمے ہوئے کھڑے یا بیٹھے تھے۔

''خدا کی پناہ..... کیسا خوفناک تماشا تھا!'' جان کلاز نے کہا اور غار کے فرش پر لمبا لمبا لیٹ گیا۔ فرینڈیز بری طرح کراہ رہا تھا۔ بندر نے اس کی دائیں کلائی ادھیڑ ڈالی تھی۔ بڑی مشکل سے خون روکا گیا۔ گرم گرم راکھ زخم میں بھر کر پٹی باندھی گئی۔ اب ہمارے خود ساختہ ''ہسپتال'' میں دو مریض جمع ہو چکے تھے۔

پانچ دن اور پانچ راتیں اس غار میں امن چین سے گزریں۔ چھٹی رات آسمان پر یکا یک بادل گرجا' بجلی کڑکی اور موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ جنگل کی بارش دیکھنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ ہم سب غار میں ایک دوسرے کے بدن سے بدن ملائے خاموش بیٹھے تمباکو پی رہے تھے۔ سردی لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جا رہی تھی اور میں نے جان کلاز اور ماترو کے دانت بجنے کی آواز بھی اندھیرے میں سنی' خشک لکڑیاں سب ہماری حماقت کے باعث بھیگ چکی تھیں۔ اگر ہم لکڑیوں کے اس ڈھیر کو پہلے سے غار کے اندر رکھ لیتے تو اس آفت کا سامنا نہ کرنا پڑتا' بے اختیار جی چاہتا تھا۔ آگ جلے' جسم گرم ہوں۔ پھر بھاپ اٹھتے ہوئے قہوے کا تصور اور بھی قیامت خیز تھا مگر صبر کے سوا چارہ ہی کیا تھا؟ مجھے ڈیگا کا خیال آیا۔ خدا جانے وہ کس حال میں ہوگا۔ پھر جولو کی یاد آئی نہ جانے فرار ہو کر اس پر کیا بیتی ہوگی۔

بارش ایک رفتار سے کئی گھنٹے ہوتی رہی۔ میرا اندازہ تھا ندی اب تک سمندر میں بدل چکی ہوگی اور واقعی صبح جب ہلکی ہلکی پھوار میں باہر نکل کر ندی کی جانب نگاہ اٹھائی تو وہاں ٹھاٹھیں مارتا ہوا ایک دریا تھا جس کے دوسرے کنارے کا پتہ نہ چلتا تھا۔ وہ کئی روز ہم نے غار کے اندر ہی کاٹے' باہر جانے کے لیے کشتی کی ضرورت تھی۔ اب احساس ہوا کہ ہم پہاڑ کے اس نشیبی حصے میں گھرے ہوئے ہیں جہاں مہینوں تک اس پانی کے اترنے یا زمین میں جذب ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ انسان خواہ کہیں چلا جائے قفس سے اس کی رہائی محال ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ ہماری توقع کے خلاف پانی تین دن میں اتر گیا تاہم جنگل میں کیچڑ اور دلدل کی ایک خطرناک دنیا آباد ہو گئی۔ لمبے لمبے کیچوے' چوہے' مینڈک' سانپ' چھپکلیاں اور نہ جانے کون کون سے حشرات الارض اپنے کونوں کھدروں سے نکل آئے اور ہر طرف سرسرانے لگے۔ اب ہمیں ان سے ڈر نہ لگتا تھا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

دسویں روز میں نے جان کلاز اور فرینڈیز کو غار کے اندر ہی رہنے کی ہدایت کی اور ماترو کو ساتھ لے کر باہر نکلا۔ میرے پاس رائفل تھی اور اس کے پاس چاقو' ہم ایک ایک قدم پھونک پھونک کر دھرتے ہوئے آگے بڑھے۔ کوئی ڈیڑھ فرلانگ دور شمال کی جانب چلے تھے کہ ایک پرندے کی چیخوں نے ہمیں ٹھٹک کر رک جانے پر مجبور کر دیا۔ ہم جلدی سے جھاڑیوں کی آڑ میں ہو گئے۔ ہماری نظروں کے سامنے ایک اور ندی پانی سے لبالب بھری ہوئی تھی اور اس کے پرلے کنارے پر بہت بڑی سفید بطخ لمبی لمبی گھاس میں پھنسی ہوئی آزاد ہونے کی کوششوں میں ناکام ہو کر پر پھڑ پھڑاتی اور چلاتی تھی۔ بطخ کو دیکھ کر ہم دونوں کے منہ میں پانی بھر آیا اور یہ سوچ کر طبیعت مزے لینے لگی کہ اس کا روسٹ کیا ہوا گوشت کتنا لذیذ ہوگا۔

ہم دونوں ایک لمبا چکر کاٹ کر دوسرے کنارے تک پہنچے اور بڑی مشکل سے بطخ کو گھاس کے شکنجے سے نکال کر قبضے میں کیا۔ نہایت طاقت ور اور خوبصورت بطخ تھی۔ کئی مرتبہ اس نے جوش اضطراب میں اپنی چپٹی چونچ میرے منہ پر ماری۔ ہاتھ آنے کے بعد اس نے اتنا شور مچایا کہ میں چاقو سے وہیں اس کی گردن کاٹ ڈالنے پر مجبور ہو گیا۔ میرا اندازہ تھا اس کا وزن کم از کم چودہ پندرہ پونڈ ہوگا۔ غار میں آ کر ہم نے آگ سلگائی اور جب اسے سینکنے بیٹھے تو یہ دیکھ کر ہم سب خوفزدہ ہو گئے کہ بطخ کے ایک پاؤں میں لوہے کا ایک ایسا چھلا پھنسا ہوا ہے جو بعض شکاری ایسے جانوروں کو زندہ پکڑنے کے لیے جنگل میں جا بجا ندی اور چشموں کے کنارے گھاس میں لگا دیا کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ شکاری نے اس مقام پر گھاس میں اپنا پھندا لگا رکھا تھا جہاں سے ہم اس بطخ کو اٹھا لائے تھے۔ یقیناً اس شکاری نے ہم کو دیکھا بھی ہوگا اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے ہمیں اس غار کے اندر چھپے ہوئے دیکھ بھی لیا ہو۔ ان پریشان کن خیالات کے ذہن پر سوار ہوتے ہی ہم بطخ کے گوشت کا سارا مزہ بھول گئے۔

''میرا خیال ہے پیپلن' ہمیں یہاں ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھنا چاہیے۔''

فرینڈیز نے رائفل میں کارتوس بھرتے ہوئے کہا۔ ''ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ہمیں اس نامعلوم شکاری کو تلاش کرنا ہے پھر دیکھیں گے وہ ہمیں نقصان پہنچانے پر قادر ہے یا نہیں؟''

جان کلاز نے تائید کی۔ ماترو حسب عادت کبھی میری طرف دیکھتا' کبھی دوسروں کی

طرف' بطخ وہی بھون رہا تھا۔ اس نے لپک کر اپنا چاقو اٹھایا۔ ادھ بھنی بطخ اتار کر جان کلاز کے پہلو میں ڈال دی۔ گویا وہ بھی اس مہم میں ہمارا ساتھ دینے کے لیے تیار تھا لیکن میں نے اسے روکا اور کہا: ''یہیں رکو اور غار سے ہرگز باہر نہ نکلنا۔''

میں نے فرینڈیز کی معیت میں جنگل کا ایک ایک گوشہ چھان مارا لیکن جانوروں' حشرات الارض اور پرندوں کے سوا ہمیں انسانی جسم اور خدوخال کا کوئی حیوان نظر نہ آیا البتہ ایسے آثار بیشتر جگہوں پر ملے جن سے ثابت ہو گیا کہ کوئی نہ کوئی شخص اس جنگل میں آتا جاتا ضرور ہے۔ جس مقام پر ہم نے بطخ پکڑی تھی وہیں معمولی سی جستجو اور تگ و دو کے بعد ہمیں پھندے کا دوسرا ساز و سامان بھی مل گیا۔ نصف فرلانگ دور لوہے کا ایک پنجرہ بھی ملا جو غالباً کسی جانور کو زندہ پکڑنے کے لیے لگایا گیا تھا۔ ہم نے پنجرہ وہیں رہنے دیا اور اسے ہاتھ نہ لگایا۔ فرینڈیز کی رائے تھی ہمیں وہیں چھپ کر اس شکاری کا انتظار کرنا چاہیے۔ یہی ایک صورت اس سے ملاقات کی ہے مگر سوال یہ تھا نہ جانے وہ کب آئے یا نہ آئے؟ آخر ہم کب تک اس کا انتظار کر سکتے ہیں؟ تاہم میں نے فرینڈیز کی بات مان لی اور ہم دونوں قریب ہی ایک درخت پر چڑھ گئے اور اپنے آپ کو شاخوں اور پتوں میں اچھی طرح چھپا لیا۔

دو گھنٹے درخت پر دم سادھے بیٹھے رہے' اس دوران میں پتا بھی کھڑکا تو ہم چوکنے ہو گئے مگر بندروں' گلہریوں یا لمبی لمبی چھپکلیوں کے سوا وہاں کوئی نظر نہ آیا تنگ آ کر ہم اپنی ''مچان'' سے اترے اور غار کی جانب چل دیئے۔ ادھر جان کلاز اور ماترو بے چینی سے ہمارے منتظر تھے۔ جونہی انہوں نے ہمیں دیکھا ان کی جان میں جان آئی۔ بھوک سے برا حال تھا اس لیے وہی بطخ دوبارہ ماترو نے آگ پر رکھ دی۔ اگرچہ ہم آپس میں ہنسنے بولنے کا شغل جاری رکھے ہوئے تھے لیکن حقیقت یہ ہے میرا خیال برابر اس نادیدہ شکاری کی طرف لگا رہا جس کا پھانسا ہوا شکار ہم اچک لائے تھے۔

بطخ کا گوشت ہم نے مزے لے لے کر کھایا۔ پھر الاؤ روشن کیا اور پہرے تقسیم کیے۔ اول شب میرے حصے میں آئی۔ تینوں ساتھی اطمینان سے سو گئے۔ میں رائفل ہاتھ میں لیے دہانے کے باہر آن بیٹھا اور بھڑکتے ہوئے شعلوں پر نظریں جما دیں۔ تھوڑی دیر بعد مجھے یوں لگا جیسے کئی سوئیاں میرے جسم کے اندر اتر گئی ہوں۔ میں نے دیوانوں کی طرح اپنی پھٹی ہوئی قمیض اتاری۔ کیا دیکھتا ہوں پون انچ لمبی سیاہ رنگ کی تین چیونٹیاں میرے دائیں

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

شانے میں کھال کے اندر پیوست ہیں۔ بڑی مشکل سے ان چیونٹیوں کے سر نوچ نوچ کر الگ کیا۔ خدا کی پناہ! یہ کیا بلا تھی؟ اب جو مڑ کر اپنے اردگرد کی زمین کا جائزہ لیا تو روح فنا ہوگئی۔ لاکھوں کی تعداد میں یہ خوں آشام چیونٹیاں غار کی طرف بڑھی آ رہی تھیں۔ غالباً انہوں نے بھنے ہوئے گوشت کی بو پالی تھی یا کوئی اور وجہ تھی۔ میں نے الاؤ میں سے جلتی ہوئی لکڑی نکالی اور چیونٹیوں کے لشکر کی طرف بڑھا دی۔ جونہی آگ کی حدت اس موذی کیڑے نے محسوس کی اس نے راہ فرار اختیار کرنے ہی میں عافیت جانی۔ چند منٹ بعد وہاں چیونٹیوں کی جلی ہوئی بے شمار لاشوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ اب مجھے تجسس ہوا کہ یہ چیونٹیاں اتنی بڑی تعداد میں کدھر سے آئی ہیں۔ چٹان کا جائزہ لینے کے بعد یہ راز کھل گیا۔ وہ ایک باریک سوراخ کے اندر سے نکل رہی تھیں۔ بلا مبالغہ ہر ایک چیونٹی کی لمبائی پون انچ سے لے ایک انچ تک تھی۔ ان کی چھ ٹانگیں اور ہر ٹانگ آدھا انچ سے ذرا کم ہی لمبی ہوگی۔ پھر مجھے اردگرد اور بہت سے سوراخ دکھائی دیئے۔ ان میں سے بھی چیونٹیاں نکل رہی تھیں اور دلچسپ بات یہ تھی کہ باقاعدگی کے ساتھ ہر چیونٹی دوسری چیونٹی کے پیچھے چلتی تھی اور ان کی ایک طویل متحرک قطار سی بن جاتی تھی۔ میں نے غور سے انہیں دیکھا' بعض چیونٹیوں کے سر اور آنکھوں کے قریب کثرت سے ننھے ننھے روئیں سے اگے تھے۔ بعض کا رنگ بالکل سیاہ بعض کا بھورا اور اکا دکا سفید۔ یہ بھی دیکھا کہ سفید چیونٹیاں ''ٹریفک پولیس'' کے فرائض انجام دے رہی ہیں۔ اگر کوئی سیاہ چیونٹی قطار سے نکلنے کی حماقت کرتی تو سفید چیونٹیاں فوراً اسے گرفتار کر کے اس کا سر قلم کر دیتیں۔ گویا ان چیونٹیوں کی دنیا میں اس ذرا سی بدنظمی کی سزا بھی موت تھی۔

میں خاصی دیر تک اس حیرت انگیز مخلوق کی یہ کارروائی دیکھتا رہا اور اس تماشے میں اس قدر محو ہوا کہ وقت گزرنے کا احساس تک نہ رہا۔ دفعتہً ایک انسانی آواز میرے قریب ہی سے گونجی۔ میں دہشت سے اچھل پڑا اور خود بخود میری انگلی رائفل کے ٹریگر پر جم گئی۔

''جہاں کھڑے ہو وہیں رہو۔ ذرا سی حرکت بھی تمہارے لیے موت کا بہانہ بن سکتی ہے۔'' نادیدہ انسان نے کہا۔

میں دم بخود کھڑا رہا۔ دل کی دھڑکن ہر لحظہ بڑھ رہی تھی جیسے سینے میں لوہار کی دھونکنی چل رہی ہو۔ چند لمحے خاموشی رہی پھر وہ آواز آئی:

''اب اپنا منہ دوسری طرف کر لو۔''

میں آہستہ سے ایڑیوں پر گھوم گیا۔ گوشہ چشم سے دیکھا کہ چٹان پر ایک شخص نیم برہنہ کھڑا ہے۔ کچھ اندھیرے اور کچھ آگ کی روشنی میں اس کا جسم پراسرار اور ڈراؤنے ہیولے کی مانند نظر آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں دونالی بندوق تھی جس کا منہ میری طرف تھا۔ اس کی آنکھیں مشعل کی طرح روشن تھیں۔ ان چند ثانیوں میں جو ایک صدی بن کر میرے سر پر سے گزر گئے میں نے اس شخص کا جائزہ لے لیا۔ وہ نہایت مضبوط قد کاٹھ کا ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ اس کے آدھے جسم پر کوئی لباس نہ تھا اور نچلے دھڑ پر موٹے کپڑے کی پتلون جس کی پیٹی میں ایک لمبا خنجر اڑسا ہوا تھا۔

''تمہارے ہاتھ میں جو رائفل ہے اسے ایک طرف پھینک دو۔'' اس نے غراتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا' بخدا اگر وہ دو ایک سیکنڈ کے لیے بھی غافل ہوتا تو میں اس کی کھوپڑی اڑا چکا ہوتا لیکن معلوم ہوتا تھا وہ بھی خاصا منجھا ہوا اور بے حد تجربہ کار آدمی ہے۔ اس کے شستہ فرانسیسی لہجے سے اندازہ ہوا کہ اس کا تعلق بھی اسی ملک سے ہے جہاں سے مجھے بھیجا گیا ہے۔ میں نے رائفل نیچے گرانے میں کچھ پس و پیش کیا ہی تھا کہ اس کی بندوق نے شعلہ اگلا اور گولی سن سے میرے دائیں کان کی لو چھوتی ہوئی نکل گئی۔ میں نے گرم گرم خون کی دھار اپنی گردن پر گرتی ہوئی محسوس کی۔

''تم نے سنا نہیں میں کیا کہتا ہوں؟ اپنی رائفل نیچے پھینک دو اور ہاتھ اوپر اٹھا لو۔''

میں نے اس مرتبہ اس کے حکم کی تعمیل کی۔ معلوم ہوگیا مقابلہ بڑے بے ڈھب اور سنگ دل حریف سے ہے جو ذرا بھی چوکنے کا قائل نہیں اور نہ اپنے دشمن کو سوچنے سمجھنے کا کوئی موقع دینا چاہتا ہے۔

''تم اکیلے ہو یا تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟'' اس نے پوچھا اس مرتبہ لہجہ ذرا نرم تھا۔

''میرے ساتھ تین آدمی اور ہیں۔''

''خوب..... انہیں آواز دے کر بلاؤ۔''

''ایسا کرنا تمہارے حق میں بہتر نہ ہوگا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اول تو میری آواز ان کے کانوں تک نہ پہنچے گی' وہ یہاں سے دور ہیں۔'' یہ میں نے دانستہ جھوٹ بولا: ''اس وقت

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

گہری نیند کے مزے لوٹ رہے ہیں' دوسرے یہ کہ ان میں سے دو کے پاس نہایت طاقت ور رائفلیں ہیں اور ان کا نشانہ بھی بہت عمدہ ہے۔"

"ہوں.....ہوں....." اس نے سوچنے کے انداز میں کہا "خبردار' تم اس جگہ سے جنبش نہ کرنا۔ نشانہ میرا بھی کچھ ایسا برا نہیں۔ ابھی تم ہلکا سا مشاہدہ کر بھی چکے ہو۔ کیا تم وہی لوگ ہو جو سینٹ مارٹن کیمپ سے پہرے داروں کو جل دے کر بھاگے ہو؟"

"بے شک!"

"خوب.....خوب" اس مرتبہ اس کے لہجے سے تعریف جھلک رہی تھی۔ تم میں سے پیپلن کون ہے؟"

"میں ہوں۔"

"آہا.....تم نے تو غضب ڈھا دیا موسیو پیپلن۔" اس نے ہنس کر کہا "مجھے ایسے جی داروں سے مل کر ہمیشہ خوشی ہوتی ہے۔ سینٹ مارٹن سے تمہارے فرار ہونے کے بعد وہاں جو کچھ ہوا اس سے شاید تم لاعلم ہو۔ جو خبریں مجھ تک پہنچی ہیں وہ بہت خوفناک ہیں۔"

"مثلاً وہ کیا خبریں ہیں؟" میں نے پوچھا۔ اب میرا خوف کسی حد تک دور ہو چکا تھا اور میں سمجھ رہا تھا یہ شخص بھی کوئی مفرور مجرم ہے۔ اتنے میں وہ دو تین چھلانگیں لگا کر نیچے آ چکا تھا۔ بالکل کسی مکار چیتے کی مانند.....لیکن کیا مجال کہ اس کی بندوق ایک ثانیے کے لیے میرے سینے کے سامنے سے ہٹی ہو۔ میرے نزدیک آ کر وہ چپ چاپ مجھے گھورتا رہا پھر بھاری آواز میں بولا:

پیپلن! غالباً تم نے کبھی میرا نام سنا ہوگا؟ مجھے میکس برٹین کہتے ہیں۔" پل بھر میں میرا حافظہ جگمگا اٹھا میکس برٹین.....فرانس کا نامور ڈاکو.....قاتل.....چور.....اسمگلر.....اور نہ جانے کیا کیا مجرموں کی۔ ایک بڑی تنظیم کا سربراہ۔

"میکس برٹین! تمہیں کون نہیں جانتا؟ سارے یورپ میں شیطان کی طرح مشہور ہو۔" میں نے کہا۔ یہ سن کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے کہا:

"میں نے بھی تمہارے بارے میں بہت کچھ سنا ہے پیپلن" یکایک اس نے بندوق اپنے کندھے پر ڈال لی اور دایاں ہاتھ مصافحے کے لیے میری طرف بڑھا دیا۔ ہم دونوں نے گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور ایک عجیب اطمینان قلب مجھے حاصل ہونے لگا۔" شاید اس

لیے کہ ایک بہادر اور طاقت ور شخص کی رفاقت ہمیں حاصل ہو رہی تھی۔ تاہم ابھی سے خوش فہمیوں کے جال بننا کوئی اچھی بات نہ تھی۔ مجھے وقت کا انتظار کرنا چاہیے۔

"وہ بطخ کہاں ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہمارے پیٹوں میں اتر گئی۔"

"چلو ٹھیک ہے: ورنہ مجھے تمہاری ضیافت کے لیے ایک اور بطخ تلاش کرنا پڑتی۔ اسے بھی میں نے دو دن کی محنت کے بعد قابو میں کیا تھا۔"

"مجھے افسوس ہے میکس' ہم نے تمہارا شکار چوری کیا۔" میں نے کہا۔

"اچھا چھوڑو یہ ذکر۔ بولو' قہوہ پیو گے؟" اس نے بائیں شانے پر لٹکا ہوا چھوٹا سا تھرماس اتارتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں نہیں؟ نیکی اور پوچھ پوچھ۔"

چند لمحوں کے اندر اندر ہم یوں گھل مل کر باتیں کر رہے تھے جیسے پرانے دوست ہوں اور ایک دوسرے پر جان چھڑکنے والے۔

"ارے یار! معاف کرنا' میں نے تمہیں اپنے ساتھیوں سے اب تک ملایا ہی نہیں۔ باتوں میں کچھ یاد ہی نہ رہا۔"

میں اسے غار کی طرف لے گیا۔ ہمارے قدموں کی آہٹ پاتے ہی فرینڈیز نے للکار کر کہا: "کون ہے؟" میں نے اطمینان دلایا کوئی غیر نہیں اپنا ہی آدمی ہے۔ اس نے سب سے مصافحہ کیا۔ پھر ہماری رائفلوں کا معائنہ کرنے لگا۔ اس کا چہرہ یک لخت از حد سنجیدہ ہو گیا۔ ہم سب خاموشی سے اس کی صورت دیکھ رہے تھے۔ معاً اس نے کہا:

"یارو' تم وہاں سے نکل آئے۔ بہت اچھا ہوا لیکن اب یہ دعا کرو کہ حبشی اور دونوں پہرے دار بچ جائیں جنہیں تم شدید زخمی کر چکے ہو۔ اگر ان میں سے کوئی مر گیا اور تم دوبارہ خدانخواستہ گرفتار ہو گئے تو موت یقینی ہے.....یوں بھی سینٹ مارٹن کے فوجی قانون کے مطابق کسی قیدی کے اسلحہ لے کر فرار ہو جانے کے معنی موت کے پروانے پر دستخط کر دینے کے ہیں۔ بہرحال.....گھبراؤ نہیں' میں بہادر لوگوں کی قدر کرتا ہوں' تم نے میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے' میں اسے مضبوطی سے تھاموں گا' جہاں تک ممکن ہے میں تمہاری مدد و حفاظت کے لیے تیار ہوں۔"

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ہم سب نے اس کا شکریہ ادا کیا اور چونکہ اب نیندیں غائب ہو چکی تھیں اس لیے ہم نے میکس سے اپنے حالات بیان کرنے کی درخواست کی۔

''میرا شمار ''آزاد قیدیوں'' میں ہے۔'' اس نے کہنا شروع کیا'' میں اپنی سزا بھگت چکا ہوں۔ کل بیس برس کی ہوئی تھی اور چونکہ اس تمام عرصے میں میرا چال چلن اچھا رہا اس لیے سزا میں پانچ برس کی تخفیف ہوگئی۔ میں چاہتا تو اپنے وطن واپس جا سکتا تھا لیکن وہاں جا کر کیا کرتا؟ وہی چوری..... ڈکیتی..... قتل' اب تم دیکھ لو' میں گزشتہ پانچ برس سے اس جنگل میں ہوں اور مزے کر رہا ہوں' کوئی غم اور کوئی فکر لاحق نہیں۔

اس جنگل سے کوئی پانچ میل کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ میری طرح وہاں اور بہت سے آزاد ''قیدی'' رہتے ہیں اور مختلف پیشوں کے ذریعے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ مقامی باشندے ہم میں خوب گھل مل گئے ہیں۔ ہماری ہر ضرورت پوری ہو جاتی ہے۔ میرا واحد مشغلہ اس جنگل میں آ کر پرندوں اور جانوروں کو زندہ پکڑنا اور حکام کے ہاتھ اچھی قیمت پر فروخت کر دینا ہے جو بلخ تم لوگوں نے چٹ کر ڈالی' وہ ڈھائی سو فرانک میں آسانی سے بک جاتی۔ اس کے علاوہ میں سانپ' بڑے بچھو' مکڑیاں' چھپکلیاں' بندر اور اسی طرح کے دوسرے جانور بھی پکڑتا ہوں۔ دنیا بھر کے چڑیا گھروں میں ایسے نادر و نایاب جانوروں کی بڑی مانگ ہے۔ اب تک میں ڈیڑھ لاکھ کے قریب فرانک جمع کر چکا ہوں۔ اس جنگل پر میری اجارہ داری ہے۔ یہاں میری اجازت کے بغیر نہ کوئی آ سکتا ہے نہ رہ سکتا ہے۔''

''آپ جیسس کو تو ضرور جانتے ہوں گے' اسی نے ہمیں یہاں تک پہنچایا ہے اور اس خدمت کے عوض اس نے ہم سے ڈھائی ہزار فرانک وصول کیے۔'' میں نے کہا۔

''میں اس بدمعاش کو خوب جانتا ہوں۔ وہ بہت بڑا ٹھگ ہے۔ اس نے بہت سے فرار ہونے والوں کو ناکارہ کشتیاں اور ناکافی سامان دے کر سمندروں میں غرق کرایا اور مچھلیوں کی غذا بنا دیا ہے۔ اب وہ یہاں آئے تو تم اسے جانے نہ دینا' میں اس کی ایک آدھ ہڈی پسلی چٹخانا چاہتا ہوں۔ پچھلے برس اس نے چار پانچ نوجوان قیدیوں سے کوئی پانچ ہزار فرانک کی رقم ہتھیا لی اور انہیں ایک ایسی کشتی میں بٹھا کر سمندر میں دھکیل دیا جس کا پیندا بہت کمزور تھا۔ سمندر کی لہروں نے اس کشتی کو کھیل کھیل کر دیا' چار آدمی غرق ہو گئے' ایک بدنصیب کی لاش بہتے بہتے ساحل پر آ گئی۔ میں ایک روز ساحل کی طرف گیا' تو وہاں ریت پر لاش پڑی پائی جس کے آس پاس چند بڑے بڑے گوشت خور کچھوے رقص کر رہے تھے۔

''وہ کہہ تو گیا تھا کہ واپس آئے گا' لیکن اب تو شاید اسے یاد بھی نہ رہا ہو۔''

''بہرحال' کبھی نہ کبھی تو میرے ہتھے چڑھے گا۔ ابتدا میں اس نے مجھ سے بھی ایک ہزار فرانک اینٹھ لیے تھے۔ خیر لعنت بھیجو جیسس پر' اپنی فکر کرو۔ اب تمہارے پاس کتنی رقم ہے؟''

''ہوں گے کوئی دو تین ہزار فرانک۔''

''بہت خوب..... یہ رقم مناسب ہے۔ ضرورت پڑی' تو میں تمہیں اپنے پاس سے اور رقم دے دوں گا۔ اگر وہ نامراد جیسس آ بھی جائے تو تم اس کے جھانسے میں بالکل نہ آنا اور ہرگز ہرگز اسے کچھ اور نہ دینا۔ میں تمہارے پاس روز نہیں آ سکتا۔ تمہاری تلاش میں فوجی حکام زمین آسمان ایک کر رہے ہوں گے اور ہر طرف ان کے آدمی تازی کتوں کی مانند تمہاری بو سونگھتے پھر رہے ہوں گے۔ تم نے پناہ لینے کے لیے یہ اچھا مقام چنا ہے' مگر اتنی احتیاط کرو کہ یہاں آگ ہرگز نہ جلاؤ اور نہ جنگل میں زیادہ گھومو پھرو۔ میں کل تمہارے لیے گرم کپڑے لے کر آؤں گا اور ضرورت کی کچھ چیزیں بھی۔ اب تم اپنے آپ کو اس غار کے اندر کم از کم دو ہفتوں کے لیے بالکل بند کر لو۔ میرا اندازہ ہے ان کے مسلح آدمی اس جنگل کا رخ بھی کریں گے۔ یہ ابھی اچھا ہوا گاؤں کے کسی اور شخص نے تمہیں نہیں دیکھا' ورنہ بہت برا ہوتا۔ تم مجھ پر اعتماد رکھو' میں دھوکا نہیں دوں گا۔ اگر مجھ پر کوئی آفت آ پڑی اور میں نہ آیا' تو مضطرب نہ ہونا۔ میں اپنے کسی معتمد کے ذریعے ساحل پر تمہارے لیے ایک عمدہ کشتی کا انتظام کرا دوں گا اور تم اس شخص کے ساتھ اس کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے سمندر میں سفر کرنا۔ گاؤں میں داخل ہونے کی حماقت تم میں سے کوئی نہ کرے' ورنہ فوراً فوجی حکام تک تمہاری خبر پہنچ جائے گی۔ اس جزیرے کے شمال مشرق میں' کوئی پچاس میل کے فاصلے پر ایک جزیرہ ہے جہاں دو اڑھائی سو کوڑھی رہتے ہیں۔ وہاں کوئی نہیں جاتا۔ اس جزیرے پر کوئی پہرے دار ہے نہ گارڈ اور نہ کوئی افسر۔ یہ کوڑھی سب کے سب خطرناک مجرم ہیں' مگر اپنے مرض کے باعث نگرانی سے مستثنیٰ قرار دے دیئے گئے ہیں۔ ہر روز صبح آٹھ بجے موٹر بوٹ اس جزیرے کے ساحل پر آن کر رکتی ہے۔ موٹر بوٹ میں ان کے لیے چوبیس گھنٹے کی خوراک لاد کر لائی جاتی ہے۔ کوڑھیوں کے انچارج بھی کوڑھی ہی ہیں۔ موٹر بوٹ والے جزیرے پر قدم رکھنے سے پرہیز کرتے ہیں اور خوراک کا ذخیرہ کوڑھیوں کے حوالے کر کے فوراً واپس چلے جاتے ہیں۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ان کوڑھیوں میں سے ہر ایک قاتل ہے اور اس حالت کو پہنچنے کے باوجود اپنی بری عادتیں ترک کرنے پر تیار نہیں۔ انہوں نے اردگرد کے جزیروں میں رہنے والے مجرموں سے رابطہ قائم کر رکھا ہے۔ ڈچ گیانا' ایلینا' سینٹ جین' سینٹ لارنیٹ غرض جن جن جگہوں پر مجرموں کے کیمپ ہیں' ان سے یہ کوڑھی اپنے اپنے طور پر رابطہ استوار رکھتے ہیں اور فرار ہونے والوں کو بھی خاصی رقم کے عوض خوراک اور دوسرا سامان مہیا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایسے مفرور جنہیں دوبارہ پکڑے جانے کے بعد اپنی جان جانے کا خدشہ ہوتا ہے' انہیں بھی یہ کوڑھی اپنے جزیرے پر کچھ عرصے کے لیے پناہ دے دیتے ہیں۔ اگرچہ انہیں اپنے جزیرے سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں' پھر بھی یہ رات کی تاریکی میں اپنی تیار کردہ کشتیوں پر سوار ہو کر آس پاس کے جزیروں میں چلے جاتے ہیں۔ بعض اوقات گشتی پارٹیاں ان کی کشتیوں پر فائر بھی کھول دیتی ہیں اور کوڑھی مارے بھی جاتے ہیں' اس کے باوجود یہ اپنی سرگرمیوں سے باز نہیں آتے۔ ان لوگوں کو کشتیاں بنانے یا انہیں اپنے پاس رکھنے کی اجازت نہیں اور اگر کوئی کشتی ان کے پاس سے پکڑی جائے' تو سزا میں خوراک کی سپلائی بند کر دی جاتی ہے' اس کی تدبیر انہوں نے یہ نکالی ہے کہ کشتیوں میں بڑے بڑے پتھر بھر کر انہیں ساحل کے قریب ہی غرق کر دیتے ہیں۔ حسب ضرورت غوطہ لگا کر پتھر نکال دیتے ہیں اور کشتیاں پانی کی سطح پر آ جاتی ہیں۔ ان کوڑھیوں میں ہر نسل اور ہر قوم کے افراد شامل ہیں۔

تمہیں بہترین کشتی اپنے مقصد کے لیے انہی سے ملے گی۔ ایسی کشتی جو سمندر کی دیو پیکر لہروں کا آسانی سے مقابلہ کر سکتی ہے۔ آس پاس کے بے شمار جزیروں میں پناہ لیتے ہوئے اور وہاں کے لوگوں کی امداد حاصل کرتے ہوئے آپ جس ملک میں جانا چاہیں' جا سکتے ہیں۔

مسلح گشتی پارٹیوں کا دائرہ عمل ایک سو مربع میل کے علاقے میں ہے' اس کے بعد آپ ہر خدشے اور خطرے سے آزاد ہیں' تاہم سمندر کا سفر کسی بھی وقت مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔ خصوصاً وہ علاقے جہاں شارک مچھلیاں بڑی تعداد میں ہیں۔ انسانی گوشت اور خون ان کے منہ کو لگ چکا ہے' اس لیے یہ اپنے شکار کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہیں۔ عقل مند ہیں وہ مفرور جو ان قاتل مچھلیوں سے محفوظ رہنے کے لیے اپنے ساتھ ہارپون رکھتے ہیں۔ یہ مچھلیاں ہارپون سے خوف کھاتی ہیں اور زیادہ قریب نہیں آتیں' تاہم وہ میلوں تک کشتی کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے تیرتی رہتی ہیں اور موقع پاتے ہی کشتی الٹ دینے کی کوشش کرتی

ہیں' اس لیے کشتی والوں کو دن رات چوکنا رہنا پڑتا ہے۔ بہرحال اگر کوئی حادثہ اس دوران میں پیش نہ آیا' تو میں خود آؤں گا اور تمہارے ساتھ کوڑھیوں کے جزیرے تک سفر کروں گا۔ اس کے بعد باقی کام تمہارا ہے۔ میں ساحل ہی سے خدا حافظ کہہ کر واپس چلا جاؤں گا۔''

''آپ جزیرے پر نہیں اتریں گے؟'' ماترو نے سوال کیا۔

''ارے نہیں بھائی۔'' میکس نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ ''میں کچھ وہمی سا آدمی ہوں اور کوڑھ کا مرض یوں بھی اڑ کر لگتا ہے۔ اس معاملے میں معافی چاہوں گا۔''

''کچھ اندازہ ہے ہم کب تک روانہ ہو سکیں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''غالباً آٹھ دس دن بعد..... اب مجھے خیال آتا ہے ایک نہیں' مجھے دو کشتیوں کا بندوبست کرنا پڑے گا۔ ایک کشتی بہرحال تم لوگوں کے پاس رہنی چاہیے۔ عین ممکن ہے کوڑھی تمہیں فوری طور پر کشتی مہیا نہ کر سکیں اور وہاں زیادہ عرصے تک رہنے سے تمہارا بھی اس بھیانک مرض میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہے' اس لیے تمہیں اس جنگل میں واپس آنا پڑے گا' اس وقت کشتی تمہارے کام آئے گی۔''

ٹھیک آٹھ دن بعد ہم دو کشتیوں..... میں..... سفر کر رہے تھے برٹین تنہا اپنی کشتی میں ہم سے آگے تھا اور ہم دوسری کشتی میں اس کے پیچھے پیچھے۔ آسمان صاف تھا اور لاتعداد روشن ستارے چمک رہے تھے۔ ہم سب خاموش تھے اور سمندر کا پانی پرسکون۔ کبھی کبھی کسی مچھلی کے سطح پر ابھرنے اور غوطہ لگانے سے غڑاپ کی آواز پیدا ہوتی اور پھر خاموشی چھا جاتی۔ رات کے تین بجے ہوں گے کہ میری پلکیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔ میں نے ساتھیوں کو ہوشیاری سے کشتی چلاتے رہنے کی ہدایت کی اور خود ایک گوشے میں گٹھڑی سی بن کر پڑ رہا۔

صبح ہونے میں ابھی خاصی دیر تھی کہ میں بیدار ہو گیا۔ میکس کی کشتی ہم سے کوئی میل بھر آگے ہو گی۔ مشرقی افق پر سنہری لکیر آہستہ آہستہ ابھر رہی تھی۔ پھر اسی جانب ہمیں ایک جزیرے کے دھندلے دھندلے آثار دکھائی دینے لگے۔ جوں جوں ہماری کشتی آگے بڑھ رہی تھی' جزیرے کے خدوخال واضح ہوتے جا رہے تھے۔ پھر سمندری چٹانیں نظر آنے لگیں جن سے ٹکراتی ہوئی لہریں سفید سفید جھاگ کے عظیم انبار ساحل پر لگا رہی تھیں۔ افق کی سنہری لکیر اب سرخ شفق میں بدل گئی اور سمندر کا سرمئی پانی' گلابی رنگ اختیار کرنے لگا۔ یہ

ایک دلفریب اور جلال و جمال سے لبریز منظر تھا۔ ہزاروں آبی پرندے جزیرے کی فضا میں منڈلا رہے تھے۔

چٹانوں کے نزدیک پہنچ کر میکس نے اپنی کشتی ٹھہرا دی۔ تھوڑی دیر بعد ہم بھی وہاں پہنچ گئے۔ یہ چٹانیں خاصی وسیع تھیں اور چمکتی ہوئی سفید ریت پر بے شمار سیپیاں پڑی تھیں۔ میکس نے بڑی پھرتی سے دونوں کشتیاں ایک بڑی چٹان کے عقب میں اس طرح چھپا دیں کہ سمندر سے آنے والوں کو وہ نظر نہ آ سکتی تھیں۔ پھر ہم ایسی جگہ تلاش کرنے لگے جہاں دن بھر آرام کر سکیں۔ جزیرہ ابھی کوئی دس میل دور تھا اور سورج چند لمحوں میں نکلنے ہی والا تھا۔

''اس احتیاط کی ضرورت اس لیے ہے کہ مسلح فوجی سپاہیوں کی کشتیاں کسی بھی وقت سمندر میں نمودار ہو سکتی ہیں۔ مت بھولو وہ لوگ ابھی تک تمہیں سرگرمی سے تلاش کر رہے ہوں گے اور کوڑھیوں کا جزیرہ چونکہ مفروروں کو پناہ دینے کے لیے خاصا بدنام ہے' اس لیے وہ ادھر بھی ضرور آئے ہوں گے۔ اب سورج ڈوبنے کے بعد ہی ہم جزیرے کی طرف بڑھیں گے۔''

میکس کی دور اندیشی قابل داد تھی۔ ہم اس شخص کے اتنے ممنون تھے کہ شکریے کے الفاظ بار بار ہماری زبانوں پر آتے' لیکن ہم انہیں ادا کرنے سے قاصر تھے۔

دن بخیریت گزر گیا۔ سمندر کا سینہ صاف تھا' سپاہیوں کی کوئی کشتی ادھر نہ دیکھی گئی۔ موقع پا کر ہم نے چند مچھلیاں بھی پکڑیں اور بھون کر کھائیں۔

سورج کا سنہری تھال آہستہ آہستہ مغرب کی سیاہ جھیل میں اترنے لگا'..... سمندر کے پُرسکون پانیوں میں یکا یک جوار بھاٹے کی سی کیفیت پیدا ہو گئی' لہریں پہلے اچھلیں' پھر آپس میں دست و گریبان ہو گئیں۔ چٹانوں سے موجیں سر پھوڑتیں' تو ایک ہولناک شور اٹھتا۔ ہزارہا آبی پرندوں کی چیخیں الگ تھیں جن سے کانوں کے پردے پھٹنے لگے۔ ایسے عالم میں میکس نے ہم سے مصافحہ کر کے الوداع کہی۔ اس شخص کی جدائی ہم سب نے بری طرح محسوس کی۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہم جنم جنم کے دوست اور ساتھی رہے ہیں۔ جب وہ رخصتی سلام کر کے اپنی کشتی میں سوار ہوا تو ہماری آنکھوں میں آنسو تھے اور میکس کی پلکیں بھی بھیگی ہوئی تھیں۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

میکس کی کشتی رات کی ہر لحظہ..... بڑھتی ہوئی تاریکی میں تحلیل ہو گئی۔ ہم دیر تک چٹان کے پاس بے حس و حرکت کھڑے سمندر کو گھورتے رہے۔ فضا میں سردی بڑھتی جا رہی تھی اور اندھیرے کی دبیز چادریں ہمارے اردگرد تن رہی تھیں۔ ہاتھ بھر کے فاصلے کی شے بھی دیکھنے سے ہم معذور ہو گئے۔

''میرا خیال ہے' ہمیں جزیرے کی طرف چلنا چاہیے؟'' فرینڈیز نے کہا'' بے شک وقت ضائع کرنا درست نہیں۔'' جان کلازنے تائید کی۔ دس منٹ کے اندر اندر ہم کشتی میں سوار ہو کر لہروں سے جنگ کرتے اور بازوؤں کی پوری قوت سے باری باری چپو چلاتے جزیرے کی طرف بڑھنے لگے۔ سیاہ آسمان پر اکا دکا ستارے کا روشن چہرہ ابھرتا اور ہمیں حیرت سے تکنے لگتا۔ رفتہ رفتہ اتنی روشنی ہو گئی کہ جزیرے کے مٹے مٹے سے آثار دکھائی دینے لگے۔ دس میل کا یہ سفر ہمیں یوں لگنے لگا جیسے کبھی ختم نہ ہو گا۔ جوں جوں ہماری کشتی سمندر کی بپھری ہوئی لہروں پر کھلونے کی مانند اچھلتی' جھکتی' ڈولتی اور ڈگمگاتی جزیرے کی طرف بڑھ رہی تھی' توں توں ہمارے دلوں کی دھڑکن بڑھتی جا رہی تھی۔ رات کی تاریکی میں یہ جزیرہ ایسا ڈراؤنا اور ہیبت ناک نظر آ رہا تھا جیسے ہم بھوتوں کی مملکت میں داخل ہو رہے ہوں۔ ساحل کے ساتھ درختوں کی کئی میل لمبی قطار تھی۔ کوئی نادیدہ قوت کشتی کو گھسیٹے لیے جا رہی تھی۔ جب ہم نے محسوس کیا کشتی خود بخود رواں دواں ہے' تو ہم نے چپو ہاتھ سے رکھ دیئے اور جزیرے کے ساحل پر نگاہیں جما دیں۔

کشتی ساحل پر لگی' تو وہ ستارے جو مشرق سے ابھرے تھے' آسمان کے وسط میں آ گئے۔ رات کا پچھلا پہر اور جزیرے پر ہیبت ناک سناٹا۔ ہم نے گھٹنوں گھٹنوں پانی میں اتر کر کشتی ریت پر دور تک گھسیٹی اور ایک بڑے سے پتھر کی اوٹ میں چھپا کر اسے رسے سے باندھ دیا۔ یہ احتیاط اس لیے تھی کہ سمندر کا پانی کسی بھی وقت وہاں تک پہنچ کر کشتی کو اپنے ساتھ بہا کر لے جا سکتا تھا۔

''میرا خیال ہے تم تینوں یہیں ان درختوں کے آس پاس رکو' میں جزیرے کی سیاحت پر روانہ ہوتا ہوں۔ اگر میں سورج نکلنے تک واپس نہ آیا' تو باہم مشورے سے مناسب راستہ اختیار کر لینا۔''

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

میں نے رائفل کندھے سے لٹکائی' ماترو کا چاقو کوٹ کی جیب میں رکھا اور خدا کا نام لے کر ایک طرف چل پڑا۔ تنہائی کا احساس ہوتے ہی یوں لگا جیسے میرے دائیں بائیں آگے پیچھے پراسرار آوازیں اور پوشیدہ روحیں رقص کر رہی ہوں۔ درخت عجیب عجیب ڈراؤنی شکلیں بنا کر مجھے خوف زدہ کرنے لگے۔ دفعتہً گھاس میں سے کوئی جانور بھیانک آواز میں چلاتا ہوا بھاگا۔ غالباً گیدڑ کی نسل سے تھا۔ ایک لمحے کے لیے میرا خون رگوں میں جم گیا اور پاؤں من من بھر کے ہو گئے۔ میں نے دوسری جیب سے بوتل نکال کر چند گھونٹ پیئے' جان میں جان آئی اور آگے بڑھا۔ ٹھوکریں کھاتا اور کئی جگہ منہ کے بل گرتا اٹھتا' جھاڑیوں اور گھاس سے لڑتا بھڑتا کھلے میدان میں پہنچ گیا۔

ایک سوکھے درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر میں نے جیب سے سگریٹ نکالا' لائٹر سے سلگایا اور اطمینان سے کش لگا کر غور کرنے لگا مجھے کتنی دور اور آگے جانا پڑے گا۔ مشکل سے تین چار کش ہی لگائے ہوں گے کہ کچھ فاصلے پر دو آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز کان میں آئی۔ میں نے فوراً سگریٹ گھاس میں پھینک دیا۔

''کون ہے ادھر؟'' ایک آواز فضا میں گونجی۔

میں خاموش رہا۔

''جلدی بولو ادھر کون ہے' ورنہ ہم برا سلوک کریں گے'' وہی آواز پھر ابھری۔

میں اس مرتبہ بھی خاموش رہا' البتہ لائٹر ایک بار جلا کر بجھا دیا۔ اسی لمحے ایک چھوٹا سا کتا بری طرح بھونکتا ہوا میری طرف آیا۔ میں جیسے بیٹھا تھا' ویسے ہی بیٹھا رہا۔ کتا میرے قریب آن کر رکا اور باری باری میرا دایاں' بایاں جوتا سونگھنے لگا وہ انسانی آواز تیسری مرتبہ گونجی:

''جواب کیوں نہیں دیتے بندہ خدا۔ کون ہو تم؟ کیا تم مارشل ہو؟''

''ایک مفرور قیدی..... جو آپ کے پاس پناہ لینے آیا ہے۔'' میں نے بلند آواز سے کہا۔

''آہ..... مفروری قیدی..... تم آدھی رات کے وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟ کیا کوئی بدمعاشی کرنے کا ارادہ ہے؟ سچ سچ بتاؤ تم ہو کون؟ کدھر سے آئے ہو اور تمہارا یہاں نازل ہونے کا مقصد کیا ہے؟''

''میں صرف آپ لوگوں سے مدد کا طالب ہوں۔'' میں نے کہا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کچھ دیر خاموشی رہی' پھر وہی آواز ابھری:

''مدد کے عوض تم ہمیں کیا دو گے؟''

''جس قدر میری استطاعت ہے' آپ لوگوں کی خدمت سے دریغ نہ ہوگا۔''

''آہاہا..... یہ بات کی ہے یار تم نے کام کی۔'' ایک مکروہ قہقہہ فضا میں بلند ہوا۔ ''اچھا'..... وہیں رکے رہو..... ہم تمہارے پاس آتے ہیں۔ ڈرنا نہیں..... ہم بے ضرر لوگ ہیں۔''

''میں خود بھی بے ضرر ہوں آپ لوگ بلا کھٹکے تشریف لائیے۔'' میں نے جواب دیا۔

''آدمی مہذب معلوم ہوتا ہے۔'' اسی آواز نے کسی اور سے یہ جملہ آہستہ سے کہا' مگر میں نے سن لیا۔ معاً تاریکی کا سینہ چیرتی ہوئی روشنی کی چند کرنیں مجھ تک پہنچیں' یہ تیل سے جلنے والی ایک لالٹین تھی جو آہستہ آہستہ میرے نزدیک آ رہی تھی۔ لالٹین کے ساتھ ساتھ چار انسانی سائے کوئی آواز پیدا کیے بغیر حرکت کر رہے تھے۔ اگر مجھے پہلے سے علم نہ ہوتا کہ یہ انسان ہیں' تو منظر اتنا ہولناک تھا کہ میں دہشت سے دم توڑ دیتا۔ وہ مجھ سے کوئی پانچ فٹ کے فاصلے پر آن کر رُک گئے۔ لالٹین کی مدھم روشنی کے باوجود میں ان کے خدوخال دیکھنے سے قاصر رہا۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کی طرف بڑھا' وہ ایک قدم پیچھے ہٹے' میں اور آگے بڑھا' وہ اور پیچھے ہٹے' آخر ان میں سے ایک نے کہا:

''آگے مت بڑھو دوست..... جہاں ہو' وہیں رُک جاؤ۔''

یہ سن کر میں رُک گیا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ وہ چاروں کے چاروں چپ چاپ کھڑے رہے۔ کسی نے بھی مصافحے کے لیے ہاتھ آگے نہ کیا۔ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا:

''آپ مجھے دوست کہہ کر پکارتے ہیں' لیکن ہاتھ ملانے کے قائل نہیں' یہ کیسی رسم دوستی ہے؟''

''آہ..... یہ بات نہیں دوست.....'' ان میں سے ایک نے کہا'' شاید تم بھول گئے ہم سب کے سب کوڑھی ہیں..... اور یہ مرض ایک سے دوسرے کو لگ سکتا ہے۔'' تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد وہ پھر بولا:

''آؤ دوست' ہمارے ساتھ چلو..... پھر اطمینان سے تمہاری داستان سنیں گے اور سوچیں گے ہم کس حد تک تمہاری مدد کر سکتے ہیں۔''

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

وہ آگے آگے چلے' میں پیچھے پیچھے۔ پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر لکڑی کا ایک بڑا سا کیبن دکھائی دیا جس کے اندر ایک اور لالٹین جل رہی تھی' شیشے کی ایک کھڑکی سے اس لالٹین کی روشنی چھن چھن کر باہر آ رہی تھی۔ کیبن کے اندر ایک لمبی بوسیدہ سی میز اور لکڑی کے چند ٹوٹے پھوٹے اسٹول پڑے تھے۔ ایک جانب الماری رکھی تھی' اس کے قریب ہی چند برتن دھرے تھے۔ کیبن کی فضا میں ایک عجیب ناگوار بدبو پھیلی ہوئی تھی جیسے گندھک جلنے سے آیا کرتی ہے۔

"براہ کرم' اس اسٹول پر بیٹھ جائیے۔" ایک شخص نے اشارہ کیا میں نے تعمیل کی۔ وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر اپنے اپنے اسٹول پر بندروں کی طرح بیٹھ گئے اور میری جانب گھورنے لگے۔ پھر ان میں سے ایک نے کہا:

"آپ کا نام کیا ہے دوست؟"

"مجھے پیپلن کہتے ہیں۔"

آہاہا...... یہ نام تو ہم نے کہیں سنا ہے۔" وہ بیک وقت چلا اٹھے۔ "کیا تم وہی شخص نہیں ہو جو حال ہی میں سینٹ مارٹن سے فرار ہوا ہے؟"

"ہاں' میں وہی ہوں۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"باپ رے باپ......" انہوں نے خوف زدہ ہو کر کہا۔ "ہمیں تمہارے بارے میں سب کچھ معلوم ہو چکا ہے' تمہارے ساتھ تین آدمی اور ہیں اور تم کیمپ سے پہرے داروں کو مار کر اور ان کی رائفلیں چھین کر فرار ہوئے تھے؟ بولو' کیا یہ جھوٹ ہے؟"

"آپ نے بالکل صحیح سنا ہے" میں نے سنجیدہ لہجے میں بے پروائی کا کچھ عنصر شامل کرتے ہوئے کہا۔ "حیران ہوں یہ خبریں آپ تک پہنچیں کیسے؟"

"تمہاری تلاش میں روزانہ فوجی سپاہی آتے ہیں۔" ان میں سے ایک نے کہا۔ "اور انہوں نے ہمیں سختی سے ہدایت کر رکھی ہے کہ جونہی یہ مفرور قیدی اس جزیرے پر قدم رکھیں' فوراً اگلے روز خوراک لانے والی کشتی کے گارڈ کو اطلاع دی جائے۔"

"بہت خوب......" میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "شاید آپ تک یہ خبر بھی پہنچی ہو کہ جن پہرے داروں کو ہم نے مارا تھا' ان کی تین رائفلیں بھی ہمارے پاس ہیں اور کارتوسوں کی بڑی مقدار بھی۔ یہ کارتوس اتنے ہیں کہ یہ جزیرہ تمام کوڑھیوں سے ہمیشہ کے لیے پاک کیا جا سکتا

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ہے۔ خوراک لانے والی کشتی کے آنے میں ابھی خاصی دیر ہے۔ ہم اس وقت سے فائدہ اٹھا کر آپ لوگوں کا قصہ پاک کیے دیتے ہیں۔ اب میں جا رہا ہوں اور اپنے ساتھیوں کو تیار رہنے کی ہدایت کرتا ہوں۔"

"خدا کے لیے رُک جاؤ پیپلن......ہم تو مذاق کر رہے تھے......" وہ گڑگڑانے لگے۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے اپنا لہجہ مزید سنجیدہ بناتے ہوئے غرا کر کہا۔ "جس طرح آپ کو ہماری جانوں سے کھیلنے کا حق ہے' اسی طرح ہمیں بھی یہ حق حاصل ہے۔ ہم تو پہلے ہی اپنے سر ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں اور کئی خون پہلے بھی کر چکے ہیں' چند خون اور سہی۔"

"ارے نہیں جناب......آپ اطمینان رکھیں' ہم ہر طرح آپ کی خدمت کرنے کو حاضر ہیں۔ بھلا ہمیں آپ سے کیا دشمنی؟ ہم بے چارے کوڑھی کسی کو کیا نقصان پہنچا سکتے ہیں؟"

وہ منت خوشامد پر اتر آئے اور قسموں پر قسمیں کھانے لگے کہ ہم کسی کو اطلاع نہ دیں گے۔ میں نے کہا: "بہتر ہے......میں آپ کی قسموں پر اعتبار کرتے ہوئے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جانیں آپ کے حوالے کرتا ہوں۔ اب مناسب یہ ہے ہمارے معاملے کی گفتگو ہو جائے۔ بولئے' آپ لوگ ہمیں کیا مدد بہم پہنچا سکتے ہیں اور اس کا معاوضہ کیا ہو گا؟"

"آہا......مسٹر پیپلن' ذرا صبر سے کام لیجیے۔ معاوضے کا ذکر کر کے ہمیں شرمندہ نہ کیجیے۔ پہلے ہم اپنا تعارف تو آپ سے کرا دیں۔ میرا نام لاشوئی ہے۔ یہ میرے بائیں ہاتھ جو صاحب بیٹھے ہیں۔ ان کا نام اینجل ہے......ان کے قریب والے صاحب کا نام مارکوئیس ہے......اور یہ چوتھے صاحب جین سان ہیں۔ ہم سب اسی کیبن میں رہتے ہیں...... ہمارے ایک ساتھی اور ہیں......شاید وہ ابھی آ جائیں......"

یہ جملہ اس کے منہ ہی میں تھا کہ دروازے سے ایک نہایت پست قامت آدمی اندر آیا اور مجھے دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ "چلے آؤ' یہ اپنے ہی دوست ہیں۔" اس کے ساتھیوں نے اسے بتایا۔ یہ واقعی تین فٹ کا بونا تھا' وہ آن کر چپ چاپ ایک اسٹول پر اچھل کر بیٹھ گیا اور مجھے غور سے تکنے لگا۔ ظالم کی نگاہوں میں کچھ ایسی چمک دمک اور گرمی تھی کہ میں تاب نہ لا سکا اور نظریں جھکاتے ہی بنی۔ ایسا لگا جیسے اس کی نگاہیں نہیں' کوئی برما ہے جو میری کھوپڑی میں سوراخ کرتا چلا جا رہا ہے۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

اتنے میں ان میں سے ایک کوڑھی نے اٹھ کر دوسری لالٹین جلائی اور لا کر میرے قریب ہی رکھ دی۔ شاید اس لیے کہ وہ میرا چہرہ مزید غور سے دیکھنا چاہتے تھے۔ اب کیبن میں روشنی کچھ اور تیز ہو گئی تھی۔ پہلی بار میں نے ان کوڑھیوں کو اچھی طرح دیکھا اور دیکھتے ہی دل آپ ہی آپ بیٹھنے لگا۔ کچھ بیان نہیں کر سکتا میں نے کیا دیکھا۔ میرے سامنے عجیب و غریب ڈراؤنی شکلوں کے آدمی بیٹھے تھے۔ ان کی صورتیں اور خدوخال قدرت نے کوڑھ کے ذریعے اس قدر مسخ کر دیئے تھے کہ نہ وہ پورے آدمی تھے نہ پورے جانور۔ انہیں دیکھ کر پہلے خوف آتا پھر ترس اور آخر میں دل سے یہ دعا نکلتی کہ خدایا انہیں جلد اس کرہ ارض سے اٹھا لے۔

لاشونی صاحب کی ناک آدھی غائب تھی اور نتھنوں کی جگہ ایک بھیانک غار تھا جس میں سے ان کے اوپر کے جبڑے میں جڑے ہوئے زرد زرد دانت جھانک رہے تھے۔ رخساروں کا گوشت جھڑ چکا تھا اور ہڈیاں..... سفید سفید ہڈیاں اپنی نمائش پر تلی ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ نچلے ہونٹ کا دایاں حصہ بھی کوڑھ نے کھا لیا تھا ایک کان تقریباً ندارد۔ بائیں ہاتھ پر پٹی بندھی تھی اور پٹی کے اوپر سے پیپ بہہ بہہ کر ہتھیلی پر آ رہی تھی جسے وہ اپنے قمیض کے دامن سے پونچھ لیتا۔ یہ اس کا دایاں ہاتھ تھا۔ بائیں بازو کے پنجے میں صرف دو انگلیاں باقی رہ گئی تھیں۔ ان دو انگلیوں کی مدد سے اس نے سگار کو اپنے عجیب و غریب منہ میں دبا لیا۔ یہ سگار اس نے غالباً خود ہی بنایا ہوگا' کیونکہ تمباکو کے جن پتوں کو لیا گیا تھا' ان کا رنگ ابھی تک سبز تھا۔ اس کی دائیں آنکھ کی پلک گر چکی تھی اور آنکھ کے کھلے ڈیلے سے لے کر پیشانی کے وسط تک ایک گہرا زخم پھیلا ہوا تھا جس کے اوپر پیپ' خون اور کھرنڈ جما ہوا تھا۔ نہایت مفکرانہ اور مدبرانہ انداز میں سگار کے دو تین گہرے کش لگا کر اس نے راکھ جھاڑی پھر بھاری آواز میں بولا:

''ہم آپ کی اور آپ کے ساتھیوں کی مدد کریں گے موسیو پیپلن' آپ ہم لوگوں کا حال دیکھ ہی رہے ہیں۔ ہم نہیں چاہتے آپ زیادہ عرصے تک یہاں رہیں اور ایسے ہی نہ ہو جائیں جیسے کہ اس وقت ہم لوگ ہیں۔ شاید میری اس موجودہ شکل اور صحت کو دیکھ کر آپ یقین نہ کریں گے کہ میں بھی کچھ آپ کی طرح ایک طرح دار نوجوان تھا۔ میرے بازوؤں میں فولادی قوت تھی اور میرا گھونسا برداشت کرنا ہرکس و ناکس کے بس کی بات نہ تھی۔ پھر ایسا

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ہوا کہ مجھے بے رحم منصفوں نے ایک معمولی سے جرم کے عوض بیگنی کے جہنم زار میں بھیج دیا۔ یہ دس سال پہلے کا ذکر ہے' ان دس برسوں میں مجھ پر جو بیتی اس کا ایک نمونہ آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔''

اس کی یہ بات سن کر میں کانپ اٹھا۔ خدا مجھ پر رحم کرے۔ ایسی حالت سے تو موت ہزار درجے بہتر ہے۔

''کیا آپ لوگوں کے علاج معالجے کی طرف توجہ نہیں دی جاتی؟'' میں نے بڑا ہی احمقانہ سوال کیا۔

''آپ بھی کیا بھولی باتیں کرتے ہیں موسیو۔'' لاشونی نے اپنے مکروہ دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔

''مگر وہ ہمارا اتنا ہی خیال کریں تو اس مہلک جزیرے میں بھیجیں ہی کیوں؟ یہاں کوئی ڈاکٹر ہے نہ کوئی ایسا انتظام جس سے ہمیں مرنے جینے میں سہولت ہو سکے۔ ہاں' یہ ضرور ہے کہ خوراک لانے والے سپاہی کبھی کبھار مختلف دواؤں اور انجکشنوں سے بھرا ہوا ایک بکس دے جاتے ہیں۔ پھر ہم خود ہی اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق اپنا اپنا علاج کرتے رہتے ہیں۔''

ان سب کے چہرے حد درجہ مایوسی اور افسردگی سے لٹک گئے اور موت کے سائے ان کے دائیں بائیں تھرکتے دکھائی دیئے۔ ان بدنصیبوں کی حالت زار پر کون ایسا سنگ دل اور شقی ہوگا جسے رحم نہ آئے۔ میں نے جذبہ ترحم سے مغلوب ہو کر لاشونی کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ تڑپ کر پیچھے ہٹا اور ہانپتے ہوئے بولا:

''نہیں موسیو' ہرگز نہیں۔ خدا کے لیے آپ ہمارے جسموں کو ہاتھ نہ لگائیں کبھی ہمارے ساتھ کھائیں نہ پئیں اور نہ ہماری کوئی چیز چھوئیں۔'' یہ کہہ کر اس نے بونے کو کچھ اشارہ کیا' وہ خاموشی سے بلی کی مانند دبے پاؤں کیبن سے باہر نکل گیا۔

''آپ کا معاملہ ہم ابھی اپنی کونسل میں پیش کریں گے موسیو' لاشونی نے کہا' ''مجھے امید ہے کونسل کے ارکان آپ سے مل کر خوش ہوں گے۔ ہم بہادروں اور جی داروں کی قدر کرتے ہیں۔ کبھی ہم بھی ایسے ہی تھے۔ بے باک' نڈر' مہم جو..... اس جزیرے کا کوئی کوڑھی ایسا نہیں جس نے اپنی زندگی میں کم از کم دو آدمی قتل نہ کیے ہوں شاید ان سب میں میں ہی ایک ایسا مجرم ہوں جس نے ایک آدمی کے قتل کا ارتکاب کیا ہے۔''

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

اتنے میں وہ بونا پھر کیبن میں آیا اور جب وہ بولا' تو یوں لگا جیسے ایک سیٹی سی بجی ہو۔ عجیب لکھنی چیختی ہوئی آواز تھی اس کی:

''موسیو پیپلن کو سنٹر میں طلب کیا جا رہا ہے۔''

یہ سنتے ہی تمام کوڑھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ لاشونی نے مجھے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ ایسے کفن پوش مردوں کی طرح جو اپنی قبروں سے یکا یک نکل پڑے ہوں ہم قطار کی صورت میں آگے پیچھے اس مقام نامعلوم کی جانب روانہ ہوئے جس کا نام ''سنٹر'' رکھا گیا تھا۔ جزیرے کی فضا نہایت سرد تھی اور بڑی ناگوار سی بدبو فضا میں پھیلی ہوئی۔ شاید اسی فضا کا اثر تھا کہ وہاں کوڑھ کی بیماری فروغ پاتی تھی۔ قدم قدم پر جھاڑیاں اور عجیب عجیب شکلوں کے خودرو پودے اگے تھے۔ کہیں کہیں گنجان درختوں کے جھنڈ تھے۔ زمین پتھریلی اونچی نیچی اور حشرات الارض سے پٹی پڑی تھی۔

''یہاں سانپ اور بچھو کثرت سے ہیں۔'' لاشونی نے یکا یک پلٹ کر کہا' لیکن وہ ہمیں کاٹتے نہیں..... ایک مرتبہ ہمارے لیڈر زوساں کو سانپ نے ڈس لیا مگر کیا ہوا؟..... چند منٹ بعد وہ سانپ خود ہی مر گیا۔ جذام کے جراثیم ان سانپوں اور بچھوؤں کے لیے بھی مہلک ہیں۔''

اس کی لرزا دینے والی باتیں سنٹر پہنچنے تک جاری رہیں اور ہر لمحہ مجھے یوں لگا جیسے ابھی کوئی سانپ جھاڑیوں میں سے نکلے گا اور مجھے ڈس کر بھاگ جائے گا۔

پچھلے پہر کا سوگوار' زرد چاند آہستہ آہستہ ایک پہاڑی کے عقب سے جھانکنے لگا اور اس کی پیلی پیلی چاندنی میں ہر درخت' ہر پودا' ہر جھاڑی ایک نیا روپ دھارنے لگی میرا ذہن خوابیدہ سی سمت میں دھنستا جا رہا تھا اور ہوش و حواس رفتہ رفتہ جواب دے رہے تھے۔

''لیجیے سنٹر آ گیا۔'' ایک کوڑھی کی آواز سنائی دی۔ میں نے چونک کر سامنے نگاہ دوڑائی۔ درختوں میں گھری ہوئی ایک دو منزلہ عمارت دکھائی دی۔ جس کی بیرونی کھڑکیوں سے ہلکی ہلکی روشنی جھلک رہی تھی۔ پوری عمارت لکڑی کی تھی اور خاصی بوسیدہ۔ اس کے پیچھے سے چاند کا جھانکنا' پھر بادل کے ایک آوارہ ٹکڑے میں منہ چھپا لینا' چند لمحوں بعد دوبارہ نمودار ہونا' ایک ایسا نظارہ تھا جسے بیان کرنے کے لیے الفاظ کا سہارا نا کافی ہے۔

سنٹر کے باہر بیس کوڑھیوں کی ایک جماعت ہماری منتظر تھی۔ جونہی ہم دروازے کے

پاس پہنچے' انہوں نے ایک طرف ہٹ کر اندر جانے کا راستہ دے دیا۔ میں نے اپنے آپ کو تین فٹ لمبے اور تقریباً بارہ فٹ چوڑے کمرے میں کھڑا پایا جس کے ایک جانب پتھر کا بنا ہوا آتشدان تھا اور اس آتشدان میں بڑے بڑے کندے جل رہے تھے۔ کمرے کی فضا خوب گرم تھی۔ ایک میز پر دو ہری کین لالٹینیں روشن تھیں۔ جا بجا میزیں اور کرسیاں پڑی تھیں۔ ایک بڑی سی میز کے پیچھے' اونچی کرسی پر ایک بہت بوڑھا شخص بیٹھا تھا جس کی پلکیں اور بھنویں تک سفید تھیں۔ اس شخص کے عقب میں ایک لمبی بنچ پر پانچ یا چھ آدمی خاموش بیٹھے تھے۔

''بیٹھ جایئے موسیو پیپلن۔'' بوڑھے کی کانپتی ہوئی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

''میرا نام زوساں ہے اور میں کارسیکا کا باشندہ ہوں۔ میں نے تمہارے بارے میں سب کچھ معلوم کر لیا ہے۔ کیا تمہارے پاس وہ تینوں رائفلیں موجود ہیں جو تم لوگوں نے سینٹ مارٹن کیمپ کے پہریداروں سے چھینی تھیں۔''

''ایک رائفل ہے۔'' میں نے کہا' ''بقیہ دو ہم نے سمندر میں پھینک دیں۔''

''کیا کہتے ہو موسیو' سمندر میں پھینک دیں' بھلا سمندر میں کس مقام پر؟''

''سمندر میں نہیں جناب' میں بھول گیا' معافی چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا: ''ہسپتال کی دیوار کے قریب ہی دریا بہتا ہے نا؟ بس ہم نے دیوار کودنے کے ساتھ ہی دو رائفلیں دریا میں پھینک دیں۔ ایک میں نے احتیاطاً اپنے پاس رکھ لی۔ دیکھ لیجیے' اب بھی حاضر ہے۔

آہ..... اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ رائفلیں وہاں سے نکالی جا سکتی ہیں۔''

''بے شک۔'' میں نے کہا۔ ''اگر اب تک انہوں نے رائفلیں دریا سے نہیں نکالیں تو انہیں تلاش کرنا ممکن ہے۔ میرا خیال ہے وہاں پانی کچھ زیادہ گہرا نہ تھا۔''

''میرا خیال ہے موسیو! آپ غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں۔'' بڈھے نے غرا کر کہا' ''اگر آپ سچ سچ بتا دیں گے تو ہم آپ کو کھا نہیں جائیں گے' خیر آپ کے باقی ساتھی کہاں ہیں؟''

''ساحل پر ایک محفوظ مقام پر چھپے ہوئے۔''

''ہوں..... ہوں.....'' اس نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی۔

''تم ہمارے پاس کس لیے آئے ہو؟ ہم تمہاری کیا مدد کر سکتے ہیں۔''

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

''آپ ہمیں قیمتاً ایک بڑی کشتی اور خوراک کا ذخیرہ مہیا کر دیں۔ اس کے علاوہ سمندر میں طویل سفر کے لیے جن جن چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے وہ بھی ہم آپ سے لیں گے۔''

''بہت خوب۔ اتفاق سے اس وقت ایک بالکل نئی اور بڑی کشتی ہمارے پاس فروخت کے لیے موجود ہے' جو ہمارے ساتھیوں نے گزشتہ ہفتے ایلینا کے علاقے سے چوری کی تھی۔ یہ دراصل کشتی نہیں اسٹیمر ہے' مگر اس کے پیندے میں کوئی خرابی پیدا ہوگئی ہے تاہم آپ فکر نہ کریں' ہمارے آدمی دو گھنٹے کے اندر اندر اسے درست کر دیں گے۔ صاف صاف کہتا ہوں کہ ہم آپ سے اس کے تین ہزار فرانک وصول کریں گے' ایک کوڑی کم نہ ہوگی۔ اگر آپ کے پاس اتنی رقم نہیں' تو پھر دوسرا طریقہ یہ ہے کہ واپس سینٹ مارٹن جایئے' ہسپتال کی دیوار کے قریب جہاں دریا میں آپ نے دو رائفلیں پھینکی ہیں' انہیں تلاش کیجیے' پھر یہاں آیئے' وہ رائفلیں ہمارے حوالے کیجیے اور اسٹیمر آپ کا..... بولیے منظور ہے؟''

''بڑے میاں' ہم آپ کو اسٹیمر کے لیے تین ہزار فرانک ادا کر دیں گے۔''

''آہا..... آپ خاصے مال دار ہیں۔'' اس کے لہجے میں خاصا گہرا طنز تھا۔ ''بس تو طے ہے' اسٹیمر آپ کا ہوگیا۔ اچھا آپ ہمارے مہمان ہیں۔ کہیے آپ کی کیا خاطر تواضع کریں۔ گرم گرم قہوا پئیں گے آپ؟ ہم نے اپنے مہمانوں کے لیے برتن بالکل الگ تھلگ کر رکھے ہیں' ہم میں سے کوئی شخص انہیں ہاتھ بھی نہیں لگاتا۔ دیکھیے اس الماری میں مگ دھرے ہیں' وہیں قہوے کے بیج موجود ہیں' ایک لوہے کی کیتلی بھی آپ کو مل جائے گی۔ شکر کا ڈبہ بھی حاضر ہے۔ آتشدان کی آگ پر اپنے لیے خود قہوہ تیار کر لیجیے۔''

میں نے شکریے کے ساتھ انکار کر دیا۔ واقعہ یہ ہے طبیعت کسی طرح آمادہ ہی نہ ہوتی تھی۔ بہرحال انہوں نے اپنے لیے قہوا تیار کیا اور اپنے اپنے مگ میں ڈال کر چسکیاں لینے لگے۔ کوڑھیوں کے حلیے ایک سے ایک بھیانک اور عبرت انگیز تھے' کہاں تک بیان کروں۔ دفعتہً لاشونی چلایا:

''لیجیے جناب' میرے بائیں ہاتھ کی ایک اور انگلی مگ میں ٹوٹ کر گر گئی۔ اب کھانے پینے کے لیے میں کوئی اور طریقہ ایجاد کروں گا۔ اس نے پیپ سے بھرا ہوا دایاں ہاتھ ڈال کر گلی سڑی انگلی مگ سے باہر نکال کر سب کو دکھائی اور اطمینان سے آتش دان میں پھینک دی۔ پھر ہنس کر مجھ سے کہنے لگا'' معلوم ہوتا ہے میرے جسم کا ایک ایک عضو اسی طرح میرا ساتھ چھوڑتا چلا جائے گا۔''

''اچھا اپنی بکواس بند کرو۔'' بڈھے نے اسے ڈانٹا۔ ''ہمیں موسیو پیپلن سے کام کی بات کرنے دو۔ ہاں تو موسیو' سودا طے پا گیا۔ آپ بے کھٹکے اپنے ساتھیوں کے پاس جائیں' انہیں اسٹیمر ملنے کی خوشخبری سنا دیں۔ ہم آپ کی ضرورت کے مطابق سامان بہم پہنچانے کی پوری کوشش کریں گے۔ آپ کے پاس جو کشتی ہے اس میں بڑے بڑے پتھر بھر کر جتنی جلد ممکن ہو ساحل کے قریب غرق کر دیں۔ اگر فوجی سپاہیوں کی گشت کرنے والی کشتی نے آپ کی کشتی دیکھ لی' تو آپ کے ساتھ ہم بھی مارے جائیں گے۔ ساحل سے کچھ فاصلے پر گھنے جنگل کے اندر ہم نے آپ جیسے مہمانوں کے لیے ایک خفیہ کیبن بنوا رکھا ہے۔ کشتی غرق کرنے کے بعد آپ اس کیبن میں قیام کریں اور ہماری اجازت کے بغیر ہرگز باہر نہ جائیں۔ بہترین خوراک آپ کو دی جائے گی اور جب ہم مطمئن ہو جائیں گے کہ آپ کسی خطرے کے بغیر سمندر میں سفر کر سکتے ہیں' تو ہم آپ کو رخصت کر دیں گے۔''

''بہت بہتر۔ میں آپ کی ہدایات پر عمل کروں گا.....'' یہ کہتے ہوئے میں کھڑا ہوگیا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر میں نے اپنی رائفل شانے سے اتاری' اس کے ٹریگر پر انگلی رکھی اور اپنے لہجے کو جس حد تک خوفناک بنا سکتا تھا' بنا کر کہا:

''آپ حضرات کے تعاون کا شکریہ۔ لیکن یاد رکھیے اگر آپ نے ہم سے کوئی فریب کیا یا دھوکا دیا یا وعدے کے مطابق رقم لے کر اسٹیمر ہمارے حوالے نہ کیا' تو آپ کی جانوں کا بس خدا ہی حافظ۔ اب میں صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ بقیہ دو رائفلیں بھی' کارتوسوں کی بڑی تعداد سمیت میرے ساتھیوں کے قبضے میں ہیں اور یہ کہنا شاید لاحاصل ہوگا کہ ان کے نشانے کبھی خطا نہیں جاتے خدا حافظ۔''

وہ بونا' بوڑھے لیڈر کا اشارہ پا کر میرے آگے آگے چلنے لگا۔ شاید ہمیں اس کیبن کا پتہ بتانے چلا تھا جس میں ہمیں چند روز قیام کرنا تھا۔

✣ ✣ ✱ ✣ ✣

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

.....4.....

رات دھیمی رفتار سے کٹ رہی تھی۔ پچھلے پہر کا زرد اترے ہوئے چہرے کا چاند سفید سفید بے آب آوارہ بادلوں کے ٹکڑوں میں بار بار منہ چھپانے لگا۔ جزیرے پر ہیبت ناک سناٹا طاری تھا جیسے یہ صدیوں سے ویران اور غیر آباد ہو۔ شجر' حجر' سب گویا جذام میں مبتلا تھے۔ زمین حد درجہ مرطوب و دلدلی لیکن وہ بونا میرے آگے یوں دوڑتا جاتا تھا جیسے اسے اس دلدل سے کوئی خطرہ لاحق نہیں۔ اس نے دائیں ہاتھ میں تیل سے جلنے والی قندیل تھام رکھی تھی۔ بایاں ہاتھ غالباً مفلوج تھا یا سوکھا ہوا' میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ بہر حال کچھ نہ کچھ خامی تھی ضرور۔ میں اس کی شکل غور سے دیکھ بھی نہ سکا تھا اور نہ یہ اندازہ تھا کہ اس کی عمر کتنی ہوگی۔ ایک چھلاوے کی مانند وہ اچھلتا' کودتا' دبکتا' مڑتا' بل کھاتا' جھومتا اور مٹکتا نہ جانے مجھے کدھر لیے جا رہا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ میرا سانس پھول چکا تھا مگر اس پر تھکن کا ذرا برابر اثر نہ تھا۔ جب چلتے چلتے ہانپ گیا تو میں نے بونے کو آواز دی۔

''رُک جاؤ یار..... تم آدمی ہو یا خرگوش؟ خدا جانے کہاں لیے جا رہے ہو مجھے۔'' وہ ایک دم یوں رُکا جیسے چلتی گاڑی میں بریک لگ جائے۔ ایک لمحے کے لیے تھم کر اس نے میری طرف دیکھا' پھر دوڑتا ہوا میرے پاس آیا۔

''کیا بات ہے موسیو پیپلن' کیا آپ تھک گئے؟'' اس نے اپنی سیٹی نما آواز میں کہا۔

''ہاں تھک گیا ہوں' کل ساری رات اور سارا دن سفر میں بیت گیا۔ سونے کا ایک لمحہ بھی نہ ملا۔ اب دو گھنٹے سے تم لوگوں کے چکر میں ہوں۔''

''اوہو..... یہ تو بڑی زیادتی ہوئی' آپ کیساتھ موسیو۔'' بونے نے ہمدردی ظاہر کی۔ ''مگر دیکھیے نا' معاملہ بھی کتنا کٹھن ہے۔ جان بچانے کے لیے آدمی کو سبھی کچھ جھیلنا پڑتا ہے۔''

''خیر خیر.....'' میں نے الجھ کر کہا' ''تھوڑی دیر کو مجھے دم لینے دو۔''

یہ کہہ کر میں ایک پتھر کے سہارے بیٹھ گیا۔ بونے نے لالٹین وہیں رکھ دی۔ چند فٹ دور

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ہٹ کے اکڑوں بیٹھ گیا اور میری طرف دیدے گھما گھما کر دیکھنے لگا۔ اب پہلی بار میں نے لالٹین کی مدھم روشنی میں اسے غور سے دیکھا اور دہشت سے میرے بدن کا ایک ایک رونگٹا کھڑا ہو گیا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے انسانی شکل وصورت اور جسم کے بھیس میں یہ کون سی بلا تھی جو میرے پیچھے ساتھ سفر کر رہی تھی۔ اس کی بھنویں اور پلکیں ندارد۔ آنکھیں چوہے کی آنکھوں سے ملتی جلتی اور حد درجہ روشن جیسے دو ننھے منے قمقمے روشن ہوں۔ میں نے ان آنکھوں سے چنگاریاں نکلتے بھی دیکھیں۔ ان بھیانک آنکھوں کو دیکھ کر مجھے چھپکلی نما جانور یاد آیا جسے میں نے میکس برٹین والے جنگل میں دیکھا تھا۔ خدا رحم کرے! کیا ایک موذی رینگنے والے جانور اور ایک انسان کی آنکھوں میں اتنی مشابہت ممکن ہے؟

اس کے چہرے کا رنگ توے کی مانند سیاہ اور کھوپڑی پر بالوں کی جگہ سفید سفید گول اور مثلث نما داغ تھے۔ اس کے دونوں کان غائب اور کانوں کے سوراخوں سے باہر رخساروں اور پھر ٹھوڑی کی جانب جھکتی ہوئی جذام کے زخموں کی گہری لکیریں جن پر پپ اور کھرنڈ جما ہوا۔ ہونٹ حبشیوں کی مانند موٹے موٹے۔ کناروں کے دو دانت نچلے ہونٹوں کو چھوتے نظر آتے۔ ٹھوڑی کے عین درمیان ایک اور گہرا سوراخ جس کے اندر سے نچلے جبڑے کے سفید سفید دانت جھانک رہے تھے۔ اس کا قد تین فٹ سے زائد نہ تھا' ٹانگیں پھپھیوں کی مانند سیدھی اور سوکھی ہوئیں۔ پیٹ گول توند سی نکلی ہوئی۔ اس کے بدن پر کوئی کپڑا نہ تھا۔ صرف ایک معمولی دھجی سے ستر چھپانے کا تکلف کیا گیا تھا۔ تعجب اس بات پر تھا کہ جزیرے کی مرطوب اور حد درجہ سرد فضا میں وہ برہنہ جسم کیونکر چل پھر رہا تھا۔ ادھر میرا یہ حال کہ سردی بدن کے اندر گھسی جاتی تھی۔

دیر تک میرے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا اور نہ اس نے کچھ کہا۔ وہ بار بار گردن گھما کر شمال کی جانب دیکھتا رہا یعنی اس طرف جدھر ہم جا رہے تھے۔

''تمہارا نام کیا ہے اور تم یہاں کب سے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

ایک لرزہ خیز مسکراہٹ اس کے کلیجی کی مانند سیاہ اور موٹے موٹے ہونٹوں پر نمودار ہوئی۔

''موسیو میرا حال کیا پوچھتے ہو' بائیس برس ہوئے جب میں یہاں آیا تھا۔ جنوبی افریقہ کا رہنے والا ہوں۔ بڑا عرصہ مہذب دنیا میں بھی گزارا ہے۔''

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

''تمہاری عمر کیا ہوگی؟''

''آپ خود اندازہ لگائیے۔'' بونے نے ہنستے ہوئے کہا ''پھر میں جواب دوں گا۔''

میں نے اس کے خدوخال اور بدن کو آنکھوں ہی آنکھوں میں تولا اور کہا:

''میرے اندازے کے مطابق تمہاری عمر پچاس برس سے کم نہیں' چونکہ تمہارا قد چھوٹا ہے اس لیے بادی النظر میں تیس برس سے زیادہ کے دکھائی نہیں دیتے۔''

''آپ کا اندازہ خاصا درست ہے موسیو۔'' بونے نے کہا ''میری عمر اس وقت پچپن برس کی ہے اور میرا نام لاپس' میں نے تیس برس کی مجرمانہ زندگی میں کم وبیش پندرہ آدمی قتل کیے۔ بندوق یا پستول سے نا آشنا اور صرف خنجر پھینکنا اور چاقو چلانا جانتا ہوں۔ اس فن میں میرے مدمقابل دنیا میں آج بھی کم ہی آدمی نکلیں گے۔ یہ دیکھیے میں ہتھیار اپنے پاس رکھتا ہوں۔''

اس نے اپنی لنگوٹی بے تکلف کھول ڈالی اور پلک جھپکتے میں اس بوسیدہ اور میلے کپڑے کے اندر سے چھ انچ لمبے پھل کا نہایت پتلا اور انتہائی تیز دھار خنجر برآمد کیا۔ خود بخود میری انگلی اپنی رائفل کے ٹریگر پر جم گئی۔ بونا میری یہ حرکت بھانپ گیا اور ہنس کر بولا:

''ڈریے نہیں موسیو' میں آپ کو نہیں ماروں گا۔ اگر چاہتا تو راستے میں کہیں بھی آپ کو آسانی سے ختم کر دیتا۔ خنجر کی دھار دیکھیے' کیسی تیز ہے کہیے تو اس سے ریشم کاٹ دوں؟ آپ نے سنا ہوگا لوہا لوہے کو کاٹتا ہے۔ بے شک یہ صحیح ہے مگر سچ پوچھیے تو لوہے کو کاٹنا کوئی کمال نہیں' ہاں لوہے سے ریشم جیسی نرم چیز کاٹی جائے تب بات بنتی ہے..... میں اپنے حریف کی گردن یا پیٹ اس صفائی اور تیزی سے کاٹتا ہوں کہ اسے ذرہ برابر تکلیف ہوتی ہے نہ اسے کچھ علم ہوتا ہے۔ کیا حادثہ پیش آیا' بس چند لمحوں بعد اس کے منہ سے خون کی ایک قے برآمد ہوتی ہے اور دوسرے لمحے وہ لمبا لمبا لیٹ جاتا ہے۔''

''تم مجھے ڈرانے کی کوشش نہ کرو بونے میاں۔'' میں نے طیش میں آتے ہوئے کہا۔ ''ممکن ہے تم نے پندرہ بیس آدمی مارے ہوں' میں نے بھی چوڑیاں نہیں پہن رکھیں۔ لاؤ یہ خنجر میرے حوالے کرو ورنہ مار مار کر بھرکس نکال دوں گا۔ کیا خوب' ہمیں اُلو بناتے ہو۔ ادھر لاؤ خنجر.....'' میں نے رائفل کی نالی سے اس کی کھوپڑی کا نشانہ لیا بونا اپنی جگہ بے حس و حرکت بیٹھا رہا البتہ اس کی پتلیاں تیزی سے گردش کر رہی تھیں۔ غالباً وہ دل ہی دل میں مجھ

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

پر وار کرنے کا منصوبہ باندھ رہا تھا۔ میں نے اس خبیث روح کو مزید غور کرنے کا موقع دیے بغیر ڈپٹ کر کہا:

''خنجر زمین پر گرا دو..... ایک سے پانچ تک گنتی گنوں گا۔ اگر اس دوران میں میرے حکم کی تعمیل نہ کی تو.....'' یہ کہتے ہی میں نے غلط فائر کر دیا۔ گولی بونے کی کھوپڑی سے ایک انچ اوپر سن سے نکلی اور سامنے درخت کے تنے میں پیوست ہوگئی۔ بونا قلابازی کھا کر پرے جا پڑا۔ خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا۔ میں نے لپک کر اٹھایا اور چمڑے کی پیٹی میں اڑس لیا۔ پھر میں نے بونے کے پیٹ میں ٹھوکر ماری۔ وہ بلبلا گیا اور چیخیں مار مار کر زمین پر لوٹنے لگا' ایک اور ٹھوکر اس کی پسلی میں رسید کی۔

''کتے کے پلے..... تم..... مجھے' پیپلن کو اپنے اس ننھے سے خنجر کی دھمکی دیتے ہو'' میں نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا۔ ''ابھی تمہیں یہیں گڑھا کھود کر زندہ دفن کر دوں گا بس یہ سمجھ لو کہ میں ہی تمہارے لیے ملک الموت ہوں۔''

''اف..... اف..... ہائے..... میں مر گیا..... مجھے مت مارو موسیو پیپلن میں تو یوں ہی مذاق کر رہا تھا تم سے.....'' بونے نے تکلیف سے کراہتے ہوئے فریاد کی۔ ''بخدا! میں مذاق کر رہا تھا.....''

''خیر اب میرا مذاق بھی تم نے دیکھ لیا نا؟'' میں نے اس کی گردن پکڑ کر اٹھایا۔ اب بونے کی آنکھوں سے وہ چمک دمک غائب ہو چکی تھی اور دو ہی ٹھوکروں میں بچہ جی کو تارے اچھی طرح دکھائی دینے لگے تھے۔ ''چلو اٹھو آگے آگے چلو اور یاد رکھو اگر اب کوئی شرارت سوجھی یا مذاق کا ارادہ کیا تو اسی خنجر سے بوٹی بوٹی الگ کر دوں گا۔''

یہ کہہ کر میں نے ایک ہاتھ اس کی گردن پر رسید کیا۔ بونا لڑھکنیاں کھاتا ہوا چند فٹ کے فاصلے پر جا گرا اور زور زور سے رونے لگا۔ اس کے رونے کی آواز کتے کے رونے سے ملتی تھی۔ جوں جوں وہ روتا میرا طیش اور بڑھتا۔ اگر وہ فوراً ہی اٹھ کر آگے نہ چل دیتا تو شاید میں اسے جان ہی سے مار ڈالتا۔ نہ جانے کیوں مجھے اس بونے پر آپ ہی آپ بے انتہا غصہ آ رہا تھا۔

خدا خدا کر کے ہم سمندر کے کنارے پہنچے لیکن وہاں میرے ساتھیوں کا نام ونشان بھی نہ تھا۔ میں نے حلق پھاڑ پھاڑ کر آوازیں دیں مگر بے سود..... بونا ایک طرف بکری کے بچے کی طرح سہما ہوا تھا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

''اُلو کے پٹھے.....تم مجھے غلط راستے سے لے آئے۔'' میں نے ایک دھول اس کی کھوپڑی پر جمالی۔ ''میرے ساتھی یہاں موجود نہیں۔ خدا جانے وہ کتنے فاصلے پر ہوں گے اب بولو میں انہیں کیسے تلاش کروں۔''

ابھی الفاظ منہ سے نکلے ہی تھے کہ ایک چٹان کے عقب سے تینوں آدمی برآمد ہوئے۔ انہیں دیکھ کر میری جان میں جان آئی۔ میں نے جلد جلد انہیں تمام حالات سے آگاہ کیا۔ پھر کشتی ڈبوانے کا عمل شروع ہوا' اس میں خاصی دیر لگ گئی.....اپنی ضرورت کا سارا سامان انہوں نے پہلے ہی اتار کر ایک طرف ڈھیر کر رکھا تھا۔ کشتی غرق کرتے ہوئے دل کچھ گھبرایا کہیں یہ حماقت ہی نہ ہو۔ ان کوڑھیوں کا کیا اعتبار' ہمیں وہ اسٹیمر دیں یا نہ دیں۔ یہ کشتی بھی ہمارے ہاتھ سے جائے تاہم یہ امید بھی تھی کہ کشتی ساحل کے ساتھ ہی ڈبوئی جا رہی ہے اور غوطہ لگا کر اسے دوبارہ اوپر لے آنا کچھ مشکل نہ ہوگا مگر دوسری طرف یہ خدشہ ذہن پر سوار تھا کہ یہ کوڑھی ہماری غیر حاضری میں کشتی نکال لیں اور کسی اور جگہ لے جا کر غرق کر دیں تو ہم ان کا کیا بگاڑ لیں گے۔

بہرحال خدا کا نام لے کر ہم نے کشتی میں بڑے بڑے پتھر بھرے اور وہ آہستہ آہستہ پانی کے اندر بیٹھتی چلی گئی۔ چند لمحوں بعد اٹھتے ہوئے بلبلوں کے شور کے سوا وہاں کچھ نہ تھا۔

جان کلاز کی حالت اب خاصی بہتر تھی۔ ماترو کا چہرہ البتہ اترا ہوا تھا۔ فرینڈیز تھکن اور نیند کے ہاتھوں بے حال.....جسمانی طور پر وہ ہم سب میں صحت مند تھا اس لیے طے پایا زیادہ سے زیادہ سامان وہ اپنی پشت پر اٹھائے گا۔ جان کلاز نے نہایت استقلال سے ارادہ ظاہر کیا کہ وہ جتنا بھی ممکن ہو سکا ہمارے ساتھ سہارا لیے بغیر پیدل چلے گا۔ کچھ سامان ماترو نے سنبھالا' کچھ میں نے اور ایک بار پھر ہم جزیرے کے اندرونی حصے کی جانب روانہ ہوئے۔

فضا میں اب صبح کے اجالے کی کچھ کچھ گرمی آ رہی تھی۔ مشرقی حصہ دوسرے تاریک حصوں کے برعکس خاصا روشن تھا اور یہ روشنی دم بدم تیز ہو رہی تھی۔ لاپس بونا لالٹین گل کر کے حسب عادت ہمارے آگے آگے دوڑ رہا تھا۔ میری مار پیٹ کا اس نے کوئی خاص اثر قبول نہ کیا۔ سوائے اس کے کبھی کبھار قہر آلود نظروں سے مجھے گھورتا۔ ایک دو مرتبہ اس نے دانت

نکال کر بندر کی مانند خوخیاتے ہوئے مجھ سے درخواست کی کہ میں اس کا خنجر واپس کر دوں' آئندہ وہ کوئی بدتمیزی نہ کرے گا مگر میں نے جواب میں ایک گھونسا اور دو لاتیں اس کی کمر میں ٹکائیں اور وہ آواز نکالے بغیر پھر آگے آگے ہو لیا۔ میں اس منحوس بونے کو وہ خنجر دوبارہ دے کر کوئی خطرہ مول لینے کی پوزیشن میں نہ تھا۔ کیا خبر وہ سچ ہی کہتا ہو اور واقعی اس نے پندرہ آدمی قتل کیے ہوں۔ ظاہر ہے کوئی شخص ایسا خنجر کبھی اپنے قبضے میں نہیں رکھ سکتا جس کے استعمال سے وہ آگاہ نہ ہو۔

میرے ساتھی بھی اس بونے سے نامعلوم وجوہ کی بنا پر خوف زدہ تھے۔ فرینڈیز کا کہنا تھا 'آدمی کے بھیس میں یہ کوئی بھوت ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم اس پر کوئی زیادتی کریں اور یہ رات کو آن کر ہمارا گلا دبا دے۔ بھلا بھوتوں کا کیا اعتبار۔ جان کلاز لنگڑا لنگڑا کر چل رہا تھا اور میں نے دیکھا اس مشقت سے اسے اذیت پہنچ رہی ہے' اس کی وجہ سے ہمیں بھی آہستہ آہستہ چلنا پڑ رہا تھا۔

اب ہم جزیرے کے اندرونی جنوبی حصے میں چل رہے تھے۔ یہاں جگہ جگہ جھنکاڑ اور گھاس پھوس کے قد آدم انبار تھے۔ کہیں کہیں خاردار جھاڑیاں بھی تھیں' اونچے اور تناور درختوں کا تو کوئی شمار ہی نہ تھا۔ زمین نہایت نرم اور گیلی تھی' جا بجا سانپوں' نیولوں' چوہوں اور نہ جانے کون کون سی بلاؤں کے بل دکھائی دیئے۔ جنگلی خرگوش بڑی تعداد میں تھے۔ گیدڑ اور چرخ بھی تھے۔ مشرقی افق سے روشنی کی لہریں جنگل کو منور کرتی آگے بڑھتی تھیں اور کوڑھیوں کی زندگی انگڑائیاں لیتی بیدار ہو رہی تھی۔ ہزارہا بندر درختوں کی شاخوں پر جھولتے اور چڑ چڑ کر کے چیختے نظر آنے لگے۔ ان کے چہرے اور جسامت خرگوش کے برابر اور خدوخال گلہری سے ملتے جلتے۔ ایسی نسل ہم نے پہلی بار ہی دیکھی۔ راہ میں دس بارہ فٹ گہری جگہ خشک ملی جس کی تہ میں تین چار عظیم الجثہ کچھوے کلبلا رہے تھے۔ ایسے کچھوے کا گوشت بڑا لذیذ ہے' لیکن اسے ہلاک کرنا کارے دارد.....فرینڈیز کے منہ میں پانی بھر آیا' بے اختیار پشت پر لدا ہوا سامان ایک طرف رکھ دیا اور رائفل سے تین چار فائر.....گولیاں

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کچھوے کی پشت پر لگیں' مگر بے سود.....اس سخت جان' جانور نے ذرہ برابر بھی اثر قبول نہ کیا۔ صرف اتنا ہوا کہ گہری دلدل کے اندر دھنس گئے اور گردنیں اپنے خول میں چھپالیں۔

''بخدا! میں انہیں ساتھ لیے بغیر نہ جاؤں گا۔'' فرینڈیز نے اعلان کیا۔ پھر ادھر ادھر متلاشی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ ماترو بھی اس کام میں شریک ہوگیا۔ کچھ فاصلے پر ایک تودہ بکھرا ہوا نظر آیا۔ وہاں سے یہ دونوں بھاری بھاری پتھر اٹھالائے اور نہایت چابکدستی سے کچھوؤں پر پھینک دیئے۔ آدھ آدھ من کے یہ پتھر کچھوؤں کا قیمہ کر دینے کے لیے کافی تھے۔ جلدی جلدی یہ دونوں ندی میں اترے اور چاقوؤں سے کچھوؤں کے پارچے کر کے تھیلے میں بھر لیے۔ اس میں بونے کے خنجر نے بھی خاصی مدد کی۔ میں نے ماترو سے کہا' وہ کچھوے کے گوشت میں سے تھوڑا سا اس بونے کو بھی دے دے۔ توقع کے خلاف بونے نے یہ تحفہ فوراً قبول کرلیا۔

اب ہمیں جا بجا لکڑی کے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے کیبن مختلف مقامات پر دکھائی دینے لگے۔ معلوم ہوا' یہ کیبن آڑے وقت کے لیے کوڑھیوں ہی نے تعمیر کیے ہیں اور یہاں وہ لوگ پناہ لیتے ہیں جنہیں قیدیوں کے مختلف کیمپوں سے وقتاً فوقتاً فرار ہونے کے مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ آخر ایک بڑے کیبن کے پاس پہنچ کر ہمارا راہبر رُکا۔ یہ گھنے درختوں کے اندر اس انداز میں بنایا گیا تھا کہ جب تک کوئی قریب نہ پہنچے اسے اندازہ ہی نہ ہوسکتا تھا کہ یہاں کوئی کیبن بھی ہے۔ لاپس نے دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا' میں نے دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی گرم ہوا کا ایک بھپکا آیا۔ جان کلاز بے چارہ بری طرح تھک چکا تھا اور کسی مریل کتے کی طرح زبان نکالے ہانپ رہا تھا۔ زیادہ دیر تک کھڑے رہنا اس کی ہمت سے باہر تھا۔ اس لیے وہیں لمبی لمبی گھاس میں لیٹ گیا جس پر خشک پتوں کا قدرتی فرش بچھا تھا۔

کیبن کی گرم ہوا جب خارج ہوگئی تو ہم یکے بعد دیگرے اندر داخل ہوئے۔ لکڑی کی اس چار دیواری میں رکھا ہی کیا ہوگا مگر اندر جا کر چودہ طبق روشن ہوگئے۔ لوہے کے چار پانچ

نہایت نفیس پلنگ برابر برابر پڑے تھے اور ان پر صاف ستھرے بستر۔ پائنتی کی طرف کمبل تہہ کیے ہوئے بستر اور کمبل۔ انہیں ابھی تک استعمال نہ کیا گیا تھا۔ دیوار کے ساتھ ساتھ ایک لمبی اور اونچی الماری جس میں ضرورت کے برتن بھرے ہوئے۔ تیل سے جلنے والا ایک چولہا بھی موجود.....قریب ہی ایک ٹین کے کنستر میں مٹی کا تیل بھرا ہوا۔

''یار پیپلن' کہیں ہم کوئی سہانا سپنا تو نہیں دیکھ رہے؟'' فرینڈیز کی آواز میرے کانوں میں آئی۔ ''ایسا لگتا ہے ہم شکاگو کے کسی تیسرے درجے کے ہوٹل میں آ گئے ہیں اور یہ سب سے بہترین کمرہ ہمیں الاٹ ہوا ہے۔''

''معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''بہرحال سامان اندر لاؤ پھر اطمینان سے آرام کرو۔ غالباً یہ اہتمام پہلے ہی اس لیے کر دیا گیا کہ ان لوگوں کو یقین تھا ہم اس طرف ضرور آئیں گے۔ بہرحال ان کے تدبر اور دور اندیشی کی داد دینی پڑتی ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے بونے کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ دن کی روشنی میں رات کی تاریکی سے زیادہ بھیانک اور عجیب الخلقت لگ رہا تھا۔

''اب تم جا سکتے ہو لاپس۔'' میں نے کہا۔ ''اور اپنے سردار زوساں کا ہماری سب کی طرف سے شکریہ ادا کر دینا۔ تمہارے ساتھ جو سلوک میں نے کیا اس پر مجھے افسوس ہے مگر تمہیں ایسا کرنا نہیں چاہیے تھا۔ ہم لوگ ایسی دھمکیاں سننے کے عادی نہیں۔ اگر زوساں نے سفارش کی تو میں تمہارا خنجر واپس کرنے کے مسئلے پر غور کروں گا۔''

لاپس کے ہونٹ کچھ کہنے کے لیے کھلے' لیکن پھر بند ہوگئے۔ اس نے پتلیاں گھما کر باری باری ہمیں دیکھا اور باہر نکل گیا۔

''خدا مجھ پر رحم کرے! کیسی شکل کا بونا ہے یہ.....اور کوڑھ نے اس کی کیا حالت کر دی ہے۔'' ماترو نے کہا۔

''ہاں یہ سب بے چارے قابل رحم ہیں۔'' جان کلاز نے لقمہ دیا۔ ''میں سمجھتا ہوں جب تک یہ لوگ ہمارے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتے رہیں' ہمیں بھی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرنا چاہیے.....کیوں پیپلن' میں ٹھیک کہتا ہوں نا؟''

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

"بے شک......تم ٹھیک کہتے ہو مگر ہمیں پھونک پھونک کر قدم رکھنا ہوگا۔ تم شاید میکس برٹین کی باتیں بھول گئے۔ اس نے ان کوڑھیوں سے خبردار اور ہوشیار رہنے کی سخت تاکید کی تھی۔"

"یار اب یہ باتیں چھوڑو اور کچھ پیٹ پوجا کا بندوبست کرو۔" فرینڈیز نے تھیلے میں سے کچھوے کا گوشت نکال کر لکڑی کے فرش پر ڈھیر کرتے ہوئے کہا" کہیں سے پانی مل جائے تو ان ٹکڑوں کو اُبال کر کھالیں۔"

"ماترو نے فوراً الماری کھولی' ایک ایک چیز کا جائزہ لیا اور خوشی سے چلا اٹھا:

"کمال کر دیا......کمال کر دیا......نمک' کالی مرچ' شکر' چائے' قہوہ سب چیزیں موجود ہیں۔ یار واقعی ہم کسی ایسے ہوٹل میں تو نہیں آ گئے جہاں سیلف سروس ہوتی ہے؟"

وہ بچوں کی طرح تالیاں بجا بجا کر خوش ہو رہا تھا۔ فرینڈیز نے ایک گوشے میں پڑا ہوا ٹین کا خالی کنستر اٹھایا اور پانی کی تلاش میں نکل گیا۔ میں نے اسے زیادہ دور نہ جانے کی ہدایت کی۔ کیبن کے آس پاس ہی پانی مل جائے گا' میرا قیاس صحیح نکلا۔ کوئی دو سو گز کے فاصلے پر پہاڑی چشمہ رواں دواں تھا۔ فرینڈیز آدھ گھنٹے میں خوش خوش واپس آیا' پانی صاف شفاف' لیکن کسی قدر بھاری تھا اور اس میں سے عجیب قسم کی بُو آ رہی تھی۔ بار بار سونگھنے کے باوجود ہم اندازہ نہ کر سکے یہ کس چیز کی بو ہے۔ یقیناً اس پہاڑی کے اندر معدنیات میں سے کسی خاص چیز کا ذخیرہ تھا جو چشمے کے پانی میں تحلیل ہو رہا تھا۔ جان کلاز نے مشورہ دیا کہ پانی کو اچھی طرح ابال لینا مناسب ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ ماترو نے آناً فاناً باورچی خانے کا انتظام سنبھال لیا اور مشاق باورچیوں کی مانند کھانا پکانے کا اہتمام شروع کر دیا۔ وہ بار بار کہتا:" کاش! کوئی ایپرن مل جاتا اور میرے یہ کپڑے مزید تباہ ہونے سے بچ جاتے۔ ہم سب اس کی باتوں پر قہقہے لگاتے اور خوش طبعی کرتے رہے۔

ایک گھنٹے کے اندر اندر انتہائی لذیذ اور خستہ گوشت تیار تھا۔ خوب پیٹ بھر کر کھایا' کیبن کا دروازہ اندر سے بند کیا۔ اپنے ہتھیار سرہانے رکھے اور بستروں پر لیٹ کر خوابوں کی دنیا میں پہنچ گئے۔

✣ ⁘ ✱ ⁘ ✣

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

سارا دن گھوڑے بیچ کر سوئے۔ سورج غروب ہونے میں کچھ دیر تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی' معلوم ہوا ہمارے اولیں دوست لاشونی اور اس کے ہمراہی آئے ہیں۔ انہوں نے کیبن کے اندر آنے سے احتراز کیا' ہم نے فوراً اپنی رائفلیں سنبھالیں اور باہر نکل آئے۔ جونہی ہم آمنے سامنے ہوئے لاشونی اور اس کے ساتھی پانچ پانچ قدم پیچھے ہٹ گئے اور گھناؤنی گھناؤنی مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا۔

"امید ہے کیبن میں آرام ملا ہوگا۔" لاشونی نے کہا۔

"ہاں' توقع کے خلاف......" میں نے جواب دیا۔ "ہم آپ کے شکر گزار ہیں اور چاہتے ہیں جلد از جلد آپ ہمیں اپنے وعدے کے مطابق اسٹیمر مہیا کریں اور ہم سے رقم وصول کر کے ہمیں رخصت کر دیں۔"

"بہتر ہے موسیو مگر آپ کو معلوم نہیں کہ سینٹ مارٹن کے مسلح بحری سپاہی آپ کی تلاش میں ہیں۔ آج صبح بھی وہ جزیرے کے ساحل پر اترے تھے۔ جذام کے مرض کی وجہ سے وہ اندرونی علاقے میں آتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ ان کے کپتان نے دھمکی دی ہے کہ اگر ہم نے مفرور مجرموں کو پناہ دینے کی غلطی کی تو اس کے بھیانک نتائج برآمد ہوں گے۔ وہ لوگ دیر تک ساحل کے آس پاس چٹانوں کے اندر اور کچھ دور جزیرے کے گھنے ساحلی درختوں کے جھنڈ میں آپ لوگوں کا سراغ پانے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ بدقسمتی سے ان میں سے ایک سپاہی نے چٹان کے عقب میں کپڑے کی ایسی دھجی پڑی پائی جو آپ کے ساتھیوں میں سے کسی کے لباس سے پھٹ کر وہاں رہ گئی ہوگی۔ اس کے علاوہ ریت میں دبے ہوئے سگرٹوں کے چند ٹکڑے بھی ڈھونڈ نکالے ہیں۔ ہم نے انہیں یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ ابھی تک جزیرے پر کوئی مفرور قیدی نہیں آیا اور جو اشیا انہیں ملی ہیں وہ ہماری اپنی ہیں۔ بہرحال انہیں ہماری باتوں پر یقین نہیں آیا ہے اور ممکن ہے وہ آپ کی تلاش میں کسی بھی وقت جزیرے کے اس حصے تک آنے کی جرأت کر ڈالیں لہٰذا آپ کیبن سے باہر نہ نکلیں۔ زوساں نے ہدایت کی ہے کہ جتنی جلد ممکن ہو ہم آپ کو جذامی مریضوں میں بدل دیں۔ شاید اس طرح آپ گرفتار ہونے سے بچ جائیں۔"

"کیا مطلب؟" میں نے آنکھیں نکال کر کہا" جذامی مریضوں میں بدل دیں میں سمجھا نہیں ذرا کھل کر بات کرو۔"

لاشونی نے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا:

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

''خدانخواستہ ہمارا یہ مطلب نہیں کہ آپ بھی جذامی ہو جائیں۔ مقصد یہ کہ ہم آپ کے چہروں اور ہاتھوں پر کچھ ایسا میک اپ کرنا چاہتے ہیں جس سے آپ لوگ ہماری مانند کوڑھی دکھائی دیں۔ دیکھیے موسیو پیپلن' جس طرح آپ کے سامنے اپنی جان کا سوال ہے اسی طرح ہمیں بھی اپنی جانیں بچانی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد رات کی تاریکی مسلط ہونے والی ہے' آپ نے ہمارا سنٹر دیکھ لیا ہے' آدھی رات کے بعد آپ لوگ وہاں آ جائیں' ہمارے پاس ''میک اپ'' کے چند ماہر موجود ہیں جو بہت جلد اپنی مہارت فن سے آپ کا حلیہ ایسا بنا دیں گے جیسے آپ خدانخواستہ برسوں سے جذام میں مبتلا ہوں۔''

''بہت خوب! تدبیر تو اچھی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن میں پھر کہے دیتا ہوں ہمارے ساتھ کوئی دھوکا یا فریب کیا گیا تو نتائج کی ذمے داری تمہیں پر ہوگی۔''

''آپ اطمینان رکھیں موسیو پیپلن' ہم میں سے کوئی فرد آپ کو دھوکا نہ دے گا۔ جب ہم نے آپ سے ایک بات طے کر لی ہے تو ہم اس پر پورا پورا عمل کریں گے تاوقتیکہ آپ کی طرف سے خلاف ورزی نہ ہو..... آپ نے ہمارے نہایت قریبی اور معزز ساتھی لاپس کو بلاوجہ مارا پیٹا اور اس کا خنجر چھین لیا۔ یہ حرکت سخت ناپسندیدہ ہے اور اگر دوسرے جذامیوں تک یہ خبر پہنچ گئی' تو ان میں آپ کے خلاف نفرت اور حقارت کے جذبات کا پھیل جانا کچھ دشوار نہیں۔ آئندہ آپ کو محتاط رہنا ہوگا۔''

لاشونی صاحب کا اب ولہجہ ایسا تھا جیسے کوئی جرنیل اپنے ماتحتوں کو خطاب کرتا ہے۔

طیش تو بہت آیا مگر ضبط کرنے کے سوا چارہ ہی کیا تھا؟ بلاشبہ ہماری جانیں انہی خبیث چلتی پھرتی بدروحوں کے رحم و کرم پر تھیں۔ اگر بحری سپاہیوں کی ٹولی واقعی ساحل پر پہرہ دے رہی تھی تو ہمارا بچ نکلنا ممکن نہ تھا۔ ادھر یہ خدشہ بھی خون خشک کیے دیتا تھا کہ ہم اگر زیادہ مدت جزیرے کی فضا میں رہے تو ہمارا کوڑھی ہو جانا یقینی ہے۔ غرض عجب ضیق میں جان تھی۔ میں اپنے ساتھیوں کو ایک طرف لے گیا اور انہوں نے کہا' اس وقت کوڑھیوں سے جھگڑنا ٹھیک نہ ہوگا۔ ہم ہر طرح ان کے قبضے میں ہیں لہٰذا جو یہ کہیں اس پر عمل کرنا چاہیے۔ فرض کرو ہم نے جھگڑا فساد کر کے دس بارہ کوڑھی جہنم رسید کر بھی دیئے تو اس سے کیا حاصل؟ اس کے بعد ہم دو طرف سے دشمنوں میں گھر کر کتے کی موت مارے جائیں گے۔

''ٹھیک ہے..... ہم زبان پر اعتماد کرتے ہوئے اپنے آپ کو آپ کے حوالے کرتے ہیں۔'' میں نے کہا' ''آدھی رات کے بعد ہم سب ''سنٹر'' پہنچ جائیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم چاہیں گے کہ اسٹیمر عجلت کے ساتھ ہمیں مہیا کیا جائے۔ اس کی قیمت اگر آپ چاہیں تو ہم پیشگی ادا کر دیں گے۔''

''نہیں موسیو' اتنی جلد بازی سے کام نہ لیجیے۔'' لاشونی نے کہا۔ ''جب آپ مجھ پر پورا اعتماد کرتے ہیں تو یہ حد درجہ منافقت اور بے ایمانی ہوگی کہ ہم آپ کے ساتھ وفا نہ کریں۔ یقین کیجیے ہم آپ کے لیے جانیں لڑا دیں گے۔ الوداع۔''

اس دوران میں لاشونی کے ساتھ آنے والے بے جان بتوں کی مانند چپ چاپ کھڑے ہمیں تکتے رہے۔ وہ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق نظر آتے تھے' کبھی ان کے چہروں اور آنکھوں سے بے چارگی' بے بسی' حسرت اور حزن ٹپکنے لگتا اور کبھی عیاری مکاری اور درندگی کے آثار ابھرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم سب ایک تکلیف دہ مصیبت میں پھنس گئے تھے۔ دماغ میں صدہا خیالات آتے' کبھی پریشان کن۔ ایک لمحے یوں لگتا جیسے ہماری مصیبتوں کے دن ہوا ہو رہے ہیں۔ دوسرے ہی لمحے یہ سوچ کر کلیجہ تھرا جاتا کہ مصائب اور مشکلات کی ایک نئی لہر ہے جس کی آخری حد پر موت کا تختہ ہمارا انتظار کر رہا ہے۔

وہ بادلوں کی مانند جنگل کی فضا میں تحلیل ہو گئے تو ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ فرینڈیز کی مونچھیں بری طرح پھڑک رہی تھیں اور پیشانی پر لکیروں کا اجتماع ہو گیا۔ اس نے ہونٹ بھینچ کر کوڑھیوں کو غلیظ گالی دی پھر کہا' تم میری نسبت زیادہ تجربے کار اور سمجھ دار ہو۔ یوں بھی ہم نے اپنی قسمت کا فیصلہ تمہارے ہاتھ میں دے دیا ہے مگر میرا دل کہتا ہے ہمیں ان منحوس لوگوں پر اندھا اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔ میرا خیال ہے یہ لوگ آہستہ آہستہ ہم پر حاوی ہونا چاہتے ہیں۔ کل ان کا مطالبہ ہوگا ہم اپنا اسلحہ بھی ان کے حوالے کر دیں اور ہمیں نہتا کرنے کے بعد بحری پولیس سے زر نقد وصول کریں اور ہمیں ان کے سپرد کر دیں۔''

فرینڈیز کی باتوں میں وزن تھا۔ میری پوزیشن بڑی نازک ہوتی جا رہی تھی۔ دفعتاً میرے ذہن میں ایک ایسی تدبیر آئی جس پر عمل کر کے یہ معلوم کیا جا سکتا تھا کہ ساحل پر سپاہیوں کی ٹولی موجود ہے یا نہیں اس عمل میں بے حد خطرہ چھپا ہوا تھا تاہم اس کے بغیر چارہ بھی کیا تھا۔

میں نے ماترو اور جان کلاز کو کیبن میں ٹھہرنے کی ہدایت کی' فرینڈیز کو ساتھ لیا اور بونے کے ساتھ جس راہ سے ہم آئے تھے اسی طرف کو روانہ ہوئے۔ جنگل کا یہ حصہ اب ہم دونوں کے لیے اجنبی نہ تھا۔ سمندر کا ساحل ہمارے کیبن سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر ہوگا۔ عام حالات میں ہمیں ایک گھنٹے سے زیادہ عرصہ نہ لگتا لیکن جنگل کے ناہموار اور جھاڑ جھنکاڑ سے اٹے ہوئے راستے پر چلنا بڑا دشوار تھا۔ بار بار یہ احساس ہوتا ہم راستہ بھٹک کر کہیں اور جا نکلے ہیں لیکن قدرت کو شاید ہماری کچھ بہتری منظور تھی۔ گرتے پڑتے' اٹھتے بیٹھتے آخر ہم ساحل کے نزدیک پہنچ ہی گئے۔ سمندر کا شور ہمیں صاف سنائی دے رہا تھا۔ سفید سفید جھاگ اور چٹانوں سے ٹکراتی موجیں.....ان کے ساتھ ساتھ تیز ساحلی ہوا میں جھومتے ہوئے درخت اور سیٹیاں بجاتی ہوئی ہوا۔ آسمان پر ستارے صاف اور روشن تھے۔ چاند نکلنے کا ابھی کوئی امکان نہ تھا۔ تاہم ستاروں کی روشنی میں ہم فرلانگ تک کا منظر بخوبی دیکھ رہے تھے۔

یکا یک فرینڈیز نے میرا بازو تھام لیا۔

''وہ دیکھو پیپلن' واقعی ایک موٹر بوٹ ساحل پر موجود ہے۔ اس کے اندر سپاہی حرکت کرتے صاف نظر آ رہے ہیں۔''

اتنے میں کسی سپاہی نے سرچ لائٹ روشن کر دی۔ ہم دونوں جلدی سے جھاڑیوں میں دبک گئے۔ طاقت ور سرچ لائٹ ہمارے سروں پر سے گھومتی ہوئی نکل گئی۔ آدھ گھنٹے تک ہم وہیں دم سادھے پڑے رہے۔ کچھ اندازہ نہ ہو سکا کہ سپاہی کتنی تعداد میں ہیں۔ موٹر بوٹ خاصی بڑی تھی۔ اتنی بڑی جس میں کم از کم پچاس ساٹھ آدمی آسانی سے سفر کر سکتے تھے۔ حیرت انگیز بات یہ کہ وہ طاقت ور سرچ لائٹ ساتھ لے آئے تھے جو یقیناً بیٹری سے چلتی تھی۔ ٹھیک آدھ گھنٹے بعد انہوں نے پھر لائٹ جلائی اور ساحل کا جائزہ لیا۔

ہم ساحل سے یہ نظارہ کر کے واپس ہوئے تو دل خوف سے بری طرح دھڑک رہے تھے۔ بار بار یہی خیال آتا کہ بحری سپاہیوں کا قیام کچھ نہ کچھ معنی ضرور رکھتا ہے۔ انہیں یقین دلایا گیا ہوگا کہ مفرور قیدی بہرحال اسی جزیرے پر ہیں اور کبھی نہ کبھی باہر نکلیں گے۔

کیبن میں پہنچے تو جان کلاز اور ماترو جاگ رہے تھے۔ آدھی رات سر پر تھی۔ اب ہمیں زوساں کے سنٹر پہنچنا تھا۔ کیبن کا دروازہ اچھی طرح بند کر کے ہم ایک بار پھر اس منحوس

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

جزیرے کی سیاحت کو نکلے۔ اس مرتبہ ہمارا رُخ ادھر تھا جدھر گزشتہ رات قسمت کا نادیدہ ہاتھ کوڑھیوں کے مرکزی مقام کی طرف لے گیا تھا۔

جوں توں کر کے سنٹر میں داخل ہوئے ہمیں ''گارڈ آف آنر'' پیش کرنے کے لیے لاشونی اور ان کے مصاحب حاضر تھے ادھر بڑی رونق تھی' کوئی رو رہا تھا' کوئی گا رہا تھا۔ کوئی چیخ چیخ کر خدا سے اپنے بداعمال کی معافیاں طلب کر رہا تھا' کوئی گالیاں دے رہا تھا اور کوئی اپنے ساتھی سے لڑنے میں مشغول تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا یہ کوڑھی آرام کس وقت کرتے ہوں گے۔ ہم نے جب دیکھا انہیں چلتے پھرتے ہی دیکھا۔ حتیٰ کہ ان کا وہ قبر رسیدہ سردار زوساں بھی اس وقت جاگ رہا تھا اور پوری طرح چاق و چوبند۔ ہمیں دیکھ کر اس کے لبوں پر معنی خیز تبسم نمودار ہوا۔

''آہاہا.....موسیو پیپلن' آپ تشریف لے آئے اور یہ ہیں آپ کے ساتھی براہ کرم ان کے نام اور پتوں سے آگاہ فرمائیے۔''

میں نہیں کہہ سکتا اس کے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی یا وہ خلوص سے میرے ساتھیوں کے نام اور پتے جاننا چاہتا تھا۔ میں نے بہرحال ضبط و تحمل سے کام لے کر ساتھیوں کا تعارف کرایا۔ بڈھا برابر مسکراتا اور گردن ہلاتا رہا۔ ماترو کو دیکھ کر کچھ متعجب ہوا اور کہنے لگا:

''میری اتنی عمر ہونے کو آئی ایسا کم سن قاتل نظر سے نہیں گزرا۔ کیا واقعی اس لونڈے نے پیرس میں کسی ٹیکسی ڈرائیور کو قتل کیا تھا؟''

''اس میں حیرت کی کیا بات ہے بڑے میاں؟'' ماترو نے غصے سے چلاتے ہوئے کہا۔ ''کہو تو تمہیں بھی یہیں ڈھیر کر دوں؟''

یہ کہہ کر ماترو نے اپنے نیفے میں سے چاقو نکالا۔ یہ گراری دار چاقو کڑکڑاتی آواز سے کھلتا تھا اور اس کی آواز ہی ایسی تھی کہ اچھے خاصے جی دار کا زہرہ آب ہو جاتا۔ دھار پر انگوٹھا پھیر کر ماترو نے چاقو بند کیا اور دوبارہ نیفے میں اڑس لیا۔ ہم میں سے کسی کو توقع نہ تھی کہ وہ ایسی وحشیانہ حرکت کرے گا۔ تاہم یہ حرکت بے سود نہ رہی۔ اردگرد کھڑے ہوئے کوڑھی ڈر کر پرے ہٹ گئے' زوساں کی آنکھوں میں ایک ثانیے کے لیے میں نے موت کے سائے رقصاں دیکھے۔ اس کے ہاتھ بری طرح لرز رہے تھے۔ جونہی ماترو نے چاقو اپنی ڈب میں رکھا زوساں کے ہاتھوں کا ارتعاش فوراً تھم گیا۔ ماترو نے نہایت بے حیائی اور اوباش پن کا

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

مظاہرہ کرتے ہوئے زوساں کو آنکھ ماری اور مسکراتے ہوئے بولا: ''مجھے افسوس ہے آپ میرے دادا جان کی عمر کے ہیں ورنہ جس انداز میں آپ نے موسیو پیپلن سے میرا ذکر کیا وہ مجھے مجبور کرتا ہے کہ میں آپ کو یہیں اسی لمحے ڈھیر کر دوں۔ آئندہ میرے بارے میں کچھ کہتے ہوئے محتاط رہیے گا بس ایک ہی بار وارننگ دیا کرتا ہوں۔''

زوساں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ماترو کو تکے جا رہا تھا۔ اس موقع پر میں نے مداخلت کی اور ماترو کو ڈانٹتے ہوئے کہا: ''زیادہ بکواس نہ کرو بڑے میاں نے کسی بری نیت سے تمہارا نام نہیں لیا تھا۔''

زوساں نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا:

''اب اس ذکر کو جانے دیجیے موسیو! یہ صاحبزادے کہیں دوبارہ مشتعل نہ ہو جائیں ابھی میں کچھ عرصے اور زندہ رہنے کا خواہش مند ہوں۔''

''چلو معافی مانگو بڑے میاں سے۔'' فرینڈیز سے چپ نہ رہا گیا۔

''ہاں ہاں اسے معاف کر دیجیے' بے وقوف ہے۔'' جان کلاز نے کہا۔ زوساں نے فوراً ماترو کو معاف کر دیا۔ اب پھر ہم سنٹر کی دوسری منزل کے چھوٹے سے کمرے میں آ گئے اور باری باری ہمارے چہروں' ہاتھوں اور ٹانگوں پر کچھ اس قسم کا میک اپ کیا گیا اور پٹیاں سی باندھی گئیں کہ جب ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا تو خوف سے کانپ سے گئے۔ اب ہم میں اور دوسرے کوڑھیوں میں حلیے اور مرض کے اعتبار سے بظاہر کوئی فرق نہ تھا۔ جذام کے مصنوعی زخم اور پیپ کے کھرنڈ بنانے کے لیے انہوں نے درختوں کی گوند کھرنڈ' گندھک اور نامعلوم پودوں کی چھال' رنگ اور مسالوں سے کام لیا تھا۔ اس کام میں دو گھنٹے لگے اب ہمیں یہ بھی شبہ ہونے لگا کہ جن کوڑھیوں کو ہم اس سنٹر میں چلتے پھرتے دیکھ رہے ہیں وہ سب کے سب واقعی کوڑھی ہی ہیں یا ان میں اکثریت مصنوعی ہے ہمارے لیے اپنے اسلحے کی ہر ممکن حفاظت ضروری ہو گئی تھی۔ میں نے پہلی بار یہ بھی دیکھا کہ بعض کوڑھی نہایت قوی ہیکل اور تندرست ہیں۔ یہ ہمیں خون آشام نظروں سے گھورتے اور آپس میں اشارے بازی کرتے۔ لاشونی نے یہ بھی بتایا کہ اسی روز صبح آٹھ بجے خوراک اور دواؤں وغیرہ کی موٹر بوٹ آئے گی۔ اس میں سے کچھ چیزیں وہ ہمارے استعمال کے لیے رکھ دیں گے۔ انہوں نے یہ بھی ہدایت کی کہ جہاں تک ممکن ہو ہم اپنی رائفلیں بھی کہیں چھپا دیں' ہو سکتا ہے بحری

سپاہیوں کی کوئی ٹولی اطلاع پا کر ہماری گرفتاری کے لیے جزیرے کے اندر گھس آئے۔ ہم نے رخصت ہونے کی اجازت چاہی' نیند اور تھکن سے بُرا حال تھا۔ کیبن میں پہنچتے ہی ہم اپنے اپنے بستروں پر گرے اور گہری نیند سو گئے۔ دفعتہً میری آنکھ کھل گئی۔ گھپ اندھیرا تھا اور میرے ساتھیوں کے خراٹوں کی ہلکی ہلکی آوازیں اٹھ رہی تھی۔ میں چپ چاپ یہ آوازیں سنتا رہا پھر ذہن کے پردے پر یکا یک ایک غیر مرئی سی فلم چلنے لگی۔ مجھے اپنا گھر یاد آیا' ماں' باپ' بہن' بھائی یاد آئے۔ ان کی صورتیں حافظے میں ابھرنے لگیں۔ میری ماں کتنی شفیق اور محبت کرنے والی تھی۔ باپ کتنا مہربان اور جاں نثار تھا' بہن بھائی مجھے کس قدر چاہتے تھے۔ وہ ہمارا چھوٹا سا خوشنما صاف ستھرا گھر جس کی چھت اور برآمدوں پر عشق پیچاں کی بیلیں پڑی رہتی تھیں۔ مختصر سے ہرے بھرے لان میں کتنے خوبصورت اور ننھے منے پھول اگا کرتے تھے۔ ہمارا اسکول گھر کے بالکل قریب تھا۔ ہسپتال اور گرجے کی سفید سفید عمارتیں' قصبے کا چھوٹا سا بازار جہاں ضرورت کی ہر چیز مل جاتی تھی۔ لوگ ایک دوسرے سے کتنی اچھی طرح ملتے تھے' ہنس مکھ' خوش اخلاق' ملنسار' آپس میں پیار محبت سے رہنے والے۔ وہاں کوئی شخص دنگا فساد نہ کرتا تھا۔ کتنا اچھا زمانہ تھا وہ۔ بے انتہا یادیں تھیں۔ لاتعداد تصویریں تھیں۔ ان گنت ہنستے مسکراتے چہرے تھے اور نہ جانے کتنی مانوس اور آشنا آوازیں تھیں جو میرے کانوں میں آ رہی تھیں۔ پھر مجھے یاد آیا کہ میرے والد کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا۔ ان کی لاش جب گھر آئی تھی تو کتنا کہرام مچا تھا۔ میری ماں شدت غم سے بے ہوش ہو گئی تھی۔ ننھی بہنیں اور چھوٹے بھائی کیسے چیخ چیخ کر رو رہے تھے اور پچھاڑیں کھا رہے تھے۔ مجھ پر سکتے کا عالم طاری تھا اور میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے باپ کی لاش کو تک رہا تھا جو خون میں لت پت تھی۔ لوگوں نے بتایا' میرے باپ کی کار ایک ٹرک سے ٹکرا گئی تھی۔ پھر اخباری نامہ نگاروں اور فوٹو گرافروں نے ہمارے گھر پر ہلہ بول دیا تھا۔

والد کے انتقال کے کوئی چھ سات ماہ بعد میری پیاری ماں بھی چل بسی۔ وہ وقت سے پہلے ہی بوڑھی ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھیں رو رو کر سوج گئی تھیں۔ چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ اس نے ہماری خاطر ایک اسکول میں ملازمت کر لی تھی۔ میں چونکہ سب سے بڑا تھا اس لیے مجھے اس نے ایک ورکشاپ میں کام سیکھنے بھیج دیا۔ اب ہمارے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ تعلیم کے اخراجات اٹھا سکتے۔ ورکشاپ کا ماحول اچھا نہیں تھا۔ وہاں میرے ہم عمر بہت سے لڑکے کام

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کرتے تھے' اکثر بری عادتوں کا شکار تھے۔ میں نہیں جانتا کیونکر آہستہ آہستہ میں انہی جیسا بنتا چلا گیا۔ شورہ پشتی' دنگا فساد' لڑائی مار کٹائی سے آگے نکل کر چھوٹی موٹی چوریاں کرنے لگا۔ چرس پینے کی لت پڑی' اس کے بعد شراب منہ کو لگی۔ چاقو اور ریوالور چلانا بھی سیکھ لیا۔ کئی بار پولیس مجھے گھر سے پکڑ کر لے گئی۔ پہلا مقدمہ تھا جس میں مجھے چھ ماہ قید کی سزا ملی۔ جیل کی دنیا ایک نرالی اور عجیب دنیا تھی۔ چھ ماہ بعد جب میں جیل سے نکل کر گھر واپس آیا تو پتہ چلا میری بڑی بہن کو کوئی بدمعاش اغوا کر کے لے گیا ہے۔ چھوٹی بہن کسی شراب خانے میں ساقی گری کے فرائض انجام دیتی ہے۔ بھائی لاپتہ ہے ہماری وہ چھوٹی سی جنت نہ جانے کہاں گم ہو گئی تھی..... میں کیا کرتا؟ دوبارہ جرائم کی اسی دنیا میں نکل گیا جہاں سے واپس آنے کا امکان ہی نہیں ہوتا۔

میں نے محسوس کیا' آنسوؤں سے میرے دونوں رخسار اور گردن تر ہو چکی ہے۔ پرانی افسردہ یادوں کا ایک ہجوم دائیں بائیں' آگے پیچھے ہر طرف سے مجھے گھیرے میں لیے ہوئے تھا۔ اس ہجوم کے بوجھ سے میری روح دبی جا رہی تھی۔ دفعتہً کیبن کے دروازے پر کسی نے ہلکی سی دستک دی اور ذہن کے پردے پر چلتی ہوئی یہ انوکھی فلم ایک جھٹکے سے ٹوٹ گئی۔ ایک بار پھر میں اندھے خلا میں بھٹکنے لگا۔ دل کی دھڑکن آپ ہی آپ تیز ہو گئی پھر رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔ بے اختیار میرا ہاتھ سرہانے رکھی ہوئی رائفل کی طرف بڑھا اور سرد آہنی نال چھو کر ایک عجیب طمانیت کا احساس جسم میں دوڑ گیا۔ میں بے حس و حرکت لیٹا دستک کی آواز پر کان لگائے رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا باہر ہوا کے تیز جھکڑ چل رہے ہیں اور انہیں جھکڑوں کے باعث لکڑی کا یہ دروازہ خود بخود ہلا ہوگا..... مگر نہیں..... ایک بار پھر دستک ہوئی..... یقیناً کوئی شخص آہستہ آہستہ دروازہ تھپ تھپا رہا تھا۔

''کون ہے؟'' میں نے پوچھا:

کوئی جواب نہ ملا..... چند لمحے گزر گئے..... پھر وہی دستک..... اس بار آواز کچھ زیادہ اونچی تھی۔ میری آواز سن کر سب سے پہلے جان کلاز کی آنکھ کھلی۔ اس نے کہا:

''کیا بات ہے پیپلن' تم کس سے باتیں کر رہے تھے؟''

''دروازے پر کوئی دستک دے رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

''اچھا؟'' اس کے لہجے میں حیرت کے ساتھ ساتھ خوف ابھر آیا۔ ''اس وقت کون آیا ہوگا؟''

''فوراً دوسروں کو اٹھا دو۔'' میں نے سرگوشی کی۔ اتنے میں دروازہ زور سے یوں ہلا جیسے کوئی توڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔ آناً فاناً ماترو اور فرینڈیز بھی ہوشیار ہو گئے۔ انہوں نے اپنے اپنے ہتھیار سنبھال لیے اور دیواروں کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازے کی ایک جھری سے آنکھ لگا دی۔ باہر صبح کاذب کا دھندلکا پھیلا تھا اور کوئی شے صاف دکھائی نہ دیتی تھی۔

''باہر تو کوئی نظر نہیں آتا پھر یہ دروازہ کون توڑ رہا تھا۔'' میں نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

''تعجب ہے'' جان کلاز نے بھی جھری سے باہر کا منظر دیکھا۔ ''اگر دروازہ تیز ہوا سے ہلتا' تو اسے مسلسل ہلتے رہنا چاہیے تھا۔ ویسے باہر ہوا چل ضرور رہی ہے اور خاصی تیز بھی ہے۔ شاخوں کے جھومنے اور پتوں کے بجنے کی آواز برابر آ رہی ہے۔''

فرینڈیز اور ماترو نے بھی باری باری جھری سے آنکھیں لگائیں۔

''چلو چھوڑو' بعض اوقات وہم بھی تو ہو جاتا ہے۔'' میں نے بستر پر واپس آتے ہوئے کہا۔ ''صبح ہو لے تو دروازے کا معائنہ کریں گے۔ اگر فی الواقعہ کوئی دستک دینے آیا ہوگا' تو اس کے پیروں کے نشان نم آلود مٹی پر ضرور دکھائی دے جائیں گے۔''

''پیروں کے نشان تو خود ہمارے بھی باہر موجود ہیں۔'' جان کلاز نے کہا۔ ''میری رائے میں ابھی باہر نکل کر کیوں نہ دیکھ لیا جائے۔''

''ٹھیک ہے' شبہ مٹ جائے تو اچھا ہی ہے۔'' میں نے دوبارہ اپنی رائفل اٹھالی۔

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ دروازہ پھر بجنے لگا تھپ..... تھپ..... تھپ..... پھر جیسے کسی کے دبے پاؤں چلنے اور کچھ فاصلے تک جانے کی آواز صاف سنائی دی۔

فرینڈیز نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا' ہم تینوں بھی نکل آئے وہاں کوئی نہ تھا' ہم نے ادھر اُدھر اچھی طرح جائزہ لیا۔ کیبن کے اردگرد کی زمین تیس تیس گز کے فاصلے تک گھاس پھونس اور جھاڑ جھنکاڑ سے صاف تھی۔ کوئی بھی شخص اتنے مختصر سے وقفے میں غائب نہ ہو سکتا تھا۔

''بخدا! میں نے خود اس کے بھاگنے کی آواز سنی ہے۔'' فرینڈیز نے خوف سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"بے شک میں نے بھی یہ آواز سنی۔" جان کلاز نے تائید کی۔ "سوال یہ ہے دستک دینے اور دروازہ کھلنے میں مشکل سے چند سیکنڈ کا وقفہ رہا ہوگا اور اتنی دیر میں انسان تو درکنار، کوئی جانور بھی ہماری آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوسکتا، پھر یہ کیا بلا تھی؟" صبح کاذب کا وہ ڈراؤنا سماں تیز ہوا کا شور، اونچے اونچے مہیب درختوں پر چڑھے ہوئے بندروں کی چڑ چڑ.....ایک ان جانے اور ان دیکھے دشمن کی دستک ہمارا جتنا بھی برا حال ہوتا کم تھا۔

"ممکن ہے یہ کوئی شریر بندر ہو۔" ماترو نے کہا "بعض اوقات بندر ایسی حرکتیں کرتے ہیں۔"

"یہ بھی ہوسکتا ہے کوئی بھوت پریت ہو۔" فرینڈیز کی مارے خوف کے گھگھی بندھ گئی۔ "میں نے سنا ہے ایسے ہیبت ناک اور منحوس جزیروں میں آوارہ روحیں بہت ہوتی ہیں۔"

"واہ میرے شیر واہ! بھلا بھوت پریت کو کیا ضرورت کہ بند دروازوں پر دستکیں دے۔ یار فرینڈیز! عقل باور نہیں کرتی کہ تم نے تین آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہوگا۔ بھوت ووت بالکل خیالی چیزیں ہیں۔ کم از کم میں تو انہیں مانتا نہیں۔"

فرینڈز! جواب میں کچھ کہنے والا تھا کہ ماترو کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخیں نکلنے لگیں اور اس نے دایاں ہاتھ اٹھا کر کچھ اشارہ کیا۔ پہلے تو ہم میں سے کوئی نہ سمجھا وہ کیا کہنا چاہتا ہے اور اس کے چیخنے کی وجہ کیا ہے مگر دوسرے ہی لمحے یہی حالت فرینڈز کی ہوگئی وہ بے ہوش ہوکر دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔ اتنے میں ماترو چیختا اور کانپتا ہوا کیبن میں گھس گیا۔ یکا یک جان کلاز نے میرا بازو پکڑ لیا اور حد درجہ لرزتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"وہ دیکھو پیپلن.....وہ.....اف.....خدا جانے یہ کیا بلا ہے؟"

میں نے اس کی انگلی کے اشارے پر نگاہ دوڑائی اور دہشت سے بدن میں خون جمنے لگا۔ میرے ہاتھ سے رائفل چھوٹ گئی۔ یہ نہیں کہہ سکتا جان کلاز کا کیا عالم تھا۔ اپنا حال یہ کہ پیروں میں جان نہ تھی۔ چیخنا چاہتا تھا مگر حلق سے آواز نہ نکلتی تھی۔ اسے نظر کا فریب بھی قرار نہیں دیا جاسکتا تھا۔

مجھ سے کوئی پندرہ فٹ کے فاصلے پر فضا میں ایک انسانی ہیولا تیر رہا تھا۔ کچھ سفید سفید کچھ سرمئی سرمئی رنگ کا انسانی ہیولا، جیسے دھوئیں کا بنا ہوا آدمی، دیکھتے دیکھتے وہ زمین پر اتر

آیا۔ اس کے بدن پر پرانا بوسیدہ لباس، سر پر تنکوں کا بڑا سا ہیٹ، چہرہ لمبوترا، رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئیں، طویل قامت، دبلا پتلا، ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ زمین پر رک کر اس نے آہستہ آہستہ دائیں بائیں گردن گھمائی جیسے کسی کو ڈھونڈتا ہو۔ پھر آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہماری جانب آنے لگا۔ جوں جوں وہ نزدیک آرہا تھا دل کے دھڑکنے کی رفتار کم ہوتی جاتی تھی۔ کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ تمام جسم کا خون سرد ہوکر جیسے دماغ میں جم گیا ہو، اتنا احساس ہے کہ جان کلاز بھی بل کھا کر گرا اور بے ہوش ہوگیا تھا۔

وہ ہیولا مجھ سے کوئی دس فٹ کے فاصلے پر آن کر رکا۔ اس کے لبوں پر نہایت کمزور تبسم نمودار ہوا، پھر اس نے ہاتھ سے ایسا اشارہ کیا جیسے مجھے اپنے قریب بلا رہا ہو۔ خدا کی پناہ، اتنے برس گزر جانے کے باوجود وہ ہیبت ناک منظر آج بھی تروتازہ ہے۔ میں بے حس و حرکت مٹی کے بے جان پتلے کی مانند اپنی جگہ کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ نہیں کہہ سکتا کہ وہ گوشت پوست کا جیتا جاگتا کوئی انسان تھا یا جزیرے کی آوارہ بھٹکتی ہوئی کوئی انسانی روح.....ایسی روح کہاں مگر کوئی آواز میرے کانوں تک نہ پہنچی.....اس کے بعد کیا ہوا مجھے کچھ یاد نہیں۔

آنکھ کھلی تو میں نے اپنے کو کیبن سے باہر پڑے پایا۔ خدا جانے مجھے کتنی دیر ہوچکی تھی۔ سورج کی بلندی سے اندازہ ہوا کئی گھنٹے گزر گئے ہیں۔ قریب ہی جان کلاز اور فرینڈیز کی لاشیں دکھائی دیں۔ میں نے انہیں آوازیں دیں مگر ان میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔ پہلا احساس یہی تھا کہ دونوں ختم ہوگئے۔ پھر ماترو کا خیال آیا اسے پکارا.....کوئی جواب نہ ملا.....میں نے اٹھنے اور اپنے جسم کو حرکت دینے کی انتہائی کوشش کی مگر بے سود.....ایسا معلوم ہوتا تھا میرے پیروں سے جان نکل چکی ہے۔ ذہنی اور جسمانی اذیت کے وہ لمحے میں مرتے دم تک بھول نہیں سکتا۔

یکا یک احساس ہوا کہ میرے اردگرد کچھ ذی روح موجود ہیں۔ گردن گھمانا تو ممکن نہ تھا، ٹیڑھی ترچھی نظروں سے دیکھا تو معلوم ہوا ہمارے دوست کوڑھی ہیں۔ ہماری خیر و عافیت معلوم کرنے آئے تھے۔ میں نے اس مجمع میں لاشونی کو پہچانا، زوساں کو دیکھا۔ انجلی بھی نظر آیا، لاپس بونا بھی ایک طرف کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ ان سب کی آنکھوں سے نفرت اور حقارت کا لاوا اُبل رہا تھا۔ میں نے دل میں کہا، لو بیٹا پیپلن، اب آئی موت۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

زوساں نے لاپس کو اشارہ کیا اور اس بدبخت نے آگے بڑھ کر نہایت اطمینان سے ہماری رائفلیں اٹھا کر زوساں کے قدموں میں ڈال دیں۔ پھر اس نے باری باری ہماری جیبوں میں ہاتھ ڈال کر تلاشی لی۔ وہاں کیا رکھا تھا۔ پھر اس نے ہمارے گلے کی رگوں کا جائزہ لیا غالباً وہ ''پلان'' ڈھونڈ رہا تھا۔ پلان ہمارے گلے میں موجود تھے۔ لاپس نے زوساں کی جانب دیکھ کر اثبات میں گردن ہلائی۔ گویا کہہ رہا ہو مطلوبہ چیز مل گئی۔

پھر وہ کیبن میں گیا۔ وہاں سے چیزیں الٹنے پلٹنے کی آوازیں آئیں۔ غالباً وہ ماترو کی تلاشی لے رہا ہوگا۔ یہ کمسن اور خوبصورت نوجوان نامعلوم جیتا ہے یا مر گیا' میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ بڈھے زوساں نے سمجھا شاید میں موت کے خوف سے رو رہا ہوں' مکروہ ہنسی ہنستے ہوئے بولا:

''اب کیوں روتے ہو موسیو' بہادر آدمی ڈر کر رویا نہیں کرتے۔''

میں نے جواب میں کچھ کہنا چاہا مگر زبان اتنی موٹی ہو چکی تھی کہ بولا ہی نہ گیا۔ لاشونی نے آگے بڑھ کر زوردار ٹھوکر میری پسلیوں میں ماری اور کرخت آواز میں کہا:

''پہلے ہمارا ارادہ تھا تمہاری مدد کریں اور تمہیں فوجی حکام کے قبضے میں نہ جانے دیں لیکن تم تو ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے۔ پٹھے پر ہاتھ ہی نہ دھرنے دیتے' بات بات پر ہم سب کو گولی سے اڑا دینے کے ارادے تھے۔ دیکھا ہمارا کرشمہ! ہم چاہیں تو تمہیں کتے کی موت ماردیں۔''

لاپس بونا ایک بار پھر نظر آیا۔ اس نے اپنا خنجر برآمد کر لیا تھا اور مجھے دکھا رہا تھا۔ میں نے یہی مناسب سمجھا ان منحوسوں کی شکلیں نہ دیکھوں۔ چنانچہ آنکھیں موند کر پڑا رہا۔ چند منٹ بعد احساس ہوا میرے ہاتھ پیر مضبوط رسیوں سے باندھے جا رہے ہیں۔ آنکھ کھولی تو اس احساس کی تصدیق ہوگئی۔ کوڑھی جنگل کے کونے کونے سے نکل کر کیبن کی جانب آ رہے تھے۔ ہر لحظہ ان کی تعداد بڑھتی گئی۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ میرے ساتھی زندہ سلامت ہیں۔ اگرچہ ان کی جسمانی حالت بالکل میرے ہی جیسی ہے۔

میری طرح انہوں نے ماترو' فرینڈیز اور جان کلاز کی بھی مشکیں کس لیں۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے یہ خبیث لوگ اب ہمارے ساتھ کیا کرنے والے ہیں۔ مجھے جس بات پر بار بار حیرت ہوئی وہ یہ تھی کہ گزشتہ رات میں نے اور میرے ساتھیوں نے جو کچھ دیکھا تھا کیا وہ

فریب نظر تھا یا کوئی حقیقت؟ دونوں صورتوں میں ہمارا جسمانی نظام بیکار ہو جانا تھا ہاں یہ ممکن ہے۔ جادو تو ایک حقیقت ہے مگر ایسا جادو؟

بڈھے زوساں کی قیافہ شناسی کی داد نہ دینا ظلم ہوگا۔ اس نے میرے بشرے سے تاڑ لیا کہ میں کسی فکر میں گم ہوں۔

''موسیو پیپلن' کہیئے آپ نے جو بھوت دیکھا وہ کیسا تھا؟ پسند آیا یہ تماشا؟ آپ کا خیال تھا ہم کوڑھی' اپاہج' ضعیف العمر لوگ آپ کا کیا بگاڑ لیں گے؟ یہی وجہ تھی کہ آپ بار بار رائفل اور گولی کی دھمکی دیتے تھے۔ شاید آپ کو علم نہیں کہ ایسے ایسے شعبدے میری جھولی میں بند ہیں۔ ایسے شعبدے جو میں مہذب دنیا میں پہنچ کر دکھاؤں' تو لوگ پاگل ہو جائیں۔ رات کے دھندلکے میں جو کچھ آپ اور آپ کے ساتھیوں نے دیکھا وہ سب میرے بائیں ہاتھ کا ایک کھیل تھا۔''

میری آنکھوں میں حیرت کے آثار پا کر وہ خوش ہوا اور کہنے لگا:

''اس عاجز کی عمر اس وقت سو برس کے لگ بھگ ہے۔ میں نے قدیم اور جدید دنیا کا بڑا حصہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ایسے ایسے علاقوں میں مہینوں برسوں رہا ہوں جن تک پہنچنے کا تصور بھی آپ جیسے احمق نہیں کر سکتے۔ ایسے ایسے مخفی علوم سیکھے ہیں جن کے سامنے موجودہ سائنس پانی بھرے۔ جو شعبدہ آپ نے دیکھا وہ معمولی نوعیت کا تھا۔ موقع ملا تو کچھ ایسے تماشے دکھاؤں گا جو آپ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پاگل کر دیں گے۔ فی الحال آپ لوگ آرام کریں۔ اس جزیرے کا نظم و نسق جس کونسل کے ہاتھ میں ہے وہی آپ کے بارے میں فیصلہ کرے گی' میرا کام صرف اس فیصلے کی توثیق کرنا ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے بونے کو عجب سا اشارہ کیا' اس نے میرا منہ کھول کر کسی کڑوے کسیلے مشروب کے چند قطرے حلق میں ٹپکائے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے آگ کی ایک لہر حلق سے لے کر معدے تک گہری لکیر ڈالتی چلی گئی ہو۔ میرے منہ سے چیخ نکلی پھر مجھے دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہ رہی۔

ہوش آیا تو اپنے آپ کو گہری تاریکی اور ٹھنڈ میں لیٹے ہوئے پایا۔ ایسا گھپ اندھیرا جہاں میں اپنی آنکھوں سے قریب کی شئے بھی دیکھنے سے قاصر۔ جسم کے مختلف حصوں سے درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ میرے ہاتھ پیر کھول دیئے گئے تھے۔ میں نے پھیپھڑوں کی پوری

قوت سے اپنے ساتھیوں کو آوازیں دیں مگر بے سود۔ جواب میں میری آواز ہی سنائی دی۔ اندازہ ہوا مجھے کسی گہرے یا تاریک غار یا کنویں میں پھینک دیا گیا ہے۔

اس اندھی اور سرد جگہ جہاں میں اپنے آپ کو بھی دیکھنے کے نا قابل تھا۔ وقت گزرنے کا احساس بھی ناپید تھا' کچھ خبر نہ تھی دن ہے یا رات..... دلچسپ بات یہ کہ بھوک پیاس بھی ندارد' زمین نرم اور گیلی لگی۔ وہاں کسی قسم کا گھاس پھول نہ تھا۔ میں بمشکل اٹھ کر کھڑا ہوا اور اندھوں کی طرح راستہ ٹٹولتا ہوا آگے بڑھا۔ میرا خیال تھا اگر یہ کوئی کنواں ہے تو ہاتھ دیوار سے ضرور ٹکرائے گا مگر نہیں..... اندازاً بیس بائیس فٹ چلنے کے باوجود میرا ہاتھ کسی دیوار سے نہ ٹکرایا میں واپس ہوا اور اندازے سے اتنا ہی فاصلہ الٹے قدموں طے کیا' ادھر بھی کوئی دیوار نہ تھی۔ غرض میں چاروں کھونٹ گھوما' میرے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ آئی۔ دہشت کی ایک نئی لہر میرے رگ و پے میں دوڑنے لگی..... خدایا: میں کہاں آ گیا؟ ایک بار پھر اپنی تنہائی کا احساس دور کرنے کے لیے خوب چیخا چلایا مگر جواب میں اپنی ہی صدائے بازگشت سنی۔ ایک بات کا بہر حال یقین ہو گیا کہ میں کنویں میں نہیں۔ کسی زمین دوز اور انتہائی وسیع و عریض گہرے غار میں ڈالا گیا ہوں۔ دفعتہً میرے سر کے اوپر تاریکی کا سینہ چیرتی ہوئی روشنی کی ایک ہلکی سی کرن سورج بن کر چمکی۔ یہ کرن آہستہ آہستہ بڑی ہوتی ہوئی مرے قریب آ رہی تھی۔ میری بصارت لوٹ آئی تھی اور میں دم سادھے ٹکٹکی باندھے اسے تک رہا تھا۔ یہ کرن نہیں تیل سے جلنے والی چھوٹی سی لالٹین تھی جو غار کے منہ سے میری جانب لٹکائی جا رہی تھی' شاید اس طرح انہوں نے مجھے بھی غار میں اتارا ہوگا۔

لالٹین فرش پر آن کر ٹھہر گئی۔ اس کے ساتھ ایک تھیلا بھی بندھا ہوا تھا' میں نے جلدی سے رسی پکڑ لی۔ لالٹین کھول کر ایک جانب رکھی' پھر تھیلا بھی کھولا۔ اس میں سوکھی روٹی کے ٹکڑے بھرے تھے' شیشے کی ایک بوتل میں پانی۔ اس تھیلے سے کاغذ کا ایک پرزہ بھی برآمد ہوا..... لالٹین کی روشنی میں اس پرزہ کاغذ پر نگاہ ڈالی۔ چند سطریں دکھائی دیں:

''موسیو پیپلن! کہیے کیا حال چال ہے۔ امید ہے آپ اس نئی دنیا میں خوش و خرم ہوں گے۔ میں نہ چاہتا تھا آپ کو یہ تکلیف دوں مگر آپ کے رویے نے مجھے مجبور کیا۔ بہر حال اسی میں آپ کی جان کی سلامتی کا راز پوشیدہ ہے..... آپ کے تینوں ساتھی بھی ٹھیک ٹھاک ہیں۔ یقین کیجیے جونہی بحری سپاہیوں کی ٹولی واپس ہوئی آپ کو اس غار سے نکال کر اسٹیمر پر

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

سوار کرا دیا جائے گا اس دوران میں آپ صرف اتنا کریں کہ اپنا ''پلان'' نکال کر اسی رسی سے باندھ دیں۔ میں چاہتا تو یہ ''پلان'' خود ہی حاصل کر لیتا۔ لیکن اس کے لیے استرے سے آپ کا گلا اور پھر معدہ چاک کرنا پڑتا۔ اسی تھیلے میں آپ ایک چھوٹی سی پنسل اور کاغذ کے ٹکڑے پائیں گے۔ انہیں سنبھال کر اپنے پاس رکھیے۔ جو پیغام مجھے یا اپنے ساتھیوں کو دینا چاہیں لکھ کر دے سکتے ہیں۔ یہ رسی ہر بارہ گھنٹے بعد لٹکائی جائے گی یہ غار ہم نے حشرات الارض سے پاک کر دیا تھا۔ آپ اطمینان قلب سے قیام فرمائیں۔ یہ لالٹین آپ کی نذر ہے۔ جی چاہے تو بجھا دیں۔ جی چاہے تو جلا لیں۔ اسی تھیلے میں ماچس کی ڈبیا آپ کو ملے گی۔ اگر پڑھنے کا شوق ہو تو میں چند دلچسپ ناول روانہ کروں گا۔ آپ کا خادم زوساں۔''

ظالم نے خط کیا لکھا تھا' طنز کے بے پناہ نشتر چلائے تھے۔ اپنی بے بسی کا خیال کر کے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے حلق سے پلان برآمد کیا جس میں تین ہزار فرانک کی رقم تھی۔ یہ نکلی رسی سے باندھ کر جھٹکا دیا۔ فوراً رسی کھینچی جانے لگی اور چند لمحوں بعد نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

زوساں نے اپنے وعدے کے مطابق فرانسیسی زبان کے دو پرانے اور بوسیدہ سے ناول رسی میں باندھ کر میرے پاس بھجوا دیئے تھے۔ مجھے پڑھنے کا ذوق کبھی نہ تھا۔ انہی ناولوں نے پڑھنے کی طرف مائل کیا۔ ان میں سے ایک ناول گائی ڈی موپساں کا اور دوسرا وکٹر ہیوگو کا تھا۔ جوں جوں میں یہ کتابیں پڑھتا میری دلچسپی بڑھتی جاتی۔ وقت گزارنے کا یہ سامان خوب تھا۔ بارہا میں نے اپنے ساتھیوں کو تحریری پیغام بھیجے اور جواب وصول کیے۔ معلوم ہوا انہیں بھی کسی ایسے ہی غار میں ایک دوسرے کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ کم بخت زوساں پر پہلی بار مجھے سخت طیش آیا۔ آخر مجھے بھی اپنے ساتھیوں ہی میں رہنے دیتا تو کون سی قیامت آ جاتی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ جان کلاز کا پلان بھی زوساں نے حاصل کر لیا ہے۔ اس پلان میں تین ساڑھے تین ہزار فرانک کی رقم بند تھی۔ گویا اس شیطان کی اولاد زوساں نے ہم سے ساڑھے چھ ہزار کی رقم مفت میں ٹھگ لی تھی۔ اب رہا اسٹیمر کا معاملہ جہاں جان کے لالے پڑے ہوں وہاں اسٹیمر کی پروا کون کرتا ہے؟ یہی بڑا کرم ہوگا اگر یہ کوڑھی بدمعاش ہماری جانیں بخش دیں۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

میرے اندازے کے مطابق ایک ہفتہ بیت گیا یوں لگا جیسے صدی گزر گئی ہو۔ بعض اوقات بے اختیار جی چاہتا کسی سے بات کروں' ہنسوں' قہقہے لگاؤں مگر وہاں کوئی ہمدم اور دمساز نہ تھا۔ مجبور ہو کر عالم وحشت میں لالٹین سے باتیں کرتا۔ اپنے آپ سے گھنٹوں ہم کلام رہتا۔ نادیدہ دوستوں کی یاد ستاتی تو ان سے مخاطب ہوتا۔ قید تنہائی جیسا عذاب خدا کسی کو نہ دے۔ کم از کم میرا تاثر یہی ہے۔

ایک دن جبکہ میں وکٹر ہیوگو کے ناول میں کھویا ہوا تھا اوپر سے رسی کسی سانپ کی مانند بل کھاتی ہوئی گری۔ اس میں صرف ایک کپڑا بندھا تھا۔ میں نے یہ کپڑا کھولا' ایک تازہ روٹی دھری تھی۔ روٹی کے اوپر ہی رقعہ موجود تھا' لکھا تھا:

''موسیو' خدا کا شکر ہے آپ کی رہائی کا وقت آ گیا۔ ساحل خالی ہو چکا ہے' چند گھنٹوں بعد ایک دوسرا رسہ لٹکایا جائے گا۔ آپ اسے اچھی طرح پکڑ لیجیے گا' ہم آپ کو باہر کھینچ لیں گے...... براہ کرم لالٹین ساتھ لانا مت بھولیے۔''

✣ ✣ ✶ ✣ ✣

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

......5......

مجھے جب غار سے باہر نکالا گیا اور سورج کی روشنی میری آنکھوں پر براہ راست پڑی' تو یوں لگا جیسے بے شمار سوئیاں میری آنکھوں میں گھونپ دی گئی ہوں۔ اور پھر جسم کے دوسرے حصے یوں جل اٹھے گویا مجھے تندور میں پھینک دیا گیا ہو۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا اور کٹے ہوئے بکرے کی طرح زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔

ہوش آیا تو ایک بار پھر تاریکی اور ٹھنڈ کے سمندر میں اپنے آپ کو ڈوبے ہوئے پایا۔ وہ کرب انگیز ذہنی خلا اب بھی میرے ساتھ تھا جس نے سوچنے سمجھنے اور دیکھنے کی تمام حسیں چھین لی تھیں۔ آنکھوں پر بے اختیار ہاتھ پھیرا تو پتہ چلا ان پر کس کر پٹیاں باندھ دی گئی ہیں۔ ان پٹیوں پر ہاتھ لگتے ہی وہ ذہنی خلا ایک دم غائب ہو گیا اور پہلا خیال یہ دماغ میں آیا کہ ہمیشہ کے لیے آنکھیں جاتی رہیں۔ یہ خیال اتنا قوی تھا کہ میں نے زور زور سے چلانا اور رونا شروع کر دیا۔ یکا یک قریب ہی قدموں کی آہٹ ہوئی پھر کسی نے آہستہ سے کہا:

''موسیو پیپلن ' کیا بات ہے' کیا بدن میں درد ہو رہا ہے؟''

میں نے آواز پہچان لی' یہ تو ماترو تھا۔

''ماترو'' میں نے حلق پھاڑ کر کہا'' یہ بتاؤ کیا میں ہمیشہ کے لیے اندھا ہو چکا ہوں؟''

''نہیں موسیو پیپلن' آپ کے دشمن اندھے ہوں۔ آپ کی آنکھیں بالکل ٹھیک ہیں۔ غار کی تاریکی میں اتنے دن رہنے کے بعد چونکہ آپ باہر آئے تھے' اس لیے سورج کی روشنی برداشت نہ کر پائے۔ اسی سبب سے آپ کو اس تاریک کوٹھڑی میں رکھا گیا ہے اور آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا' تو آپ کی بینائی کے متاثر ہونے کا خطرہ تھا۔''

''ادھر آؤ ماترو...... اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دو۔ خدا کی پناہ! تم نے ہمارے ساتھ کس قدر تکلیف اٹھائی ہے۔ باقی لوگ کہاں ہیں؟ کیا وہ خیریت سے ہیں؟''

''ہاں موسیو.....'' ماترو نے محبت سے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے جواب دیا'' کلاز اور فرینڈیز ٹھیک ہیں۔ کوڑھیوں نے ہمیں ایک ہی جگہ رکھا تھا' قید کے دوران انہوں نے ہمیں کوئی تکلیف نہیں دی۔ ان کا سردار زوساں بہت اچھا آدمی ہے۔ یہ ہماری خطا تھی کہ ہم نے ان پر اعتماد نہ کیا۔ زوساں نے ہمیں کئی شعبدے ایسے دکھائے کہ عقل اب تک باور نہیں کرتی کہ ایسا ممکن ہے وہ کہتا ہے یہ شعبدے اس نے افریقہ کے جنگلوں میں برسوں وحشی قبائل کے ساتھ رہ کر سیکھے ہیں اور کئی بار اسے اپنی جان کو بھی داؤ پر لگانا پڑا ہے۔ اپنے کیبن میں جس روح کو ہم نے آسمان سے اترتے دیکھا تھا وہ بھی زوساں ہی کی بلائی ہوئی روح تھی۔ ایسی بہت سی روحیں وہ جب چاہے طلب کر سکتا ہے۔''

وہ دیر تک زوساں کے کارناموں اور جادو کے کرشموں کا ذکر کرتا رہا۔ اس نے بھی بتایا کہ اس طلسم کو ووڈو (vodoo) کہتے ہیں اور مشرقی افریقہ کے وحشی قبائل میں یہ فن عام ہے۔ اس کے علاوہ بے شمار جڑی بوٹیاں ایسی ہیں جن کے انسانی بدن اور روح پر عجیب و غریب اثرات پڑتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ہمارے جسم بے حس و حرکت ہو گئے تھے۔ ہم صرف آوازیں سن رہے تھے لیکن جسم کو حرکت نہ دے سکتے تھے۔ دراصل ہمارے پینے کے پانی میں اس رات سنٹر میں ہماری غیر حاضری کے دوران بعض جڑی بوٹیوں کا سفوف ملا دیا گیا تھا۔

''ذرا سوچیے موسیو.....ہم چوہوں کی مانند ان کوڑھیوں کے بنائے ہوئے پھندے میں پھنس گئے تھے اور اگر یہ لوگ چاہتے' تو ہمیں بڑی آسانی سے موت کے منہ میں اتار دیتے۔''

''بے شک'' میں نے کہا۔ ''ہم سے بڑی حماقت ہوئی کہ ہم نے خواہ مخواہ انہیں دشمن سمجھ لیا۔ دراصل میکس برٹین نے ان لوگوں کے بارے میں اپنے جو تجربات ہمیں بتائے تھے اس کے سبب ہمیں مغالطہ ہوا۔ ممکن ہے اس کے علم میں جو باتیں آئیں وہ ایسی ہی ہوں گی جن سے ان کوڑھیوں کے کردار اور عمل کے بارے میں شک پیدا ہو جاتا ہو۔''

''زوساں کہہ رہا تھا کہ ساحل فوجی سپاہیوں اور نگرانوں سے خالی ہو چکا ہے اور ہمارا وہ اسٹیمر بھی تیار ہے جس پر ہمیں سمندر کا سفر کرنا ہے۔ انہوں نے ضروری سامان کی اچھی خاصی مقدار ہمیں دینے کے لیے جمع کر لی ہے۔ ممکن ہے آج رات یا کل کسی وقت وہ ہمیں الوداع کہیں۔''

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

یہ خبر میرے لیے خوشی کا باعث تھی۔ میں نے جلدی سے پٹی نوچ ڈالی۔ آنکھیں کھولیں۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک دس فٹ لمبی اور چھ فٹ چوڑی کوٹھڑی میں زمین پر لیٹا ہوں' قریب ہی ماترو بیٹھا ہے۔ اس کی شکل صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اتنے میں کچھ اور لوگ وہاں آ گئے۔ میں نے جان کلاز اور فرینڈیز کو فوراً پہچان لیا۔ انہوں نے مجھے اٹھایا اور لپٹ کر سسکیاں بھرنے لگے۔ پھر انہوں نے ایک تھیلے میں سے تازہ روٹیاں' مکھن اور بھنے ہوئے گوشت کے پارچے نکالے۔ ہم نے بہت دن بعد پہلی مرتبہ اتنا لذیذ کھانا پیٹ بھر کر کھایا۔ معلوم ہوا کہ لاشونی اور اس کے دو تین ساتھی کوٹھڑیوں کے باہر موجود ہیں۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ سنٹر میں زوساں ہمارا منتظر ہے۔ باہر نکلنے سے پہلے میں نے آنکھوں پر گہرے کالے شیشوں کا وہ چشمہ چڑھا لیا جو زوساں نے خاص طور پر میرے لیے بھیجا تھا۔

سنٹر میں کوڑھیوں نے ہمارا استقبال کیا۔ زوساں نے نرم لہجے میں ان تمام اقدامات کی معذرت طلب کی جو اسے ہماری سرکشی اور گستاخی کے سلسلے میں مجبوراً اٹھانے پڑے تھے۔ پھر ایک جماعت کے ساتھ ہم سمندر کی طرف گئے' سورج کی تیز دھوپ ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔

''خدا کرے یہ سفر آپ کے لیے مبارک ثابت ہو!'' زوساں نے کہا۔ ''ہم نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ جس کشتی میں آپ سینکڑوں میل کا سفر کریں وہ ہر طرح مضبوط اور قابل اعتماد ہو۔ امید تو یہی ہے کہ آپ کسی تردد کے بغیر اپنی منزل پر پہنچ جائیں گے۔ ایک بار آپ گہرے سمندر میں پہنچ گئے تو سمجھ لیجیے خطرہ ٹل گیا۔ پھر کوئی آپ کا تعاقب نہ کرے گا۔''

یہ سولہ فٹ لمبا' بالکل نیا' بے حد مضبوط بادبانی اسٹیمر تھا۔ بادبان اور اس کے رسے سب نئے تھے۔ اس کے درمیان میں کپڑے کا بنا ہوا ایک چھوٹا سا کیبن بھی تھا۔ کیبن کے اندر لکڑی کے دو نفیس اسٹریچر پڑے تھے اور ان پر باقاعدہ بستر بچھا دیئے گئے تھے۔ پینے کے پانی کے دو بڑے بڑے ڈرم بھی اسٹیمر کے دائیں بائیں لوہے کے مضبوط کڑوں کے ذریعے اس طرح باندھے گئے تھے کہ اسٹیمر کی حرکت ان پر اثر انداز نہ ہو اور وہ ٹوٹنے نہ پائیں۔ لکڑی کے ایک بڑے سے ڈبے میں انہوں نے تقریباً دو سو ابلے ہوئے مرغی کے انڈے' ایک اور ڈبے میں ساٹھ پونڈ وزنی دو زندہ کچھوے اور سارڈین مچھلیوں سے بھرا ہوا ایک بڑا تھیلا بھی ہمیں دکھایا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

''میرا خیال ہے' راستے کے لیے یہ خوراک آپ چار آدمیوں کو کافی ہوگی۔'' زوساں نے کہا۔ ''اس کے علاوہ تیل سے جلنے والا ایک چولہا' تیل سے بھرا ہوا ایک کنستر اور عمدہ چاولوں کا ایک پیکٹ بھی رکھ دیا ہے۔ یقین کیجیے یہ سارا وہ سامان ہے جو گزشتہ روز ہمارے استعمال کے لیے کیمپ سے بھیجا گیا تھا اور یہ جذام کے جراثیم سے بالکل پاک ہے۔ ممکن ہے آپ کو راستے میں ضرورت پڑے اس لیے ہم نے ''فرسٹ ایڈ'' کا سامان بھی رکھ دیا۔ یہاں سے سوڈیڑھ سو میل دور نکل جانے کے بعد آپ سمندر کے اس حصے میں پہنچیں گے جہاں شارک مچھلیوں کی حکومت ہے۔ یہ مچھلیاں آدم خور ہیں اور بے شمار مفرور قیدیوں کے گوشت سے اپنا پیٹ بھر چکی ہیں۔ دن کے وقت یہ آپ کے اسٹیمر کے زیادہ نزدیک نہ آئیں گی۔ ان کا حملہ رات کی تاریکی میں ہوگا۔ آپ کے لیے دو ہارپون اور سوفٹ لمبی مضبوط رسی اسٹیمر میں موجود ہے' شارک اس ہتھیار سے خوف کھاتی ہے۔ رسی کا سرا مستول سے خوب اچھی طرح باندھ کر ہارپون پھینکئے گا۔ بعض اوقات کوئی بہت طاقت ور مچھلی ہارپون سمیت اپنے شکار کو گھسیٹ کر لے جاتی ہے لہٰذا یاد رکھیے کہ ہارپون پھینکتے ہی رسی کو آپ کے دو ساتھی سختی سے تھام لیں اور تیسرا آدمی اسٹیمر کو سنبھالے رہے۔ اکثر اوقات یہ خونخوار مچھلیاں کشتی یا اسٹیمر کو دھکا دے کر الٹنے کی کوشش کرتی ہیں اس سے بچاؤ کے لیے آپ کو یہ دھیان رکھنا ہوگا کہ مچھلی اسٹیمر کے نیچے یا قریب نہ آنے پائے۔ دن رات آپ کو چوکنا رہنا پڑے گا۔ کبھی کبھی یہ اپنے شکار کا تعاقب سو سو میل تک کرتی ہیں۔ ہاں' اس دوران میں اگر طوفان آ جائے تو یہ کشتی کا تعاقب ترک کر کے گہرے پانیوں میں پناہ لیتی ہیں۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر آپ دور نکل سکتے ہیں۔ یہ ایک رائفل بھی آپ کی نذر ہے۔ مجھے افسوس ہے بقیہ دو رائفلیں آپ کو نہ دے سکوں گا۔ ان کی ہمیں ضرورت ہے۔ ویسے آپ کو اس رائفل کی ضرورت نہیں پڑے گی۔''

وہ دیر تک ہمیں نصیحتیں کرتا رہا' ہم سب خوف اور حیرت کی حالت میں اس کی تقریر سن رہے تھے۔ میرے لیے یہ بالکل پہلا اتفاق تھا' کسی خطرناک سمندر میں محض اپنے بھروسے پر سفر کرنے کا۔ ہم میں سے کوئی بھی سمندری سفر کا ماہر تو درکنار معمولی سا تجربہ بھی نہ رکھتا تھا۔ پھر ہر دم سمندری بلاؤں کا خوف' طوفانوں کی دہشت' پکڑے جانے کا ڈر..... نامعلوم منزلوں کا سفر یوں بھی دل ہلا دینے والا ہوتا ہے۔ کچھ پتہ نہ تھا' ہم پر کیا گزرنے والا ہے'

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

میرے ساتھی خوف سے بے حال تھے۔ ماترو کی ٹانگیں برابر کانپ رہی تھیں' جان کلاز کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑ رہی تھیں اور فرینڈیز کی پیشانی پسینے سے تر تھی۔ خود میرا حال یہ تھا کہ بار بار کلیجہ بیٹھنے لگتا۔ زوساں کی آواز کہیں دور سے آتی سنائی دے رہی تھی' اس نے ایک شخص کو اشارہ کیا۔ وہ آگے آیا۔

''یہ صاحب سمندری اسرار و رموز کے ماہر ہیں۔'' زوساں نے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا'' اب یہ آپ کو تفصیل سے بتائیں گے کہ راستے میں آپ کو کیا کرنا ہے اور سمندر کے مزاج کا کس طرح خیال رکھنا ہے۔ جو لوگ سمندر کے مزاج کا خیال نہیں کرتے' سمندر ان سے بھیانک انتقام لیتا ہے..... بہرحال۔''

''لیجیے ابھی سمندر کا انتقام باقی ہے۔'' میں نے دل میں کہا' میرے سامنے جو شخص کھڑا تھا اس کا دایاں حصہ مفلوج نظر آیا۔ پیر کے انگوٹھے سے لے کر داہنی آنکھ تک تمام جسم بے کار۔ حیرت کی بات یہ کہ داہنی آنکھ کی پتلی گھومی نہ تھی لیکن اس کی روشنی بدستور قائم تھی۔ ٹھہری ہوئی یہ پتلی شیشے کی آنکھ معلوم ہوتی تھی۔

''موسیو' خدا کرے سمندر آپ پر مہربان ہو!'' اس نے بھاری اور ازحد سنجیدہ لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ''آپ دنیا کے انتہائی خطرناک اور جان لیوا سمندر میں سفر کرنے والے ہیں۔ آج سہ پہر تین بجے کے بعد سمندر میں جزر پیدا ہونے لگے گا۔ چھ بجے تک پانی خاصا گھٹ جائے گا۔ آپ اس دوران میں چپوؤں کی مدد سے اپنی کشتی کھلے سمندر میں لے جا سکتے ہیں۔ جوں جوں رات بھیگے گی' سمندر میں مد آنے لگے گا۔ مزید تین گھنٹے بعد مد کی یہ حالت اپنے عروج پر پہنچ جائے گی۔ اس وقت آپ چپوؤں سے بے نیاز ہو جائیں گے۔ پھر آپ بادبان کھول دیں' ہوا آپ کو ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے شمال کے رخ لے جائے گی۔ ساری رات آپ سفر کریں گے' صبح سورج طلوع ہونے سے کچھ پہلے سمندر پھر پرسکون ہو جائے گا اور آپ کی کشتی یکے بعد دیگرے دو ویران اور بے آب و گیاہ جزیروں کے قریب سے گزرے گی۔ فوجی سپاہیوں کے موٹر بوٹ ان جزیروں تک مار کرتے ہیں مگر آپ کے پاس ایک رائفل اور بہت سے کارتوس ہیں۔ جونہی آپ کی جانب سے فائرنگ شروع ہوگی۔ یہ فوجی اپنی موٹر بوٹ کا رخ پھیر کر بھاگ نکلیں گے۔ اگر ان کا اور آپ کا آمنا سامنا ہو جائے اور وہ بھاگ نکلیں تو پھر آپ جزیرے پر قیام کرنے کا ارادہ ترک کر دیں۔ ہوسکتا ہے وہ آپ کے قیام کے دوران میں کمک لے کر آ جائیں پھر آپ ان سے نہ بچ سکیں گے۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

دن کو سفر کرتے وقت آپ سورج سے مدد لیں اور رات کو ستاروں سے۔ قطب نما سے..... ہر صورت میں آپ کا رُخ شمال مغرب کی طرف ہونا چاہیے۔ تبھی آپ وینز ویلا اور کولمبیا پہنچ سکیں گے اور اگر خدانخواستہ بھٹک گئے تو پھر میں نہیں کہہ سکتا آپ کا کیا حشر ہوگا۔ بس خدا آپ پر رحم کرے!..... ڈچ گیانا میں پناہ لینے کی غلطی نہ کیجیے گا۔ وہاں سے آپ کو فوراً گرفتار کر کے بیگنی کے جہنم میں جھونک دیا جائے گا' البتہ برٹش گیانا میں آپ کو پناہ مل سکتی ہے۔ ان کے اور گورنمنٹ کے درمیان قیدیوں کے تبادلے یا واپسی کا کوئی معاہدہ نہیں ہے۔ ٹرینیڈاڈ میں آپ صرف دو ہفتے قیام کریں پھر وہاں سے نکل کر جدھر سینگ سمائیں چلے جائیں۔ ٹرینیڈاڈ میں خرکاروں کے بہت سے گروہ کام کر رہے ہیں جو مفرور قیدیوں کا سراغ لگا کر انہیں پکڑ لیتے ہیں اور بیگنی کیمپ میں پہنچا دینے کا ڈراوا دے کر ان سے بیگار لیتے ہیں۔ ایک مرتبہ ان خرکاروں کے ہتھے چڑھ جانے کے بعد ان سے نجات پانا ناممکن ہے۔ ٹرینیڈاڈ سے نکل کر برٹش گیانا کے خوبصورت شہر جارج ٹاؤن میں رُک سکتے ہیں۔ سمندر میں چار روز تک مسلسل شمال کی طرف سفر کیجیے۔ اس کے بعد شمال مغرب کی جانب.....''

یہ تفصیلات سننے کے بعد رہا سہا عزم و حوصلہ بھی رخصت ہوا۔ موت سامنے کھڑی مسکرانے لگی۔

سہ پہر کے تین بجے جب ہم اپنے اسٹیمر پر اس ہولناک سفر کے لیے سوار ہوئے تو مجھے ایک فی صد بھی اپنے اور اپنے ساتھیوں کے بچ جانے کا یقین نہ تھا۔ زوساں نے ہمیں رخصت کرتے وقت توقع کے خلاف ایک اور کرم کیا..... اس نے اپنی جیب سے وہ ''پلان'' نکالا جو جان کلاز کی ملکیت تھا۔ اس میں تین ہزار فرانک کی رقم محفوظ تھی۔ اس نے یہ پلان ہمارے حوالے کرتے ہوئے کہا:

''یہ آپ کی امانت ہے' اسے وصول کر لیجیے۔ ہم نے آپ سے اسٹیمر کی فروخت کا جو معاہدہ کیا تھا' اس سے زیادہ ایک فرانک بھی لینا نہیں چاہتے۔''

پلان وصول کرتے ہوئے ہماری آنکھوں میں تشکر کے آنسو تھے' اتنے میں لاشونی آگے بڑھا اور اس نے ایک تھیلی ہمیں دی۔ موسیو' یہ ہماری جانب سے حقیر نذرانہ قبول فرمایئے۔ افسوس ہم کوڑھیوں کے پاس صرف اس قدر رقم فالتو تھی۔ زیادہ ہوتی تو ہم وہ بھی آپ کی خدمت میں پیش کر دیتے۔ ہم نے چندہ کر کے جمع کی ہے۔''

ہم سب دم بخود تھے' میں نے تھیلی کھول کر رقم گنی' آٹھ سو فرانک کچھ نوٹوں اور کچھ سکوں کی شکل میں۔

''میں اپنی اس بدزبانی کی بھی دست بستہ معافی چاہتا ہوں جو طیش کے عالم میں میں نے آپ سے کی تھی۔ ہم معذور منحوس کوڑھی موت کی دہلیز پر بیٹھے ہیں اور بہت جلد اس دنیا سے رخصت ہونے والے ہیں لہٰذا اللہ کے واسطے جو زیادتیاں ہم سے ہوئیں وہ معاف کر دیجیے۔''

''معافی تو ہمیں آپ سے طلب کرنی چاہیے۔'' جان کلاز نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ آپ اتنے فیاض' اتنے عظیم اور اتنے رحم دل ہوں گے۔''

آنسوؤں اور دعاؤں کی بارش میں ہم نے اپنے اسٹیمر کو حرکت دی۔ سمندر اس وقت جزر کی حالت میں تھا۔ درخت چپ چاپ اور ہوا بند' لہریں بار بار آتیں اور کوڑھیوں کے قدم چوم کر واپس چلی جاتیں۔ دفعتہً لاپس بو نا وارد ہوا۔ اس کا سانس بری طرح پھولا ہوا تھا۔ ساحل پر آتے ہی اس نے کپڑوں میں لپٹی ہوئی کوئی چیز ہمارے اسٹیمر کے اندر پھینکی اور چلا کر بولا:

''موسیو' اس حقیر بونے کی طرف سے یہ ادنیٰ تحفہ قبول فرمایئے۔''

میں نے لپٹا ہوا کپڑا کھولا' یہ وہی چمکدار خنجر تھا جو میں نے اس بونے سے چھین کر اپنے پاس رکھ لیا تھا اور اس نے دوبارہ اس وقت حاصل کیا جب میں اور میرے ساتھی زوساں کے طلسم میں گرفتار ہو کر سکتے کے عالم میں تھے۔

جوں جوں ہمارا اسٹیمر ساحل سے دور ہٹ رہا تھا' کوڑھیوں کے چہرے دھندلانے لگے۔ پھر آہستہ آہستہ گہری دھند نے جزیرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اب ہم سمندر میں تھے۔ سورج مغرب کی طرف ڈھل رہا تھا اور ہمارے سامنے حد نگاہ تک شمال اور شمال مغرب کی جانب چٹانوں کا طویل سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔

ڈھائی گھنٹے تک ہم چپو چلاتے رہے۔ جان کلاز ابھی کمزور تھا اور ماترو کے بازو زیادہ طاقت ور نہ تھے اس لیے چپو چلانے کا فریضہ میرے اور فرینڈیز کے سپرد ہوا۔ جونہی سورج کا آتشیں گولہ مغرب کے سینے میں دھنسنے لگا ہوا ایک دم تیز ہو گئی۔ سمندر کا رنگ بدل گیا اور

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

اونچی اونچی شوریدہ سر لہریں اسٹیمر سے ٹکرانے لگیں۔ اب ہم نے دوسرا بادبان بھی کھول دیا۔ چپو ہاتھ سے رکھ دیئے' بادبانوں میں ہوا بھری' وہ غبارے کی مانند پھول گئے اور ان کے پھولتے ہی اسٹیمر دگنی رفتار سے شمال کی جانب چلنے لگا۔

جان کلاز نے مجھے سگریٹ دیا۔ میں نے کش لگایا' کچھ جان میں جان آئی۔ چپو چلا چلا کر میں اور فرینڈیز پسینے میں نہا گئے تھے۔ سورج غروب ہوتے ہی ہمیں سردی لگنے لگی جو لحہ بہ لحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ ہم نے گرم کپڑے نکال کر پہن لیے اور کیبن کے اندر پناہ لی۔ یہاں ہم اس پھوار سے بچ گئے جو لہروں کے ٹکرانے کے باعث اسٹیمر کے اردگرد اٹھ رہی تھی۔

''ہم کتنی دور نکل آئے ہوں گے؟'' ماترو نے پوچھا۔

''غالباً چالیس پچاس میل۔'' جان کلاز نے جواب دیا۔ ''دراصل میں شروع ہی سے رفتار کا حساب لگا رہا ہوں۔ اگر ہم اس رفتار سے چلتے رہے اور راہ میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئی تو چھٹے دن خدا نے چاہا تو برٹش گیانا پہنچ جائیں گے۔''

''آمین!'' ماترو نے بڑے خلوص سے کہا' میں نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی' شام کے سات بج رہے تھے۔ یہ رسٹ واچ بھی ہمیں قطب نما کے ساتھ ہی زوساں کی جانب سے دی گئی تھی۔ ہم اپنے ان کوڑھی دوستوں کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ ماترو نے جلدی سے تیل کا چولہا جلایا۔ اس چولہے کو کیبن کے اندر ایک طرف لکڑی کے تختے میں اس طرح گاڑا گیا تھا کہ اسٹیمر کے ہچکولے اس پر اثر انداز نہ ہو سکتے تھے۔ پندرہ منٹ میں چاول اُبل گئے۔ پھر اس نے نمک مرچ ڈال کر مچھلی کا شوربہ تیار کیا۔ ایسا لذیذ اور پرلطف کھانا سمندر کی لہروں پر بہتے ہوئے کھایا گیا جس کا مزا کبھی نہ بھولے گا۔ کھانے کے بعد قہوہ بنایا گیا۔ گرم گرم قہوہ پیا تو دن بھر کی تکان اتری۔ اس کے بعد تمباکو نوشی کا دور چلا۔ کچھ دیر کے لیے ہر شخص نے اس مصیبت کو فراموش کر دیا جس میں وہ گرفتار تھا۔ باتوں' لطیفوں اور قہقہوں کے طوفان میں یوں لگا جیسے ہم فرنچ گیانا کے ہولناک سمندر کے مسافر نہیں' پیرس' کے دریائے رائن میں ''پکنک'' پر آئے ہوئے کالج کے لڑکے ہیں۔

ابھی ہم جی بھر کر ہنسنے بھی نہ پائے تھے کہ عین افق کے اس مقام سے جہاں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ پیشتر سورج نے پناہ لی تھی' کالے کالے طوفانی بادلوں نے سر اٹھایا اور لمحوں کے اندر اندر آسمان کا نصف سے زیادہ حصہ گھیر لیا' روشن اور چمک دار تارے ایک ایک کر کے گھٹاؤں

نے نگل لیے' بجلی کا زبردست کڑاکا عین ہمارے سروں کے اوپر ایسا ہوا کہ دل دہل گئے۔ اندھیرا اتنا گھپ کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے۔ ہوا اور تیز ہو گئی' بجلی بار بار لہرانے اور کوندنے لگی۔ بادل کی گڑگڑاہٹ سے کانوں کے پردے پھٹنے لگے۔ ہم سہم کر کیبن کے اندر چوہوں کی طرح دبک گئے اور اسٹیمر کو خدا کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ ایسی تند اور تیز بارش ہم میں سے کسی نے پہلے نہ دیکھی تھی۔ اس پر طرہ یہ ہوا' سمندر پر برسنے والا پانی کس قدر مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔

کینوس کا بنا ہوا کیبن بارش روکنے میں ناکام رہا' ہم سب بری طرح بھیگ گئے اور سردی سے کانپنے لگے۔ ہر شخص دوسرے کے دانت بجنے کی آواز بخوبی سن سکتا تھا۔ ہم نے ہمت کر کے پتلی رسی کی مدد سے چند پھٹے پرانے کمبل کیبن پر باندھے' اس نے پانی کی بوچھاڑ روکی اور ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔ پھر اس طوفان میں چولہا دوبارہ جلایا' بچا ہوا قہوہ گرم کر کے پیا' جسموں میں گرمی آئی اور ہم دل ہی دل میں خدا کو یاد کرنے لگے۔ ایک لمحے کے لیے بھی بارش نہ تھمی' بجلی کی کڑک چمک اور بادلوں کی گرج اسی طرح دل دہلا رہی تھی۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا جیسے ہمارے اوپر بجلی گرنے ہی والی ہے۔ اسٹیمر ہوا سے باتیں کرتا اڑا جا رہا تھا۔ اس کی رفتار بہت تیز تھی۔ دائیں بائیں ڈولتا اچھلتا اور بپھری ہوئی لہروں کا مقابلہ کرتا وہ ہمیں ایک ان جانی سمت میں لیے جا رہا تھا..... جان کلاز کے اندازے کے مطابق اسٹیمر کی رفتار کسی طرح تیس میل فی گھنٹہ سے کم نہ تھی۔

''بارش تو رکنے کا نام ہی نہیں لیتی۔'' فرینڈیز نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا' ''خدا جانے ہم کدھر جا رہے ہیں۔'' ابھی الفاظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ ایک زبردست لہر اسٹیمر سے ٹکرائی۔ یہ ضرب اتنی شدید تھی کہ اسٹیمر تقریباً بائیں جانب پینتالیس درجے کے زاویے پر جھک گیا' بجلی چمکی اور اس ایک ثانے کے لاکھویں حصے کے وقفے میں ہم نے دیکھا کہ ایک بہت بڑی وہیل مچھلی سمندر میں اٹھکیلیاں کرتی چلی جا رہی ہے اس کا رخ مشرق سے مغرب کی طرف تھا۔

''خدا کی پناہ! یہ پہاڑ ہے یا وہیل؟'' جان کلاز چلایا۔

ہم سب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سمندر کو گھور رہے تھے۔ بجلی دوبارہ کوندی اور ہم نے پھر اس دیو پیکر وہیل کو دیکھا وہ غوطے لگاتی' ہمارے اسٹیمر سے کوئی ایک فرلانگ کے فاصلے پر

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

گزر رہی تھی۔ کبھی اس کا غار سا منہ دکھائی دیتا کبھی حرکت کرتی ہوئی دم۔ وہیل کی اس حرکت کے باعث اونچی اونچی لہریں اور بھنور اسٹیمر سے ٹکرا رہے تھے۔ میرا خیال ہے اگر اسٹیمر مضبوط نہ ہوتا تو اس کے پرخچے کبھی کے اڑ گئے ہوتے۔ وہیل کی لمبائی محتاط انداز کے مطابق اسی فٹ سے کچھ زیادہ ہی ہوگی۔

''اب یہ سینکڑوں میل تک اسی طرح ابھرتی اور غوطے کھاتی چلی جائے گی۔'' جان کلاز نے بتایا' ''یہ بھی ممکن ہے اس کے تعاقب میں وہ خونخوار چھوٹی چھوٹی مچھلیاں لگی ہوں جو وہیل کے گوشت کی بڑی شائق ہوتی ہیں۔ وہیل ان سے بہت ڈرتی ہے اور سمندر کے اس حصے میں کبھی نہیں آتی جہاں اسے ان مچھلیوں کا لقمہ بننا پڑے لیکن بعض اوقات سمندر میں شدید طوفان کے آثار نمودار ہوتے ہیں تب وہیل مجبور ہوکر دوسرے حصے میں پناہ لیتی ہے اور یوں موت کا شکار ہو جاتی ہے۔ وہیل کی نوپاتے ہی یہ چھوٹی مچھلیاں جن کی لمبائی آٹھ دس انچ سے زیادہ نہیں ہوتی' ہزاروں کی تعداد میں اس کے پیچھے لگ جاتی ہیں' شارک کے دانتوں کی مانند ننھی مچھلیوں کے دانت بھی بے حد تیز اور نوکیلے ہوتے ہیں۔ یہ میلوں تک وہیل کا تعاقب کرتی ہیں اور مسلسل اس کا عقبی گوشت نوچ نوچ کر کھاتی رہتی ہیں حتیٰ کہ وہیل بے دم ہوکر اپنے آپ کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتی ہے' پھر منٹوں میں اس کا صفایا ہو جاتا ہے اور سمندر کے سینے پر ایک عظیم مچھلی کا ڈھانچا تیرتا رہتا ہے۔''

''کیا تم کبھی مچھیرے تو نہیں رہے مسٹر جان کلاز؟'' فرینڈیز نے حیرت سے کہا' ''مچھلیوں کے بارے میں تمہاری معلومات بہت وسیع ہیں۔''

چند لمحے چپ رہنے کے بعد جان کلاز نے سرد آہ بھری پھر آہستہ سے کہا' ''میں تو نہیں' ہاں میرا باپ اپنے دور کا معروف مچھیرا اور ملاح تھا۔ میں بچپن میں اس کے ساتھ اکثر مچھلی کے شکار پر جایا کرتا تھا۔ وہ وہیل کا شکاری تھا اور کھلے سمندروں میں کئی کئی سو میل دور جا کر اسے ہارپون سے ہلاک کرتا۔ اس کی پارٹی میں بہت سے شکاری شامل ہوتے تھے۔ میرا خیال ہے وہیل سے زیادہ خطرناک حیوان شاید ہی کوئی اور کرہ ارض پر ہو اور اس کا شکار تو صریحاً خودکشی ہے۔''

وہ دیر تک اپنے والد کی مختلف شکاری مہموں کا حال سناتا رہا' میں نے محسوس کیا اس کی آواز بھرا رہی ہے' ہم سب محویت اور دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہے تھے اور بالکل بھول چکے تھے کہ ہم اس وقت کس نازک حالت سے گزر رہے ہیں۔

''کاش! میں بھی مچھیرا بن جاتا۔'' وہ رو پڑا۔ ''اور جرائم کی دنیا سے مجھے واسطہ نہ پڑتا' لیکن تقدیر میں تو دربدر کی ٹھوکریں لکھی تھیں۔ خدا ناس کرے اس بری سوسائٹی کا اور شراب نوشی کی لت کا۔ میں سچ کہتا ہوں دوستو! یہ شراب ایسی چیز ہے جو انسان کا بیڑا غرق کر دیتی ہے۔ برے بھلے میں تمیز نہیں رہنے دیتی۔ اس لت نے مجھے پہلے پہل چھوٹی موٹی چوریاں کرنے پر مجبور کیا۔ پھر بڑے بڑے ڈاکے مارنے لگا۔ پولیس دن رات میرے پیچھے پھرنے لگی' میرا باپ مجھے بچاتے بچاتے اور مقدمے لڑتے لڑتے قلاش ہوگیا۔ میری ماں فرط غم سے پاگل ہوگئی۔ پھر ہمیشہ کے لیے دونوں خاک میں جا سوئے مجھے تب بھی ہوش نہ آیا۔ نتیجہ یہ کہ آج جان بچانے کے لیے تمہارے ساتھ مارا مارا پھر رہا ہوں۔ کون جانے ابھی کتنے دکھ اس جنم میں بھگتنے باقی ہیں۔ بعض اوقات اپنی بدکاریوں اور جرائم کی فہرست پر نگاہ ڈالتا ہوں تو لرز جاتا ہوں اور سوچتا ہوں' خدا مجھے کبھی معاف نہ کرے گا..... کبھی معاف نہ کرے گا۔''

وہ ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔ ہماری آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ دفعتہً بادل زور سے گرجا' بجلی پھر کوندی اور ہم نے دیکھا کہ اسٹیمر سیاہ سمندر کے سینے پر گرتا پڑتا اور کارک کی مانند اچھلتا اس مہیب چٹانی سلسلے کی طرف بڑھ رہا ہے جو شمال کی جانب ہم سے کوئی تین چار میل پھیلتا چلا گیا تھا۔

''اسٹیمر کو سنبھالو ورنہ یہ چٹانوں سے ٹکرا کر تباہ ہو جائے گا۔'' جان کلاز سسکنا اور رونا دھونا بھول کر چیخا' بجلی پھر چمکی اور اس مرتبہ دہشت سے ہماری گھگھی بندھ گئی۔ اسٹیمر بے پناہ رفتار سے چٹانوں کی طرف بڑھ رہا تھا اور لمحہ بہ لمحہ ہمارا اور چٹانوں کا فاصلہ کم ہوتا دکھائی دیتا تھا۔ یہ چٹانیں سمندر کے سینے سے ابھری تھیں اور سیاہ رنگ کی تھیں۔

''خدا کے لیے کچھ کرو موسیو پیلن۔'' ماترو کی کپکپاتی آواز کان میں آئی' بارش اور تیز ہوگئی تیز ہوا کے ساتھ پانی کی بوچھاڑ چھروں کی مانند ہمارے ہاتھوں اور چہروں پر مسلسل پڑ رہی تھی۔ اس آفت سے بچاؤ کا کوئی امکان نہ تھا۔ یکایک فرینڈیز بھی چلا اٹھا۔

''مارے گئے..... اسٹیمر کے اندر پانی بھر رہا ہے۔''

یہ سن کر میرا کلیجہ بیٹھ گیا۔ اسٹیمر میں پانی کیسے بھر گیا۔ شاید اس کا وہ پچھلا سوراخ بند ہوگیا تھا' جو پانی کے اخراج کے لیے اس کے عقبی حصے میں لگایا گیا تھا۔ اگر چند منٹ کے اندر اندر

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

اسٹیمر میں بھرا ہوا پانی نہ نکالا تو اس کے ڈوب جانے میں کوئی شک نہ تھا' ہم سب پانی میں بری طرح شرابور تھے اور سردی کے باعث تھر تھر کانپ رہے تھے۔ میں نے بادبان کا رسا تھام کر بڑی مشکل سے اپنا رخ پھیرا اور کیبن کے پچھلے حصے میں جا کر اس پائپ کا سوراخ ٹٹولا' جس کے ذریعے پانی باہر نکلتا تھا۔ اس کے اندر نہ جانے کس طرح ایک کپڑا پھنس گیا تھا' کپڑا نکالتے ہی اسٹیمر میں بھرا ہوا پانی باہر نکلنے لگا' لیکن اس دوران میں خوراک کا تمام سامان تباہ ہو چکا تھا' چاولوں کے تھیلے میں پانی بھر چکا تھا۔ سارڈین مچھلیاں اور ابلے ہوئے انڈے پیروں تلے آ کر برباد ہو رہے تھے کمبل بستر اور کپڑے ناس ہو چکے تھے۔ چولہا بے کار اور تیل کا بھرا ہوا کنستر ٹوٹ چکا تھا لیکن ہم ان نقصانوں سے بے پروا اسٹیمر کا رخ بدلنے کی سرتوڑ کوشش کر رہے تھے۔ طوفان کے باعث اسٹیمر کو ایک جگہ قرار نہ تھا' کبھی دائیں طرف جھکتا' کبھی بائیں طرف۔ ایک مرتبہ تو ایسا جھٹکا لگا کہ اگر میں لپک کر ماترو کا ہاتھ نہ پکڑ لیتا تو وہ سمندر کی بے رحم لہروں میں ہمیشہ کے لیے گم ہو چکا تھا۔

بادبان کھولا' ہوا کے دباؤ میں کمی ہوئی اور اسٹیمر کی رفتار آپ ہی آپ کم ہونے لگی مگر اس کا رخ اب بھی چٹانوں کی طرف تھا اور ہم میں سے کسی میں اتنی جان نہ تھی کہ چپوؤں کے ذریعے اسٹیمر کا رخ بدل سکے۔

''اے خدا' ہماری مدد کر' ہمارے گناہ معاف کر دے۔'' جان کلاز گڑگڑایا'

''آمین..... آمین.....'' ماترو نے گھٹنوں کے بل جھک کر کہا مگر سیدھا ہونے سے پہلے ہی جھٹکا کھا کر اوندھے منہ اسٹیمر میں گر گیا' فرینڈیز نے اسے بمشکل اٹھایا۔ پھر ہم نے آخری بار ہمت کر کے چپو سنبھالے اور اسٹیمر کا رخ موڑنے کی کوشش کرنے لگے۔ سچ ہے انسان ہمت کرتا ہے تو خدا بھی ساتھ دیتا ہے۔ چپو چلاتے ہی خود بخود اسٹیمر کا رخ چٹانوں کے مخالف سمت میں یوں ہو گیا جیسے کسی نادیدہ طاقت نے اسے پکڑ کر گھما دیا ہو' اتنے میں بارش بھی کم ہونے لگی اور کم ہوتے ہوتے بالکل رُک گئی۔ ہم نے سکون کا سانس لیا مگر بھیگے ہوئے کپڑے اتارنے اور ٹھنڈ سے نجات پانے کا فوری طور پر کوئی انتظام ہمارے پاس نہ تھا۔

خدا خدا کر کے بادل چھٹے اور پچھلی رات کا نصف سے بھی کم چاند ہماری حالت زار کا مشاہدہ کرنے کے لیے جھانکنے لگا' ہمارے اردگرد ایک عجب مگر نہایت پراسرار منظر میلوں تک پھیلا ہوا تھا۔ آسمان پر فراٹے بھرتے ہوئے بادلوں کے آوارہ ٹکڑے زرد رنگ کا کبھی ڈوبتا

اور کبھی تیز تیز چلتا ہوا چاند۔ سمندر کی دیو پیکر سیاہ موجیں' شمال سے ہٹ کر جنوب کی طرف لمبے لکڑی کے اسٹیمر پر سوار اور بے یار و مددگار اور انتہائی ناتجربہ کار مفرور قیدی..... جب ہم نے محسوس کیا کہ خطرہ ٹل گیا' تو نڈھال ہو کر چپو رکھ دیئے اور اسٹیمر کو لہروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ ہم اس قدر تھک چکے تھے کہ ایک دوسرے سے بات کرنا بھی دشوار تھا۔ جان کلاز نے تمبا کو کی تھیلی ٹٹول کر سگریٹ بنانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ پتہ چلا کہ سارا تمبا کو بھیگ کر ایک گولے کی شکل اختیار کر گیا ہے اور سگریٹ بنانے کا کاغذ غائب ہے۔ غالباً پانی میں بھیگ کر برباد ہو گیا تھا۔ دیا سلائی کی ڈبیا کا بھی یہی حال تھا۔ سارے اسٹیمر میں تیل کی بُو پھیلی ہوئی تھی۔ یہ وہ تیل تھا جو کنستر کے الٹ جانے سے بہہ گیا تھا۔ میں نے کنستر اور چولہا اٹھایا اور سمندر میں پھینک دیا۔ یہ چیزیں اب ہمارے کسی کام کی نہ تھیں۔ تھوڑی دیر بعد ماترو نے ابلے ہوئے ایسے انڈے جمع کرنے شروع کیے جو پیروں تلے آ کر کچلے جانے سے بچ گئے تھے۔ ان کی تعداد کچھ زیادہ نہ تھی۔ دو سو انڈوں میں سے بمشکل بیس پچیس اس حالت میں تھے جنہیں کھایا جا سکتا تھا۔

اسٹیمر نامعلوم منزل کی طرف بڑھتا رہا..... رات دھیمے دھیمے کٹتی رہی' ہم مردوں کی مانند سردی کھاتے ہوئے گٹھڑی سی بن کر ایک گوشے میں پڑے رہے..... مشرقی افق پر ایک سنہری لکیر نمودار ہوئی۔ یہ لکیر آہستہ آہستہ رنگ بدل رہی تھی..... کبھی نارنجی' کبھی سرخ' کبھی نیلی..... پھر سورج کی پہلی کرن نے اسٹیمر تک پہنچ کر ہمیں سلام کیا۔ یہ منظر ایسا دلفریب تھا کہ اسے بیان کرنے سے الفاظ عاجز ہیں۔ ہم اٹھ کر بیٹھ گئے اور دم بدم ابھرتے ہوئے سورج کے سنہری تھال کو دیکھنے لگے۔ سورج سے لے کر ہمارے اسٹیمر تک روشنی کی ایک جھلمل جھلمل کرتی سڑک بن گئی تھی اور اس سڑک کے نیچے بے شمار چھوٹی بڑی مچھلیاں پارے کی مانند تڑپ رہی تھیں' اچھل رہی تھیں۔

سردی کے باعث ہمارا واقعی برا حال تھا' کپڑوں کی گٹھڑی ٹٹولی گئی اور یہ دیکھ کر مایوسی سے چہرے اتر گئے کہ ہر کپڑا پانی میں بھیگ چکا ہے اور پہننے کے لائق نہیں' سورج کو دیکھ کر کچھ ڈھارس بندھی۔ آہستہ آہستہ دھوپ تیز ہوئی ہمارے جسموں میں گرمائی آنے لگی۔ بے چارے ماترو کے ہونٹ نیلے پڑ چکے تھے اور دانت ابھی تک بج رہے تھے۔ جان کلاز بے دم ہو کر اوندھے منہ لیٹ گیا اور ٹانگیں موڑ کر پیٹ سے لگا لیں۔ وہ دراصل تمبا کو نوشی کا عادی تھا

PVL VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

اور سگریٹ نہ ملنے کے باعث اس کی حالت مزید غیر ہو رہی تھی۔ فرینڈز قوی تن و توش کے باوجود خشک پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ اس نے گردن گھما کر چاروں طرف دیکھا۔

''یہ سمندر تو شاید حشر کے دن ہی ختم ہوگا۔'' وہ بڑبڑایا ''نہ معلوم وہ جزیرے ابھی کتنی دور ہیں جن کا ذکر کوڑھیوں نے کیا تھا۔ میرا خیال ہے ہمیں اپنی حالت درست کرنے کے لیے ان جزیروں پر کچھ مدت پناہ لینی پڑے گی۔''

''دیکھا جائے گا' گھبراؤ مت۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''جس خدا نے ہمیں یہاں تک پہنچایا ہے وہ آگے بھی ہماری حفاظت کرے گا۔ امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو۔''

اس نے دو چار ابلے ہوئے انڈے جلدی جلدی نگلے۔ ایک ایک دو دو دوسروں کو بھی دیئے۔ پھر پانی کے دو دو گھونٹ کا دور چلا' کچھ جان میں جان آئی۔ سورج آسمان پر خاصا بلند ہو چکا تھا اور کھلے صاف آسمان پر دور دور تک اب بادل کا کوئی نشان نہ تھا۔ پھر ہم نے بادبان کھول دیا۔ اسٹیمر کی رفتار بڑھ گئی۔ وہ ٹھیک شمال کی طرف جا رہا تھا۔ یک لخت ہمیں شدید نیند آ گئی کیونکہ رات بھر کے جاگے ہوئے تھے اور طوفان سے لڑتے رہے تھے۔ اگرچہ حالت ایسی نہ تھی کہ نیند آئے مگر وہ جو کسی نے کہا ہے نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے تو کچھ غلط نہ تھا..... تھوڑی دیر بعد ہم دنیا و مافیہا سے بے خبر گہری نیند کی آغوش میں چلے گئے۔

✣ ✣ ✱ ✣ ✣

سب سے پہلے میری آنکھ کھلی۔ شاید اس لیے کہ غیر شعوری طور پر اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جان کی سلامتی کا احساس مجھ میں بیدار تھا۔ دیکھا سورج مغرب کی جانب ڈھل رہا ہے۔ سمندر میں جوار بھاٹے کی سی کیفیت ہے' اسٹیمر اسی رفتار سے لہروں پر اچھلتا دائیں بائیں ڈگمگاتا اور اوپر نیچے حرکت کرتا آگے بڑھ رہا تھا۔ دھوپ اتنی تیز تھی کہ نہ صرف ہمارے بدن پر چپٹے ہوئے کپڑے سوکھ گئے تھے بلکہ اسٹیمر کے اندرونی حصے کا پانی بھی خشک ہو چکا تھا۔ ایک اندازے کے مطابق جو غلط بھی ہو سکتا تھا' ہمارے اسٹیمر نے کوئی سو میل کا فاصلہ طے کر لیا تھا۔ پھر مجھے ان خوفناک شارک مچھلیوں کا خیال آیا جن کے بارے میں ہمیں خبردار کیا گیا تھا کہ سو ڈیڑھ سو میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ان کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ میں نے غور سے پانی کو دیکھا۔ وہاں شارک تو درکنار کسی اور مچھلی کا نام نشان بھی نہ تھا۔ اتنے میں

جان کلاز بھی جاگ گیا۔ میں نے اسے بتایا شاید اب ہم اس حصے میں پہنچنے والے ہیں یا پہنچ گئے ہیں جہاں شارک مچھلیاں پائی جاتی ہیں لیکن تعجب ہے سمندر کا یہ ٹکڑا ہر قسم کی چھوٹی بڑی مچھلی سے خالی دکھائی دیتا ہے۔''

یہ سن کر جان کلاز کے چہرے پر زلزلے کے سے آثار نمودار ہوئے۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور سمندر کا جائزہ لینے لگا۔ پھر اس نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی اور ایک گوشے میں پڑے ہوئے ہارپون پر نگاہ جما دی۔

''میرا اندازہ ہے ہمیں اپنے ہارپوں تیار رکھنے چاہئیں۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا' ''شارک مچھلیوں کا سمندر شروع ہو چکا ہے اور اس کی علامت یہ ہے کہ جہاں شارک موجود ہو وہاں دوسری کوئی مچھلی نہیں پائی جاتی۔''

''خدا رحم کرے!'' فرینڈز اس بری طرح چیخا کہ ماترو کی آنکھ کھل گئی۔ وہ خالی خالی نظروں سے ہم تینوں کو گھور رہا تھا۔

''تیار ہو جاؤ ماترو' ہم شاید شارک مچھلیوں کے علاقے میں داخل ہو گئے ہیں۔''

''شارک؟ کہاں؟ کس جگہ؟'' لڑکے نے دہشت سے گھگھیاتے ہوئے کہا' ''میں نے آج تک شارک نہیں دیکھی' کیسی ہوتی ہے وہ؟''

''تم حوصلہ رکھو برخوردار! شارک ابھی دکھائی دے جاتی ہے۔'' جان کلاز بولا' ''مجھے پورا یقین ہے کہ یہ مکار مچھلیاں چپکے چپکے ہمارے اسٹیمر کا پیچھا کر رہی ہوں گی۔ خدا انہیں غارت کرے' ان کا حملہ بہت خطرناک ہوتا ہے۔''

دیر تک ہم سب سمندر کی لہروں کا جائزہ لیتے رہے' کوئی شارک دکھائی نہیں دی۔ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر ہم نے دونوں ہارپون دیکھے بھالے۔ ان کے سروں پر لوہے کا انتہائی مضبوط اور سوئی کی مانند نوکیلا چاقو سا لگایا جاتا ہے۔ اس چاقو ہی کا نام ہارپون ہے۔ بقیہ حصہ لکڑی سے بنایا جاتا ہے جس کی لمبائی آٹھ دس فٹ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ نیزے کی طرح اسے شارک مچھلی پر پھینکا جاتا ہے۔ اگر نشانہ صحیح ہو تو ہارپون کی انی مچھلی کے جسم میں کھب جاتی ہے اور خون کے فوارے چھوٹ جاتے ہیں۔ جونہی کوئی شارک زخمی ہوتی ہے اور اس کا خون بہنے لگتا ہے..... دوسری شارک مچھلیاں اپنی ہی جنس پر ٹوٹ پڑتی ہیں اور آناً فاناً اسے چٹ کر جاتی ہیں۔ ہارپون کے ساتھ مضبوط رسی باندھی جاتی ہے تاکہ حملے کے بعد ہارپون واپس لایا جا سکے۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

ہم نے دونوں ہارپون کی رسیوں کے آخری سرے بادبان کے مضبوط شہتیر سے باندھ دیئے اور اسٹیمر کے دائیں بائیں مسلسل جائزہ لیتے رہے کہ شارک کس طرف سے نمودار ہوتی ہے۔ ایک دوبار فرینڈیز اور میں نے ہارپون پھینکنے کی ریہرسل بھی کی جس سے اندازہ ہوا کہ یہ کام کس قدر توانائی اور مہارت کا طلب گار ہے' جان کلاز برابر ہمیں ہدایتیں دے رہا تھا۔ افسوس کہ وہ خود نحیف تھا ورنہ ہارپون کا استعمال وہ ہم دونوں اناڑیوں سے کہیں بہتر طریق پر کرسکتا تھا۔

شارک کا انتظار شدید سے شدید تر ہوتا چلا جارہا تھا۔ اشتیاق' خوف اور جرأت کے ملے جلے احساسات ہر شخص میں بیدار تھے' ماترو بار بار بے چینی سے پانی میں دیکھتا مگر وہاں مچلتی بپھرتی اور آپس میں لڑتی ہوئی موجوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سورج کی بے پناہ چمک رفتہ رفتہ سرخی میں بدلنے لگی۔ مغرب میں ایک بہت بڑا آتشیں گولہ اتر رہا تھا۔ ایک بار پھر نارنجی رنگ کی ایک روشن سڑک سورج سے لے کر ہمارے اسٹیمر تک بن گئی۔ اس سڑک میں کئی رنگ مچل رہے تھے' بل کھا رہے تھے۔ ابھی ہم اسی منظر میں گم تھے کہ جان کلاز کی آواز گونجی' ''خبردار..... ہوشیار..... دشمن آن پہنچا۔''

ہم نے دیکھا اسٹیمر کے عقب میں ایک بڑا سا بھنور نمودار ہو رہا ہے' چند لمحوں بعد یہ بھنور غائب ہوگیا۔ پھر کیا دیکھتے ہیں کہ اسٹیمر کے آگے کوئی پچیس تیس گز کے فاصلے پر نمودار ہوگیا۔ پانی اس تیزی سے چکر کھا رہا تھا کہ حیرت ہوتی تھی۔

''اس بھنور کے اندر شارک ہے۔'' جان کلاز نے کہا۔ میں نے اور فرینڈیز نے ہارپون تھام لیے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم دونوں کے ہاتھ اور بازو بری طرح لرز رہے تھے۔

ماترو نے لکڑی کے ڈبے میں سے ایک کچھوا نکالا اور پانی میں پھینک دیا۔ اف خدایا بجلی کی مانند ایک سولہ سترہ فٹ لمبی ایک مہیب شکل کی مچھلی سطح پر نمودار ہوئی اپنا بھیانک جبڑا کھول کر اس نے کچھوے کو سالم ہی نگل لیا اور دم ہلاتی ہوئی پھر پانی کے اندر غائب ہوگئی۔

''باپ رے باپ..... ایسی ہوتی ہے شارک'' ماترو کا رنگ پیلا پڑ گیا۔

شارک کی جلد کا رنگ گلابی تھا اور نہایت قوی ہیکل تھی۔ اس کے جبڑے کی لمبائی کم از کم چار فٹ رہی ہوگی۔ جبڑے کا نچلا حصہ چھوٹا اور اوپر کا بڑا تھا۔ جب اس نے منہ کھولا تو لمبے لمبے' چمک دار' سفید اور بے حد نوکیلے دانتوں کی قطاریں دکھائی دیں۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

''دوبارہ یہ سر اٹھائے تو بے کھٹکے ہارپون پھینک دینا۔'' جان کلاز نے کہا' ''تم لوگوں نے حملے کا بہترین موقع کھو دیا۔ بہرحال یہ ابھی ہمیں کچھ نہ کہے گی بلکہ اسٹیمر کے ساتھ ساتھ میلوں سفر کرے گی۔ ممکن ہے اس کے دائیں بائیں چند اور مچھلیاں بھی ہوں یاد رہے شارک کبھی تنہا شکار کی مہم پر نہیں نکلتی۔''

شارک دیکھنے کے بعد اس کی جو دہشت ہمارے دلوں پر بیٹھی وہ ناقابل بیان ہے۔ کبھی ہم اسٹیمر کے آگے دیکھتے کبھی پیچھے۔ سورج کبھی کا غروب ہو چکا تھا لیکن آسمان پر شفق کی سرخی ابھی موجود تھی اور ہمیں دو تین میل دور تک سمندر آسانی سے نظر آ رہا تھا۔ وزنی ہارپون سنبھالے سنبھالے میرے اور فرینڈیز کے بازو شل ہوگئے۔ شارک نے پھر پانی سے سر باہر نہیں نکالا۔ ادھر جان کلاز ہاتھ میں رائفل تانے کھڑا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر گولی شارک کے جسم کے نچلے حصے پر لگے تو بہت کارگر ہوتی ہے۔ اس مچھلی کے جسم کا نچلا حصہ بے حد نرم اور گداز ہوتا ہے۔

موت سامنے کھڑی ہو اور بچنے کی کوئی راہ ہو نہ امید تو ایک ڈرپوک موت سے ڈرنے والے شخص کا جو حال ہوسکتا ہے کم از کم وہی حال میرا تھا۔ اب تک حیران ہوں کہ میرے دل کی حرکت بند کیوں نہ ہوگئی یا میں ہمیشہ کے لیے ذہنی توازن کیوں نہ کھو بیٹھا۔ آخر بے حیائی اور ڈھیٹ پن کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ میں آپ کے صبر و تحمل کا زیادہ امتحان لیے بغیر شارک کے حملے اور بعد میں جو کچھ ہوا اس کی کیفیت تفصیل سے بیان کرتا ہوں۔

شارک کو اتنے قریب سے دیکھنے کا زندگی میں یہ پہلا اتفاق تھا اس کی خون آشامیوں کے قصے بے شمار مرتبہ سنے تھے اور کبھی وہم بھی نہ ہوا تھا کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب مجھے اس موذی اور انسانی لہو پینے کی شوقین آبی مخلوق کا سامنا کرنا ہوگا۔ اس کی شکل صورت خدا نے اتنی ہیبت ناک بنائی ہے کہ اس کو دیکھ کر ہی پیشاب خطا ہو جاتا ہے اور بلاشبہ تین مرتبہ جب ماترو نے اسے دیکھا تو مارے خوف کے اس کا پیشاب نکل گیا۔ مجھے تو خیر بہادری کا اتنا دعویٰ نہ ہوا جتنا فرینڈیز کو تھا لیکن اس کا حال یہ کہ تین مرتبہ اس کے ہاتھ سے ہارپون چھوٹ کر پانی میں گرا اور شارک نے پلٹ پلٹ کر اسے چبانے کی کوشش کی۔ اگر ہارپون کے ساتھ موٹی رسی نہ بندھی ہوتی تو یہ قیمتی ہتھیار ہمیشہ کے لیے ہاتھ سے نکل کر سمندر کی تہہ میں چلا جاتا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

سورج غروب ہونے کے ٹھیک پون گھنٹے بعد شارک نے پہلا حملہ کیا' اندھیرے کی وجہ سے ہمیں بھنور نظر آیا نہ شارک کی حرکت کا صحیح اندازہ ہوا۔ پھر یہ بھی پتہ نہ تھا کہ شارک ایک ہے دو ہیں یا کئی..... حقیقت یہ ہے کہ وہ لمحات ایسے جان لیوا تھے کہ ہمیں اپنے بچ جانے کا بالکل یقین نہ تھا۔ اب تک جتنی صعوبتیں فرار ہونے کے بعد اٹھائی تھیں وہ سب کی سب ہیچ اور بے سود دکھائی دینے لگیں۔ ویسے بھی حواس اس حد تک زائل ہو چکے تھے کہ اس آفت سے نمٹنے کی کوئی تدبیر سوجھتی ہی نہ تھی اور تدبیر کا وہاں دخل بھی نہ تھا۔ محض خدا کی مدد اور اسی کا آسرا تھا کہ ہم ہارپون سنبھال کر کھڑے تھے۔

دفعتہً اسٹیمر کو زور کا دھچکا لگا جیسے الٹ ہی جائے گا' لیکن مخالف سمت سے آنے والی ایک شوخ اور سرکش لہر نے اس کا توازن آپ ہی آپ درست کر دیا۔ پھر مسلسل بھنور پڑنے لگے جن میں اسٹیمر پھنس کر لٹو کی طرح گھومتا رہا۔ ہم ایک دوسرے کے اوپر گرتے' قلابازیاں کھاتے اور پھر اٹھ کھڑے ہوتے۔ ماترو زور زور سے چیخ رہا تھا اور نہ جانے کیا اول فول بک رہا تھا۔ جان کلازن نے اسے چپ رہنے کی ہدایت کی مگر وہ برابر چیختا رہا۔

اب وہ خونخوار مچھلی ہمیں بے ضرر جان کر کبھی آگے دکھائی دیتی' کبھی پیچھے کبھی ہمیں اس کا سرخ سرخ چمکتا ہوا سر دکھائی دیتا' کبھی دم۔ اسے ایک ثانیے بھی قرار نہ تھا اور وہ پارے کی طرح پانی میں تڑپ رہی تھی اس کی آنکھیں مشعل کی مانند روشن تھیں' ہمیں ان آنکھوں میں شعلے اور چنگاریاں اٹھتی نظر آتی تھیں۔ وہ اسٹیمر سے کوئی تیس فٹ کے فاصلے پر اس کے اردگرد چکر کاٹ رہی تھی۔ ہم نے محسوس کیا کہ لمحہ بہ لمحہ اس کا فاصلہ اسٹیمر سے کم ہوتا جا رہا ہے۔ وہ اس تیزی سے چاروں طرف تیر رہی تھی کہ اس پر نگاہ جمانا مشکل تھا ایک بار ہمیں جو دھچکا سا لگا تھا' وہ اسی کی ٹکر تھی جو اس نے سٹیمر کے پچھلے حصے میں ماری تھی۔ شاید وہ اندازہ کرنا چاہتی تھی کہ اسٹیمر کس حد تک مضبوط ہے شارک مچھلیوں کے خطرے اور ٹکر سے بچاؤ کے لیے اس کے پیندے سے کوئی تین فٹ اوپر ٹین اور لوہے کی چادریں لگائی گئی تھیں اور ان چادروں میں چار چار انچ لمبی نوکیلی میخیں بھی کثرت سے ٹھونکی گئی تھیں تاکہ شارک کا سر ان سے بار بار ٹکرائے' تو زخمی ہو سکے' لیکن شارک کی ہوشیاری کا اندازہ اس سے کیجئے کہ صرف ایک مرتبہ ٹکر مارنے کے بعد اسے پتہ چل گیا کہ یہ کام خطرناک ہے' چنانچہ اس نے دوبارہ ٹکر نہ ماری۔

ادھر ہماری کوشش یہ تھی کہ شارک کو اسٹیمر کے نیچے نہ آنے دیں اور برابر اسے ڈراتے رہیں۔ کئی مرتبہ ہم نے اس پر ہارپون پھینکے۔ ہر بار وہ بچ کر نکل گئی اور یہ بھی اسے معلوم ہو گیا کہ ہم مسلح ہیں۔ مجھے یقین ہو گیا کہ ہمارا واسطہ ایسی شارک سے ہے جو ان معاملوں میں خاصی تجربہ کار اور نڈر ہے اور خدا بہتر جانتا ہے کہ وہ اب تک کتنے آدمیوں کے گوشت سے اپنا پیٹ بھر چکی ہو گی۔ ہمارے اطمینان کی ایک بات یہ بھی تھی کہ فی الحال ہمارا مقابلہ اسی ایک شارک سے تھا۔

''خدا رحم کرے۔'' جان کلازن کی آواز میں نے سنی۔ ''اس ایک شارک کی موجودگی سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابھی ہم سمندر کے اس مخصوص حصے میں داخل نہیں ہوئے جہاں ان کی کثرت ہے۔ غالباً یہ اکیلی شارک شکار کی تلاش میں دور نکل آنے کی عادی ہے۔''

یہ سن کر جو ہوش و حواس باقی تھے' وہ بھی جاتے رہے۔

''کیا کہتے ہو جان؟'' ''فرینڈیز نے ہانپتے ہوئے کہا۔'' اس ایک مچھلی نے مفلوج کر دیا ہے' اگر خدانخواستہ دس بارہ آ جائیں' تو ہمارا نام و نشان بھی نہ رہے اور تم کہہ رہے ہو کہ ابھی ہم ان کے علاقے میں داخل نہیں ہوئے؟''

اندازہ تو میرا یہی ہے اور خدا کرے یہ اندازہ غلط ثابت ہو ان خونخوار مچھلیوں سے بچنے کا اب ایک راستہ ہے اور وہ یہ کہ سمندر میں ہولناک طوفان آنے کی دعا کرو' طوفان میں زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ ہم راستے سے کسی قدر دور ہو جائیں گے لیکن شارک مچھلیوں سے نجات مل جائے گی' یہ طوفان سے بہت ڈرتی ہیں اور فوراً تہہ میں چلی جاتی ہیں۔

اس نے یہ الفاظ ادا کیے ہی تھے کہ اسٹیمر کو زبردست دھچکا لگا۔ ہم ایک دوسرے سے ٹکرا گئے اور پاگلوں کی طرح چیخنے چلانے لگے۔ موت سروں پر منڈلا رہی تھی' ماترو کا سر دھائیں سے پانی کے ساتھ ٹکرایا' وہ بیہوش ہو گیا۔ فرینڈیز اوندھے منہ گرا۔ میری پشت مستول سے ٹکرائی اور آنکھوں کے سامنے شرارے نظر آئے۔ اسٹیمر ایک کھلونے کی طرح پانی پر اچھل رہا تھا۔

شارک..... میں نے چلا کر کہا' اسی لمحے شارک کا مہیب جبڑا اٹھتا ہوا نظر آیا' پوری قوت سے میں نے اپنا ہارپون پھینکا۔ شائیں کی آواز سے ہارپون مچھلی کی طرف گیا اور جبڑے کے نچلے حصے میں پیوست ہو گیا۔ شارک نے بل کھا کر دم اسٹیمر پر ماری اور آناً فاناً

پانی میں غوطہ لگا گئی۔ سوفٹ لمبی مضبوط رسی اس تیزی سے ہارپون سمیت کھلی کہ بیان سے باہر۔ مستول سے بندھا ہوا سرا ایک لخت تن گیا اور جھٹکے پہ جھٹکے کھانے لگا۔

''رسی کاٹ دو، رسی کاٹ دو۔'' فرینڈیز چلایا' میں نے بے ہوش پڑے ماترو کی کمر میں اڑسا ہوا چاقو نکالا اور تنی ہوئی رسی پر ہاتھ مارا۔ کھچ سے رسی کٹ کر سمندر میں جا گری۔ اگر ایک لمحہ بھی اس کارروائی میں تاخیر ہوتی' تو اسٹیمر الٹ چکا تھا' شارک کا وزن ہی اتنا تھا کہ کوئی قوت اسٹیمر کو الٹ جانے سے بچا نہ سکتی تھی۔ رسی کٹتے ہی اس کا توازن درست ہو گیا' پانی کی ایک زبردست لہر اسٹیمر سے ٹکرائی اور ہم سب پھر قلابازیاں کھانے لگے۔ ہمارے بدن پانی میں شرابور اور کپڑے جسموں سے چپکے ہوئے تھے۔ شارک سے مقابلے میں ایک ہارپون ضائع ہو گیا تھا۔

جنوب کی طرف سے یکا یک ہوا کا ریلا آیا اور اسٹیمر کی رفتار تیز ہونے لگی۔ دیکھتے دیکھتے ہم بہت آگے نکل گئے لیکن شارک کا خوف اب بھی تھا..... وہ بہرحال ہارپون کی ایک ضرب سے مرنے والی نہ تھی۔ ممکن ہے تھوڑی دیر بعد تعاقب میں آتی اور ایسا ہی ہوا..... لیکن ہماری دہشت کی انتہا نہ رہی جب ہم نے اپنے آس پاس تین شارک مچھلیوں کو گھومتے دیکھا۔ غالباً وہ اپنی ساتھی شارک کے خون کی بو سونگھ کر اسٹیمر کے پیچھے پیچھے آئی تھیں اور انہیں تینوں میں وہ شارک بھی شامل تھی جسے میرے ہارپون نے زخمی کر دیا تھا۔

''اگر دوسرا ہارپون بھی ہاتھ سے نکل گیا تو مرے بے موت'' جان کلاز نے کہا۔ لہٰذا ہارپون احتیاط سے پھینکنا۔ یہ کہتے ہی اس نے رائفل سے ایک ابھرتی ہوئی شارک کی چمکتی آنکھ کا نشانہ لیا اور جونہی پانی سے باہر اس نے اپنا بڑا سا سر نکالا جان کلاز نے دھائیں سے فائر جھونک دیا وہ بہترین نشانچی تھا اور مجھے یقین ہے کہ گولی شارک کی آنکھ میں لگی وہ فوراً غوطہ لگا گئی لیکن چند لمحوں بعد ہمارے عقب میں ایک بڑا بھنور پیدا ہوا۔ فرینڈیز نے لپک کر ہارپون سنبھالا۔ اب وہ اسے پھینکنے میں خاصا مشاق ہو گیا تھا۔ یوں اس کے بازوؤں میں میری نسبت زیادہ جان تھی۔ دانت بھینچ کر اس نے شارک کو پہلے ایک موٹی سی گالی دی پھر دونوں بازوؤں کی ملی جلی قوت سے ہارپون تاک کر اس شارک کے مارا جو اسٹیمر کو عقب سے اٹھانے آئی تھی۔ شارک کا اور اسٹیمر کا درمیانی فاصلہ کم تھا۔ اس لیے ہارپون سنسناتا ہوا گیا اور اس کے کھلے جبڑے میں خپ سے کھب گیا۔ شارک نے تڑپ کر بل کھایا اور اس کی دم

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

گھومتی ہوئی اسٹیمر پر لگی۔ اسٹیمر چرخی کی مانند گھوم گیا اور اس سے پیشتر کہ ہم کچھ سوچتے سمجھتے فرینڈیز فضا میں اچھلا اور دھڑام سے سمندر میں جا گرا۔ خدا رحم کرے' وہ لمحہ میں مرتے دم تک نہیں بھول سکوں گا' آناً فاناً تمام شارک مچھلیاں وہاں آ گئیں۔ اور انہوں نے فرینڈیز کی تکا بوٹی کر ڈالی۔ یہ مرحلہ پلک جھپکتے میں طے ہو گیا اور ہمیں اس وقت ہوش آیا جب اسٹیمر اس مقام سے تقریباً نصف میل دور آ چکا تھا۔

''فرینڈیز..... فرینڈیز.....'' میں نے گھٹی گھٹی آواز میں جان کلاز کی طرف دیکھ کر کہا۔

''صبر..... صبر.....'' جان کلاز کی بھرائی ہوئی آواز آئی۔ وہ بے حس و حرکت کھڑا سمندر کے سیاہ پانی کو گھور رہا تھا وہ ہارپون جو فرینڈیز نے پھینکا تھا۔ شارک کے جبڑے سے الگ ہو کر پانی کے اندر ہی اندر الٹا پلٹتا اسٹیمر کے ساتھ ساتھ آ رہا تھا میں نے جلدی سے رسی پکڑی اور ہارپون کو کھینچ کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ فرینڈیز کی قربانی قبول کر کے شارک مچھلیاں خوش تھیں۔ انہوں نے ہمارا مزید تعاقب کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

اس حادثے نے ہمیں حد درجہ مایوس اور زندگی سے بددل کر دیا۔ بار بار فرینڈیز کا چہرہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا۔ ابھی چند لمحے پہلے وہ زندہ تھا۔ ہمارے ساتھ تھا لیکن اب..... اب وہ زندگی کی حدیں پھلانگ کر موت کے ایک لمبے سفر پر روانہ ہو چکا تھا۔ ماترو بے چارہ ابھی تک بے ہوش پڑا تھا۔ نہ جانے اسے کہاں چوٹ لگی تھی کہ ابھی تک ہوش میں نہ آ سکا تھا۔ جان کلاز صبر و استقلال کا مجسمہ بنا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور ہونٹ سختی سے بھنچے ہوئے۔ اس نے ماترو کے دل پر ہاتھ رکھا اور میری طرف دیکھ کر اثبات میں گردن ہلائی جس کا مطلب تھا کہ وہ ابھی زندہ ہے البتہ اس کا سر پھٹ گیا تھا اور خون زخم سے نکل نکل کر بڑی مقدار میں اس کی گردن اور چہرے پر جم گیا تھا۔ بڑی مشکل سے اس کے حلق میں پانی ڈالا گیا' تھوڑی دیر بعد اس نے جھرجھری سی لے کر آنکھیں کھول دیں۔

''میں کہاں ہوں؟'' اس نے کراہتے ہوئے پوچھا'' کیا شارک واپس چلی گئی؟''

''ہاں چلی گئی.....'' جان کلاز نے اسے تھپکی دی ماترو اٹھ بیٹھا اور اس نے پہلے مجھے پھر جان کلاز کو دیکھا۔ اس کے بعد گردن گھما کر ادھر ادھر فرینڈیز کو تلاش کرنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں خوف اور استعجاب کی علامات تھیں۔ فرینڈیز کو اسٹیمر میں نہ پا کر اس نے چند ثانیے سمندر کی طرف گھورا پھر دھاڑیں مار مار کر روتا ہوا مجھ سے چمٹ گیا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

''فرینڈیز کہاں گیا؟ موسیو پیپلن..... کہاں گیا وہ..... سمندر میں تو نہیں گر پڑا؟''

''ہاں ماترو ہمیں سخت افسوس ہے کہ ہمارا دوست اور ساتھی فرینڈیز ہمیشہ کے لیے ہم سے بچھڑ گیا۔ اس نے شارک پر ہارپون پھینکا تھا۔ شارک نے غصے میں دم اسٹیمر پر ماری اور فرینڈیز اچھل کر پانی میں جا گرا اور مچھلیوں نے اس کی تکا بوٹی کر ڈالی۔''

ہم دیر تک اسے یاد کر کے روتے رہے اور خدا سے اس کی مغفرت کی دعائیں کرتے رہے۔ واقعہ یہ ہے کہ فرینڈیز کی اس بے رحمانہ موت کے بعد خود ہم میں زندہ رہنے کا کوئی ارمان باقی تھا نہ خواہش اور نہ ہم نے اس کے بعد یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ شارک مچھلیاں اسٹیمر کے تعاقب میں آئیں بھی یا نہیں۔ ہماری آنکھوں سے مسلسل آنسو جاری تھے۔ اس دن اندازہ ہوا کہ مصیبتوں میں ساتھ دینے والے کے ساتھ کیسی محبت اور کتنا انس پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ ہمارا عزیز تھا نہ رشتے دار' پھر یہ کیا بات تھی کہ اس کے مرنے کا صدمہ کم از کم مجھے تو ایسا ہوا جیسے میرا حقیقی بھائی مر گیا ہو۔ یہی کیفیت جان کلاز اور ماترو کی تھی۔ ماترو نو خیز بچہ تھا' جان کلاز جو اپنی طبیعت کے اعتبار سے آہنی عزم و ارادے کا انسان تھا' فرینڈیز کی موت پر بری طرح اندر سے ہل چکا تھا۔ خود اس نے مجھ سے کہا: ''پیپلن! آج یوں لگتا ہے جیسے میرا ایک بازو ہمیشہ کے لیے کٹ گیا ہے۔'' فرینڈیز نے اپنی زندگی میں تین آدمی موت کے گھاٹ اتارے تھے۔ وہ پیرس میں گرفتار ہوا' اسے عمر قید کی سزا دے کر ''شیطانی جزائر'' میں بھیجا گیا اور وہ وہاں سے ہمارے ساتھ فرار ہونے میں کامیاب ہوا۔ اس کی زندگی کن حالات میں گزری؟ اس کے والدین کون تھے؟ اس کا بچپن کیونکر گزرا' اس کی تعلیم کتنی تھی' وہ بدمعاش کیسے بنا' ان حالات کا علم ہمیں کبھی نہ ہوا۔ اس کا اور ہمارا ساتھ بہت مختصر مدت کے لیے رہا تاہم اس کی جدائی کا ایسا اثر تھا جسے زائل ہونے کے لیے ایک عمر درکار تھی۔

شاید اسی کی قربانی کا نتیجہ تھا کہ ان موذی شارک مچھلیوں نے ہمارا پیچھا چھوڑ دیا۔ ادھر ہم تینوں اس اندھی اور سرد طوفانی رات میں ایک سولہ فٹ لمبے اسٹیمر پر سوار نامعلوم منزل کی طرف چلے جا رہے تھے۔

عارضی طور پر فرینڈیز کی موت کا غم بھلا کر ہم نے اپنا جائزہ لیا اور یہ دیکھ کر دل بیٹھ گیا کہ چند ابلے ہوئے انڈوں اور ایک زندہ کچھوے کے سوا کھانے کے لیے کچھ نہیں۔ شارک مچھلیوں سے جنگ کے دوران نہ جانے کس وقت پینے کے پانی کے ڈرم میں کئی سوراخ

ہو گئے۔ اب اس میں پانی کا ایک قطرہ نہ تھا' ہمارے جسم کے کپڑے بھیگ چکے تھے اور جو فالتو تھے ان کی بھی حالت یہی تھی۔ فرسٹ ایڈ کا سارا سامان ڈوب چکا تھا اور فی الحال اس کی ہمیں ضرورت بھی نہ تھی۔ ماترو کی مرہم پٹی ہم کر سکتے تھے وہ ہم نے کر دی۔ دن بھر کی شدید تھکن اور سفر کے نتیجہ میں بھوک نے بے حال کر دیا۔ جب صبر و ضبط کا یارا نہ رہا تو وہ باقی انڈے بھی ہڑپ کر لیے۔ اب ہم بے چینی سے ان جزیروں کی راہ دیکھنے لگے جن کا پتہ ہمیں بتایا گیا تھا خدا ہی بہتر جانتا تھا' کتنا فاصلہ ہم نے طے کر لیا اور ہم کدھر جا رہے تھے اور وہ ویران جزیرے کتنی دور تھے؟

رات بھر اسٹیمر سمندر کی موجوں پر چلتا رہا' کبھی ہم اس کا بادبان کھول دیتے' کبھی باندھ دیتے' افسردگی اور مایوسی کی انتہا کو پہنچے ہوئے آپس میں بات کرنے کو طبیعت نہ چاہتی۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی' سورج نے اپنا چہرہ دکھایا اور یہ معلوم کر کے ہماری پریشانی کی کوئی حد نہ رہی کہ ہم شمال کے بجائے مغرب کی طرف چلے جا رہے تھے۔ گویا رات بھر ہم نے غلط سمت سفر کیا تھا۔ فوراً اسٹیمر کا رخ بدلا' دن بھر چلتے رہے۔ دھوپ تیز تھی' فائدہ یہ ہوا کہ کیبن اور دوسرے کپڑے کسی قدر خشک ہو گئے۔ ہم بھوک دبانے میں کامیاب رہے لیکن پیاس کہاں برداشت ہوتی؟ ماترو نے بے صبر ہو کر سمندر کا پانی ڈول میں بھر کر تھوڑا سا منہ میں ڈالا اور فوراً تھوک دیا۔

''چکھ کر دیکھو پانی ہے یا زہر'' وہ چلایا۔ ''موسیو' مجھے پانی نہ ملا تو مر جاؤں گا' خدا کے لیے کچھ کیجیے۔'' ''ممکن ہے پانی کے ڈرم کی تہہ میں چند قطرے باقی رہ گیا ہو۔'' میں نے کہا۔

ماترو نے اٹھ کر ڈرم کا جائزہ لیا اور خوشی سے کہا: ''ہاں ہاں اس کی تہہ میں پانی ہے' لیکن اسے نکالا کیسے جائے؟ بس ایک ہی تدبیر ہے کوئی کپڑا لے کر میں بھگولوں اور اسے چوستا رہوں۔ اس نے لپک کر کپڑوں میں سے ایک رومال نکال کر ڈرم میں ڈالا اور رومال اپنے کھلے منہ میں نچوڑ لیا۔ مشکل سے پانی کا ایک قطرہ برآمد ہوا لیکن یہ گھونٹ ماترو کی پیاس بجھانے کے لیے بہت تھا۔

ایک ایک لمحہ جان کنی کے عالم میں کٹنے لگا' پہلے تو پانی کی آفت تھی' اب دھوپ نے ستانا شروع کر دیا۔ دھوپ کیا تھی نری آگ تھی جو آسمان سے برس رہی تھی۔ ہمارے کیبن کا سائبان کبھی کا پھٹ چکا تھا' یوں بھی جگہ اتنی تنگ کہ تین آدمی پناہ نہیں لے سکتے تھے۔ ہم میں

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

سے ماترو ابھی کم سن اور مصائب برداشت کرنے کے قابل نہ تھا۔ چنانچہ ہم نے کوشش کی کہ زیادہ سے زیادہ اسے آرام پہنچایا جائے لیکن آرام کہاں؟ سمندر کے نمکین پانی میں مسلسل شب و روز بھیگنے کے بعد جب کڑی دھوپ نے ہمیں خشک کر دیا تو وہ نمک ہمارے جسموں میں سوئیوں کی مانند چبھنے لگا جو پانی کے ساتھ چمٹ گیا تھا۔ ایسی بے پناہ اور اذیت دہ خارش ہوئی کہ ہم مچھلی کی طرح تڑپنے اور لوٹنے لگے۔ نمک اتارنے کے لیے پھر سمندر ہی کا پانی استعمال کیا گیا۔ وقتی طور پر کچھ سکون ملا مگر دس منٹ بعد ہی ہمارے بدن پھر خشک تھے اور وہی خارش ہمیں تڑپا رہی تھی۔ کھجاتے کھجاتے بدن پر نیل پڑ گئے۔ آخر خون رسنے لگا۔ فرسٹ ایڈ کے نام نہاد سامان میں کوئی چیز ایسی نہ تھی جو ہمیں اس آفت سے نجات دلا سکتی۔ بے چارہ ماترو ایک بار پھر بے ہوش پڑا تھا اور اس کے ہاتھ پیر اینٹھ رہے تھے۔ جان کلاز کی حالت بھی اچھی نہ تھی۔ وہ اسٹیمر کے ایک تختے سے پیٹھ لگائے گردن جھکائے افیمیوں کی طرح جھوم رہا تھا۔ رائفل اس کے دونوں گھٹنوں پر دھری تھی۔ اس کے برہنہ بازوؤں کی مچھلیاں کبھی کبھی اس انداز میں پھڑکتیں جیسے وہ رائفل اٹھانا چاہتا ہو لیکن پھر ساکت ہو جاتیں۔ صبح سے اب تک ہم میں سے کسی کے منہ میں غذا کے نام سے ایک ذرہ بھی نہیں گیا تھا۔

میری حالت ان دونوں سے بہتر نہ تھی۔ خارش کے باعث بدحال، ہونٹوں پر پیاس کے مارے پپڑیاں جمی ہوئی، حلق کے اندر جیسے انگارے بھرے ہوئے، اٹھنے اور کھڑے ہونے کی سکت بھی جسم میں نہ تھی۔ کیبن کے بائیں جانب پانی کے خشک ڈرم کے نزدیک میں اوندھا پڑا موت کو یاد کر رہا تھا۔ دماغ بے انتہا وہموں اور پریشان کن خیالوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ چند لمحوں کے لیے آنکھ لگتی تو عجیب عجیب خواب نظر آتے۔ کبھی دیکھتا کہ اپنے پرانے گھر میں پہنچ گیا ہوں۔ والدین اور بہن بھائی مجھے دیکھ کر خوش ہو رہے ہیں۔ کبھی دیکھتا کہ بہترین ہوٹل کے ڈائننگ روم میں بیٹھا نہایت لذیذ کھانا کھا رہا ہوں۔ پھر خواب بدل جاتا اور اپنے آپ کو جیل کی کوٹھڑی میں بند پاتا، پھر نظر آتا کہ کوڑھیوں کے جزیرے میں اسی ہولناک تاریک غار میں بند ہوں، پھر یہ منظر کچھ کا کچھ ہو جاتا۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے میں سمندر میں گر گیا ہوں اور شارک مچھلیاں مجھے کھانے کے لیے جبڑے کھولے تیزی سے آ رہی ہیں..... خوف زدہ ہو کر آنکھ کھل جاتی اور میں واقعی چیخ رہا ہوتا۔ سارا دن اسی عالم میں گزر گیا۔ اتنا بھی یاد نہ رہا کہ کم از کم ایک زندہ کچھوا ابھی موجود ہے جس کے کچے گوشت سے

بھوک مٹائی جا سکتی ہے۔ لیکن کچھوے کو مارتا کون؟ میرے بازوؤں میں تو خنجر تک اٹھانے کی ہمت نہ تھی۔ یہی حال جان کلاز کا تھا۔ رہا ماترو تو وہ پہلے ہی بے ہوش پڑا تھا۔

دفعتہً مغرب کی جانب بادلوں کے گرجنے کی آواز آئی۔ میں نے بمشکل گردن اٹھا کر دیکھا اور دل خوشی سے جھوم گیا۔ کالی کالی گھٹاؤں کا ایک عظیم بادل تیزی سے بڑھا آ رہا تھا اور اس کے عقب میں بجلی کی کڑک اور چمک موجود تھی۔ وہ بارش جو دو روز قبل زحمت بن گئی تھی اب سراسر رحمت نظر آتی تھی۔ انسان بھی کس قدر عناصر فطرت کا محتاج ہے۔ یہ بات اسی روز معلوم ہوئی، آدھ گھنٹے بعد موسلا دھار پانی پڑ رہا تھا۔ میں نے اپنا منہ کھول دیا۔ ادھر پانی نے حلق تر کیا، ادھر جان میں جان آئی۔ جان کلاز نے جنبش کی اور ماترو نے بھی آنکھیں کھول دیں۔ ہم نے جلدی جلدی فالتو برتنوں میں پانی کا ذخیرہ کیا۔ پھر بڑے ڈرم کے سوراخ کپڑے کی دھجیوں سے بند کر کے اس کا منہ بھی کھول دیا۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد بارش تھم گئی، آسمان صاف ہو گیا اور تارے چشمک زنی کرنے لگے۔ ہم نے اسٹیمر کے رخ کا جائزہ لیا۔ خدا کا شکر وہ ابھی تک صحیح سمت میں جا رہا تھا اور اس کی رفتار بھی معمول سے کچھ تیز تھی۔

"میرا خیال ہے کیپٹن پیپلن! اسٹیمر کا بوجھ کچھ ہلکا نہ کر دیں؟" جان کلاز نے کہا۔ "بے کار اور فالتو سامان سمندر کے حوالے کر دیا جائے تاکہ یہ اور تیز رفتاری سے چلے۔"

"جو تمہاری سمجھ میں آئے، کرو۔" میں نے اکتا کر کہا اور اس نے لکڑی کے ڈبے اٹھا کر لہروں کے سپرد کر دیئے۔ کچھوا ایک کونے میں پڑا تھا کبھی کبھار وہ اپنے خول میں سے سر نکالتا، حیرت کی نظروں سے اپنی گول گول پتلیاں گھما کر ہمیں دیکھتا اور پھر خول میں گھس جاتا۔ ماترو نے کچھ سوچا، پھر اپنا چاقو لے کر کچھوے پر پل پڑا۔ چند لمحوں بعد وہاں سبز سبز گوشت کے چند پارچوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ خول اور ہڈیاں اٹھا کر سمندر میں پھینک دی گئیں۔

"کاش! چولہا اور تیل سلامت رہتا، تو یہ گوشت بھون لیا جاتا۔" ماترو نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا پھر اس نے گوشت کا ایک ٹکڑا اٹھا کر کتے کی طرح سونگھا اور ڈرتے ڈرتے زبان باہر نکال کر چکھا، مگر گھبرا کر پرے پھینک دیا۔

"کچھوے کا کچا گوشت سخت کڑوا ہوتا ہے برخوردار! اور اسے ہضم کرنا بھی بہت

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

مشکل۔'' جان کلاز نے کہا۔ اب مہربانی کر کے اسے یونہی پڑا رہنے دو اور دعا کرو کہ آج کی طرح کل بھی تیز دھوپ نکلے تا کہ ہم اسے دھوپ میں پکا سکیں۔ شاید اس کے بعد یہ کھانے کے قابل ہو جائے۔ ذرا مجھے وہ تھیلا اٹھا دو جس میں فرسٹ ایڈ کا سامان بھرا گیا تھا۔ مجھے یاد ہے اس میں ہمارے کوڑھی دوستوں نے مچھلی پکڑنے کے کانٹے اور کچھ ڈوری بھی رکھ دی تھی۔''

وہ رات ہم نے فاقے سے کاٹی۔ نیند ایک لمحے کو بھی نہ آئی۔ یوں بھی میں بھیانک خواب دیکھ دیکھ کر اس قدر بدحواس ہو چکا تھا کہ پلک جھپکتے ہوئے بھی خوف آتا تھا' رات کے پچھلے پہر تاروں کی مدھم روشنی میں شمال مغرب کی طرف افق کے نزدیک سرمئی رنگ کی ایک گہری لکیر بہت دیر سے نظر آ رہی تھی۔ میں نے اسے اپنا وہم سمجھا اور اسی لیے ساتھیوں سے ذکر نہ کیا' لیکن جب یہ لکیر زیادہ واضح اور نمایاں ہونے لگی' تو میں نے جان کلاز کا شانہ ہلایا جو غنودگی کے عالم میں چت لیٹا تھا۔

''کیا بات ہے؟ کوئی نیا خطرہ؟ نئی آفت؟'' اس نے سکون سے پوچھا۔

''ممکن ہے آفت ہو اور ممکن ہے راحت ہو۔'' میں نے جواب دیا۔ ''مغربی افق پر مجھے سرمئی رنگ کی ایک گہری اور نمایاں لکیر دکھائی دے رہی ہے۔ شاید ہمارا اسٹیمر خشکی کے قریب پہنچنے والا ہے۔''

جان کلاز اور ماترو دونوں' اچھل کر کھڑے ہو گئے اور ہاتھوں کی دوربین بنا کر مغرب کی طرف دیکھنے لگے۔

''تمہارا خیال درست ہے کیپٹن!'' جان کلاز نے خوش ہو کر کہا۔ ''یہ کوئی جزیرہ ہے۔''

''وہی جزیرہ ہوگا جس کا ذکر ہم سے کیا گیا تھا۔''

''ہو سکتا ہے وہی ہو اور ہو سکتا ہے وہ نہ ہو۔''

اس سرمئی لکیر تک پہنچنے میں ہمارے اسٹیمر کو دو دن لگے۔ جوں جوں ہم نزدیک ہو رہے تھے' ہمارے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ جزیرے پر اونچی نیچی پہاڑیاں دکھائی دیں' ان پہاڑیوں کے دامن میں گھنا جنگل بھی نظر آیا۔ یہ جزیرہ ویران نہیں' سرسبز و شاداب تھا' لیکن اس وقت ہم اس حال میں نہ تھے کہ ساحل سمندر اور جزیرے کے حسن و جمال سے متاثر ہو سکتے' ہمیں جلد از جلد بھوک اور پیاس مٹانے کی فکر تھی۔

خدا خدا کر کے اسٹیمر کنارے پر آیا۔ ہم نے پوری طاقت صرف کر کے اس کا لنگر پانی میں گرایا' پھر ریت کے اندر تین بڑی بڑی آہنی میخیں ٹھونک کر اسے رسوں سے باندھ دیا۔ اس کے بعد میں نے رائفل سنبھالی' جان کلاز نے چاقو اور ماترو نے ہتھوڑا اٹھا لیا اور ہم گرتے پڑتے جزیرے کی سیاحت پر روانہ ہوئے۔ اردگرد کے آثار سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہاں کوئی آدمی ہے نہ حیوان' حالانکہ جزیرہ خاصا سرسبز تھا۔ یہاں پھل دار درختوں کی کثرت تھی اور قدرتی چشمے بھی پہاڑی کے دامن سے پھوٹ رہے تھے۔ ہم ندیدوں کی طرح اس پانی پر ٹوٹ پڑے۔ جی بھر کر پانی پیا' پھر درختوں سے آلوچے کے ذائقے اور خوشبو والا ایک سرخ پھل توڑ کر کھایا۔ ہر طرف خودرو لمبی لمبی گھاس سر اٹھائے کھڑی تھی۔ اس گھاس کے اندر جانے سے احتراز کیا۔ مبادا کوئی سانپ ہو اور جان کے لالے پڑ جائیں۔ درخت بندروں سے خالی تھے۔ جہاں تک گھومنے پھرنے کی ہمت پڑی ہم نے جزیرے کی دیکھ بھال کی اور یہ دیکھ کر حیرت کے ساتھ ساتھ خوف طاری ہونے لگا وہاں کوئی ذی حیات نہیں۔ جان کلاز کہنے لگا:

''کہیں ہم زمین کے دائرے سے نکل کر کسی اور سیارے میں تو نہیں پہنچ گئے۔ ایسے حالات تو کبھی دیکھے نہ سنے۔ خدا جانے اس میں کیا اسرار ہے۔ آدمی نہ آدم زاد' نہ بندر' نہ چوہا' نہ سانپ' نہ گیدڑ' نہ کیڑے مکوڑے' نہ پرندے..... کوئی جاندار یہاں نہیں بستا۔ موسیو پیپلن' میرا دل گھبرا رہا ہے۔ جتنی جلد ممکن ہو اس منحوس مقام سے نکل چلو' خدا کے لیے دیر نہ کرو ورنہ کوئی ناگہانی آفت ہم پر ٹوٹ پڑے گی۔'' جان کلاز جیسا متحمل مزاج' پرسکون شخص بے حد مضطرب اور خوفزدہ نظر آنے لگا۔ میں نے یہ وہم اس کے دماغ سے نکال دینے کے لیے بحث کرنا چاہی مگر وہ سنی ان سنی کر کے ساحل کی طرف دوڑنے لگا۔ مجبوراً ہم بھی اس کے پیچھے دوڑے۔ ساحل پر پہنچ کر وہ ریت پر لمبا لمبا لیٹ گیا اور بری طرح ہانپنے لگا۔

''آخر بات کیا ہے؟ تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟'' میں نے سانس بحال کرنے کے بعد پوچھا۔ ''مجھے تو یہاں کوئی خرابی بظاہر دکھائی نہیں دیتی سوائے اس کے کہ یہاں کوئی اور جاندار نظر نہیں آیا۔''

''بس یہی سب سے بڑی خرابی ہے پیپلن'' جان کلاز نے بدستور ہانپتے ہوئے جواب دیا۔ ''جانوروں اور پرندوں کے یہاں نہ پائے جانے کی وجہ صرف یہ ہو سکتی ہے کہ جزیرے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کی آب وہوا سخت زہریلی ہے۔ اگر ہم یہاں زیادہ دیر رہے تو دیکھ لینا باری باری مر جائیں گے' حماقت یہ ہوئی کہ سوچے سمجھے بغیر ہم نے پہاڑی چشموں سے پانی پی لیا خدا خیر کرے!''

''اور وہ سرخ آ.....لوچے بھی تو کھائے ہیں ہم نے'' ماترو نے یاد دلایا۔

''ہاں' ہاں! اگل دو سب کھایا پیا' اس میں دیر نہ کرو' فوراً قے کر ڈالو۔'' جان کلاز بیٹھا اور اس نے اپنے حلق میں انگلی ڈال کر قے کر ڈالی۔ ماترو نے بھی اس کی تقلید کی۔ میں کیوں پیچھے رہتا؟ مجھے بھی الٹی کرنی پڑی۔ قے کرنے کے بعد ہم کنارے پر آ گئے اور سمندر کے کھاری پانی سے اپنا منہ صاف کیا۔ اس وقت نقاہت اتنی تھی کہ ذرا سی حرکت کرنے کو بھی دل نہ چاہتا تھا۔ کبھی جزیرے کے حسن وشادابی پر نظر جاتی اور جی چاہتا کہ ساری زندگی یہیں بسر ہو۔ کبھی اس کے ڈراؤنے اور پراسرار ماحول کا خیال آتا تو بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ کتنی عجیب بات تھی کہ تقریباً چار میل لمبے اور نصف میل چوڑے جزیرے میں حیوان اور کوئی کیڑا مکوڑا نہ تھا۔

قے کرنے سے کچھ تسکین تو ہوئی مگر تھوڑی دیر بعد ہی معدے میں انتڑیوں نے ایک دوسرے کو کھانا شروع کر دیا ہم پاس پاس لیٹے ہوئے تھے اور تھوڑی دیر بعد آنکھیں کھول کر اطمینان کر لیتے کہ ہم سب زندہ ہیں یا مر گئے؟ ماترو کا جسم آپ ہی آپ اینٹھنے لگا' اس کی آنکھیں ابلنے لگیں اور ہونٹ جھاگ سے بھر گئے۔

''م.....میں.....مر.....رہا.....ہوں۔'' اس نے حد درجہ کرب سے تڑپتے ہوئے کہا'

''کوئی میرا گلا گھونٹ رہا ہے۔'' میں اور جان کلاز اس کی حالت میں یہ بھیانک تغیر دیکھ کر حیران رہ گئے۔ لیکن ہم اپنے پیارے ساتھی کی کوئی مدد کرنے سے مطلق قاصر تھے۔ نہ جانے اسے کیا ہوتا جا رہا تھا۔

''سب اس منحوس جزیرے کے پانی اور پھلوں کی کارستانی ہے۔'' جان کلاز نے کہا اور ماترو پر جھک کر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''خدا کی پناہ! لڑکے کا جسم تو آگ.....ہو رہا ہے' میرا خیال ہے اس کے معدے میں زہریلے پانی اور سرخ پھلوں کے گودے کی کچھ نہ کچھ مقدار اب بھی موجود ہے' ماترو بیٹے سنبھلو' اٹھ کر ایک قے اور کر ڈالو جلدی کرو بیٹا۔''

لیکن اس کی حالت لحہ بہ لحہ بگڑتی جا رہی تھی' ہونٹوں کے کناروں سے جھاگ برابر بہہ بہہ کر گردن تک آ رہا تھا۔ چہرے کا رنگ ہلدی کی مانند پیلا پڑ چکا تھا جیسے جسم کا تمام خون کسی ان دیکھی خبیث روح نے چوس لیا ہو۔

''پیپلن! اگر تم کو اپنی' میری اور اس بچے کی زندگی عزیز ہے تو اب بھی وقت ہے ہمت سے کام لو اور اس جزیرے سے نکل بھاگو۔ آؤ ہم اسے اٹھا کر اسٹیمر تک لے چلیں۔''

جان کلاز نے اس کے دونوں بازو پکڑے اور میں نے ٹانگیں' پھر ہم اسے تقریباً گھسیٹتے ہوئے اس مقام کی جانب لے چلے جہاں ہمارا اسٹیمر پانی میں کھڑا ہلکی ہلکی لہروں کے تھپیڑے کھا رہا تھا۔ ایک ڈیڑھ فرلانگ کا فاصلہ طے کرنا ہمارے لیے قیامت ہو گیا۔ اس ایک من دس سیر وزنی لڑکے کو اٹھانا یا گھسیٹنا اتنا دشوار دکھائی دیا جیسے ہزاروں من کا بوجھ ہمارے سروں پر رکھ دیا گیا ہو۔ بازوؤں اور ٹانگوں میں سے جان آہستہ آہستہ سے نکلی جا رہی تھی اور ہانپ ہانپ کر خود ہمارے ہونٹوں سے ویسا ہی جھاگ نکلنے لگا تھا جیسا ماترو کے منہ سے نکل رہا تھا۔ راہ میں تین مرتبہ رک کر ہم نے سانس ٹھیک کرنا چاہا مگر بے سود۔ ادھر ماترو کی کربناک حالت دیکھ کر ہمارے ہوش وحواس رخصت ہوئے جاتے تھے۔ سمجھ میں نہ آتا تھا لڑکے کو ایکا ایکی کس مرض نے اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ خود مجھے ہر آن ایسا لگ رہا تھا جیسے میں بھی اسی تکلیف سے دوچار ہونے والا ہوں۔

خدا خدا کر کے اسے ہم نے اسٹیمر میں پھینکا' جلدی جلدی میخیں اکھاڑیں' لنگر اٹھایا' بادبان کھولا' چپو سنبھالے اور جزیرے پر الوداعی نظر ڈالتے ہوئے پھر کھلے سمندر میں آ گئے۔ سورج نکلے دو گھنٹے ہو چکے تھے' سمندر میں تلاطم یا طوفان کے کوئی آثار نہ تھے۔ ہوا کا رخ بھی ہماری خوش قسمتی سے شمال مغرب کی طرف تھا۔ آدھ گھنٹے چپو چلانے کے بعد ہم تھک کر بے دم ہو گئے اور اسٹیمر کو لہروں کے سپرد کر دیا۔ ماترو آنکھیں بند کیے بے حس وحرکت پڑا تھا۔ نیلا نیلا جھاگ اس کے منہ سے نکلنا بند ہو گیا لیکن سانس کی آمد ورفت بہت سست تھی۔ چہرے کا رنگ ابھی تک زرد زرد تھا' ہم نے ڈرم میں سے بارش کا جمع کیا ہوا پانی نکال کر اس کا منہ صاف کیا پھر حلق میں چند قطرے ٹپکائے اور آہستہ آہستہ اس کے تلوؤں کی مالش کی۔ چند منٹ بعد اس نے کروٹ لی اور آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھوں میں دہشت کے سائے رقصاں تھے۔

''اب کیا حال ہے ماترو؟ تمہیں کیا ہو گیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''کیا ہم سمندر میں سفر کر رہے ہیں؟'' اس نے کھلے اور پھولے ہوئے بادبان پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور دوبارہ اپنا سوال دہرایا۔ وہ کچھ دیر میری آنکھوں میں جھانکتا رہا پھر مری ہوئی آواز میں بولا:

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

''نہیں معلوم مجھے کیا ہو گیا تھا۔ ایسا لگا جیسے معدے میں کسی نے تیزاب انڈیل دیا ہو' سینے میں تیز تیز ٹیسیں سی اٹھنے لگیں اور سانس رکنے لگا۔ سارا بوجھ میرے گلے پر پڑ رہا تھا۔ میں سمجھا کوئی میرا گلا گھونٹ رہا ہے..... لیکن وہاں تو آپ دونوں کے سوا کوئی نہ تھا شاید یہ ان سرخ آلوچوں کا اثر تھا جو میں نے ضرورت سے زیادہ مقدار میں کھا لیے تھے یا پھر چشمے کے پانی میں زہر ہوگا بہرحال اب میں کسی قدر بہتر ہوں۔ آپ کا کیا حال ہے۔

ہم نے بتایا کہ محض کمزوری ہے اور وہ بھی بھوک کے باعث کچھوے کا گوشت جو ہم نے تین روز قبل دھوپ میں سکھایا تھا' سخت بدبودار اور بدذائقہ ہونے کے باوجود ہم ہڑپ کر گئے تھے۔ اس کے علاوہ اسٹیمر کے کونوں کھدروں میں پڑی ہوئی کچی سارڈین مچھلیوں سے بھی بھوک مٹائی تھی اور اب ہمارے پاس کھانے کی کوئی چیز نہ تھی۔ جان کلاز نے اردگرد چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کو پانی میں اچھلتے اور غوطے لگاتے دیکھا تو پھر اپنا کانٹا اور ڈوری سنبھالی۔ تلاش کر کے بطور چارہ کچھوے کے گوشت کا ایک چھوٹا سا لوتھڑا اس میں پھنسایا اور ڈوری سمندر میں پھینک دی' حرکت کرتے ہوئے اسٹیمر پر سے اس انداز میں مچھلی کو شکار کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہوتا ہے لیکن انسان امید اور آس کے اعتبار پر ایسی غیر ممکن حرکتیں کر کے ہی دل و دماغ کو تسکین دیتا رہتا ہے۔

میں اوندھے منہ لیٹ کر سو گیا اور دیر تک سوتا رہا۔ آنکھ کھلی تو معلوم ہوا' سورج حسب معمول مغرب میں ڈھلنے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ میرے قریب ہی جان کلاز لیٹا لیٹا گہرے سانس لے رہا تھا' اس کی آنکھیں بند تھیں۔ چند دن کے اندر اندر اس کے گال اندر کو دھنس گئے تھے۔ رخساروں پر تین انچ لمبی گھنی ڈاڑھی اُگ آئی تھی اور ناک کا بانسا مڑ رہا تھا' اس کے کپڑے پھٹ کر تار تار ہو رہے تھے۔ اپنے ساتھی کی یہ حالت دیکھ کر میری آنکھیں بھر آئیں لیکن اپنی حالت پر نگاہ کی تو مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ میں اس سے کہیں بدتر کیفیت سے گزر رہا تھا۔ فرسٹ ایڈ کے تھیلے میں سے آئینہ نکال کر اپنا جائزہ لیا تو خوش رو' صحت مند اور نوجوان پیپلن کی جگہ ایک عجیب الخلقت حیوان نظر آیا۔ زرد آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی' گالوں کی ہڈیاں تپ دق کے مریض کی مانند ابھری ہوئی' ہونٹ خشک' ڈاڑھی اور مونچھوں کے بال بے تحاشا بڑھے اور الجھے ہوئے' گلے کی قمیص اور اس کے اوپر کا سویٹر جگہ جگہ سے پھٹا ہوا'

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

پتلون کے پائنچے ادھڑے ہوئے' گھٹنوں پر سے دو دو انچ کپڑا غائب۔ جا بجا ہاتھوں پیروں پر زخموں کے نشان' ان پر کالا سیاہ کھرنڈ جما ہوا..... اس حالت میں مجھے میری سگی ماں بھی دیکھتی تو کبھی نہ پہچان سکتی' پانی کے ڈرم میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر اتنا پانی موجود تھا کہ اگر ہم کفایت سے کام لیتے تو کئی دن آسانی سے نکال سکتے تھے۔ میں نے چلو بھر پانی سے حلق تر کرنے پر اکتفا کیا۔ پھر اسٹیمر کا جائزہ لیا۔ وہ صابر رفتار تھا اور شام کے وقت والی ہوا کے سہارے ایک نامعلوم اور ان جانی منزل کی طرف ہمیں لیے جا تا تھا۔

''توقع کے بالکل خلاف پانچ پونڈ وزن کی ایک مچھلی کانٹے میں پھنس گئی تھی۔'' جان کلاز نے یک دم آنکھیں کھولیں اور نحیف آواز میں یہ خوش خبری سنائی۔ اس کے لیے مسلسل تین گھنٹے تک بیٹھنا اور انتظار کرنا پڑا۔ وہ دیکھو کونے میں پڑی ہے چاہو تو اسے کچا چبا لو چاہو تو اسے کل کے لیے رکھ لو' دھوپ میں نمک لگا کر رکھ دیں گے۔ دو گھنٹے بعد خستہ ہو جائے گی اور اس کا بدبودار پانی بھی نکل جائے گا۔''

''آہ! اس کا مطلب ہے ہمیں آج کی رات پھر فاقہ کرنا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے؟ سمندر بہرحال ہم سے انتقام لے رہا ہے۔''

''خوب ہے یہ انتقام!'' میں نے ہنستے ہوئے کہا' ''کیا ایک انسانی جان لے کر بھی سمندر کے انتقام کی پیاس نہیں بجھی؟ اگر ایسا ہی ہے تو میں پانی میں کود جانے کو تیار ہوں۔''

یہ سن کر جان کلاز بھی ہنس دیا اور بولا:

''نہیں' سمندر تمہاری جان کا نذرانہ قبول نہ کرے گا۔ اگر تم پانی میں کود جاؤ تب بھی مجھے یقین ہے سمندر تمہیں کچھ نہ کہے گا۔ آزمائش شرط ہے۔''

میں نے پانی پر نگاہ ڈالی کسی سبک روندی کی مانند سمندر خاموشی سے بہہ رہا تھا۔ اونچی اونچی تند خو لہریں اور دیو پیکر برافروختہ موجیں نہ جانے کہاں چلی گئی تھیں۔ میں اسے کسی غیبی قوت کا کرشمہ ہی کہوں گا جس نے مجھے ایسی حماقت پر مجبور کیا۔ سوچے سمجھے بغیر میں اٹھا اور اس سے پہلے کہ جان کلاز مجھے روکنے کی کوشش کرتا میں نے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔

✣ ✣ ✱ ✣ ✣

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

.....6.....

جس وقت میں نے سمندر میں چھلانگ لگائی' نہیں کہہ سکتا وہ وقت کون سا تھا۔ دیوانگی یا فرزانگی کا یا اس سے بھی پرے کوئی اور ذہنی کیفیت تھی۔ جان کلاز کے چلانے کی آواز میرے کان میں آئی۔ وہ کہہ رہا تھا: ''ارے یار! کیا غضب کرتے ہو؟ میں نے تو مذاق میں یہ بات کہی تھی۔'' پانی میں گرتے ہی جیسے ان دیکھی قوت نے میرے لیے اپنی آغوش پھیلا دی تھی۔ میں سر کے بل گہری' اندھی اور تاریک دنیا میں ڈوبتا چلا گیا۔ ایک لمحے کے لیے گردن موڑ کر اسٹیمر کی طرف دیکھا تھا۔ مجھے ماترو اور جان کلاز کے خوف زدہ چہرے نظر آئے تھے جو پلک جھپکتے میں غائب ہو گئے۔ پھر میں نے اپنے آپ کو بہاؤ کے ساتھ ساتھ پیرتے' ڈوبتے' اچھلتے اور قلابازیاں کھاتے پایا۔ سمندر کی لہریں مجھ سے شوخیاں اور اٹھکھیلیاں کر رہی تھیں۔ ابھی مشکل سے سو سوا سو گز دور گیا ہوں گا کہ عقب سے دس بارہ فٹ اونچی ایک لہر بل کھاتی' جھومتی آئی' مجھے آہستہ سے اوپر اٹھایا اور پھر میں فضا میں بلند ہوتا گیا۔ اوسان بحال ہوئے تو دیکھا کہ میں اسٹیمر کے اندر پڑا ہوں۔ اس لہر نے مجھے ٹھیک اسٹیمر کے اندر پٹخا تھا۔ یہ نہایت حیرت انگیز کرشمہ تھا یا خدائی نور۔ کوئی مجھے لاکھوں قسمیں کھا کر بھی یقین دلاتا کہ ایسا ممکن ہے تو میں کبھی یقین نہ کرتا۔

وہ رات ہم نے کروٹیں بدل بدل کر ہذیانی ہیجان میں گا گا کر' گالیاں بک بک کر کاٹی' سورج نکلتے ہی ہمارے ہوش و حواس جیسے خود بخود درست ہو گئے۔ ان دنوں یہ عجیب انکشاف ہوا کہ سورج کا دیدار اور اس کی روشنی کتنی عظیم نعمت ہے۔ ایسی نعمت جو ہزاروں وسوسے' لاکھوں وہم اور نہ جانے کتنے بھیانک احساسات و تصورات کو چشم زدن میں ذہن سے کھرچ کر دور پھینک دیتی ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ زمانہ قدیم میں اور اب بھی کہیں کہیں لوگ سورج کی پوجا کرتے ہیں۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

شکار کی ہوئی مچھلی کے قتلے کیے گئے اور ہم فاقہ زدہ شکاری کتوں کی طرح ان قتلوں کے دھوپ میں خستہ ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ ہماری بے صبر نظریں ان چھوٹے سفید گوشت کے لوتھڑوں پر یوں جمی ہوئی تھیں کہ نگہبانی میں ذرا سی بھی غفلت ہوئی تو انہیں کوئی اور اچک لے جائے گا۔ نقاہت اس درجے بڑھ چکی تھی کہ ہوا نے جب اسٹیمر کا رخ شمال مغرب سے کچھ ہٹا دیا تب بھی ہم نے کچھ پروانہ کی اور یہ سوچ کر دل کو تسلی دے لی کہ اسٹیمر خود بخود ہی راہ راست پر آ جائے گا' ہم کہاں تک بازو آزمائے جائیں۔ اس یقین کا نتیجہ بلا شبہہ یہی نکلا کہ چند میل دور جانے کے بعد اسٹیمر خود بخود صحیح راستے پر رواں دواں ہو گیا۔

ہم پانچ روز کسی نئے حادثے کے بغیر مسلسل سمندر میں سفر کرتے رہے۔ یہ زندگی اور اس کی تمام دلچسپیوں سے بیزار کر دینے والا سفر تھا۔

جان کلاز دن دن بھر ایک اونچے سے تختے پر بیٹھا' ڈوری اور کانٹا پانی میں پھینک کر مچھلیوں کا انتظار کرتا ایک آدھ بار کوئی مچھلی پھنس جاتی اور ہم تینوں بمشکل ڈوری گھسیٹ کر مچھلی پکڑ لیتے ورنہ تمام دن فاقے سے گزر جاتا۔ ہماری پسلیاں نمایاں ہو گئی تھیں اور پیٹ سکڑ کر پیٹھ سے جا لگے تھے۔ وہ بازو جن میں کبھی مچھلیاں تڑپا کرتی تھیں اب خشک لکڑیوں کی مانند سوکھ گئے تھے۔ کلوں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ داڑھی مونچھوں اور سر کے بال بڑھ کر آپس میں بری طرح الجھ چکے تھے۔

چھٹے روز رات کے وقت پھر ایک ہولناک طوفان نے ہمیں دبوچ لیا۔ پہلے تو بارش ہوئی جس میں ہم نے منہ کھول کھول کر کئی روز کی پیاس بجھائی۔ پھر خوب نہائے اور جسموں پر سے سمندری نمک اتارا۔ اس کے بعد ڈرم میں پانی جمع کیا۔ اسٹیمر کو اونچی اونچی لہریں جھولا جھلا رہی تھیں۔ کبھی ہم ایک طرف لڑھک جاتے' کبھی دوسری طرف۔ جوں جوں رات بھیگتی گئی' طوفان کی شدت میں اضافہ ہوتا گیا۔

سورج نکلنے سے تھوڑی دیر پہلے یہ طوفان کم ہوا: البتہ بارش برابر ہوتی رہی۔ اسٹیمر' برق رفتاری سے نامعلوم منزل کی طرف اڑا جا رہا تھا۔ ہمارے پاس پینے کے پانی کی اچھی خاصی مقدار جمع تھی اور اسٹیمر کے اندر بھی بارش کا پانی خوب بھرا ہوا تھا۔ ہم نے محسوس کیا کہ اگر پانی اسی طرح بھرا رہا تو اسٹیمر کسی بھی وقت ڈوب سکتا ہے۔ چنانچہ یہ پانی نکالا گیا۔ اتنے ہی سے کام نے ہمیں بری طرح نڈھال کر دیا تھا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

سورج اس وقت عین ہمارے سروں پر تھا جب ہم نے بہت دور ایک دھبے کی مانند آہستہ آہستہ حرکت کرتا ہوا ایک بحری جہاز دیکھا۔ پھر یہ دھبہ خاصا بڑا ہو گیا اور تھوڑی دیر بعد ہی ہمیں پتہ چل گیا کہ جہاز ہماری طرف ہی بڑھ رہا ہے لیکن ایک گھنٹے اس کی حرکات کا جائزہ لینے سے احساس ہوا کہ یہ ہماری جانب تو نہیں بڑھ رہا۔ البتہ اسی سمت میں جا رہا ہے جدھر ہمارے اسٹیمر کا رخ ہے۔ ممکن ہے جہاز والے ہمارے اسٹیمر کو دیکھ لیں اور رخ بدل کر ادھر ہی آ جائیں۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد ماترو نے خوشی سے چلا کر کہا:

''وہ ہماری طرف آ رہے ہیں..... انہوں نے ہمیں دیکھ کر راستہ بدل لیا ہے۔''

ہم دھڑکتے دل اور اشتیاق بھری نظروں سے اس بحری جہاز کو دیکھنے لگے۔ وہ ایک چھوٹا سا آئل ٹینکر تھا۔ جب زیادہ قریب آیا تو ہم نے دیکھا اس کے برج پر عورتوں اور آدمیوں کا ایک ہجوم ہے جو حیرت اور تجسس کی نظروں سے ہمیں دیکھ رہا ہے۔ پھر ہمیں جہاز کے وردی پوش آفیسر اور ملاح بھی نظر آئے۔ عورتوں کے لباس خاصے شوخ اور مردوں نے موسم کے مطابق سوٹ پہن رکھے تھے۔ یہ بات میرے لیے باعث حیرت تھی کہ ایک آئل ٹینکر پر بھی مسافر ہو سکتے ہیں۔ جہاز نے اب اپنی رفتار خاصی ہلکی کر دی تھی۔ اسٹیمر سے اس کا فاصلہ زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو فٹ ہوگا۔ اتنے میں نیلی وردی پہنے ہوئے جہاز کا کپتان نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں سفید رنگ کا چھوٹا سا بھونپو تھا۔ اس نے یہ بھونپو اپنے منہ سے لگایا اور پکار کر انگریزی زبان میں کہا:

''تم لوگ کہاں سے آئے ہو؟''

''فرنچ گیانا سے۔'' میں نے جواب دیا۔

''کیا تم فرانسیسی بول سکتے ہو؟'' ایک عورت اپنے منہ پر دونوں ہاتھ رکھ کر چلائی۔

''ہاں مادام، ہم فرانسیسی جانتے ہیں۔''

''اس گہرے سمندر میں اتنی چھوٹی کشتی کے ساتھ سفر کرنا بے وقوفی ہے'' آواز آئی۔

''بے شک..... لیکن ہم یہ سفر کرنے پر مجبور ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

یہ آئل ٹینکر غالباً برٹش تھا، کیونکہ اس کا کپتان اور ملاح انگریزی بول رہے تھے اور فرانسیسی زبان نہیں جانتے تھے۔ انہوں نے اس فرانسیسی عورت کو ترجمان بنا کر ہم سے کہا کہ وہ ہمیں جہاز پر سوار کرانے کے لیے تیار ہیں اور ہمارے اسٹیمر کو بھی اپنے ساتھ باندھ لیں

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

گے۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا۔ ان کا جواب یہ تھا کہ ابتر حالت کے پیش نظر یہ پیش کش قبول کر لینی چاہیے، لیکن احتیاط کا تقاضا ہے کہ ہم جہاز پر سوار نہ ہوں ممکن ہے یہ ٹینکر فرانس ہی جا رہا ہو اور وہاں ہم دھر لیے جائیں، چنانچہ میں نے پکار کر کہا:

''اس مدد کے لیے میں کپتان صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ان سے کہیے ہم اپنے اسٹیمر پر ہر طرح محفوظ اور خوش ہیں۔''

عورت نے انگریزی میں ہماری بات کا مطلب کپتان کو سمجھایا۔ اس نے گردن ہلائی، عورت سے کچھ کہا، اس نے فرانسیسی میں ہم سے کہا:

''تم لوگ یہ پیش کش قبول کیوں نہیں کرتے؟''

''ہم قیدیوں کے جزائر سے بھاگے ہوئے مجرم ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی جائے گی، مطمئن رہو۔'' کپتان نے کہلوایا۔ ہم نے نفی میں ہاتھ ہلائے۔ پھر کپتان نے پوچھا، ہماری منزل کون سی ہے، ہم نے بتایا۔ فرانس اور فرانسیسی مقبوضہ علاقوں کے سوا، تقدیر جہاں بھی لے جائے ہم جانے کو تیار ہیں۔ پھر ہم سے پوچھا گیا آیا ہم انگریزی زبان میں چھپا ہوا نقشہ سمجھ لیں گے۔ ہم نے جواب اثبات میں دیا۔ چند لمحے بعد انہوں نے ہمیں اسٹیمر جہاز کے بالکل نیچے لانے کا اشارہ کیا۔ ہم نے تعمیل کی۔ اوپر سے ایک بڑی سی ٹوکری، رسی میں باندھ کر ہمارے اسٹیمر کے عین اوپر لٹکا دی گئی۔ اس ٹوکری میں کھانے پینے کی چیزیں بھری تھیں۔ ابلا ہوا گوشت، پھل اور انڈے ان سب کے اوپر لپٹا ہوا ایک لمبا سا کاغذ۔ کھولا، اردگرد کے تمام جزائر اور ریاستوں پر مشتمل ایک عمدہ نقشہ تھا۔

''نقشے کو غور سے دیکھو۔'' کپتان کی زیر ہدایت اس فرانسیسی عورت نے بھونپو اپنے منہ سے لگا کر کہا، ''مغرب کی طرف سارے جزیرے برطانیہ کے قبضے میں ہیں۔ ان میں سے کسی ایک میں تم پناہ لے سکتے ہو۔''

ٹرینیڈاڈ..... کم از کم دو دن کی مسافت پر ہے۔'' کپتان کی طرف سے جواب آیا اس کے بعد جہاز والوں نے الوداعی اشارے کیے، فرانسیسی خاتون نے آواز دے کر کہا:

''ہم سب تمہاری کامیابی کے خواہش مند ہیں..... اس جرأت و استقلال پر کپتان صاحب تمہیں آفرین کہتے ہیں۔''

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

لیکر کو دیکھ رہے تھے جو کبھی پوری طرح نظر آنے لگتی' کبھی غائب ہو جاتی' سہ پہر کے چار بجے ہم اس قدر نزدیک پہنچ گئے کہ اس لیکر کے ساتھ ساتھ درختوں کے جھنڈ اور ان درختوں کے عقب میں چھوٹی بڑی عمارتوں کی چھتیں صاف دکھائی دینے لگیں۔ پھر ایک گھنٹے بعد ہمیں ساحل پر چلتے پھرتے لوگ اور وہاں ٹھہری ہوئی کشتیاں' لانچیں اور اسٹیمر نظر آئے۔ انہوں نے بھی ہمیں دیکھ لیا تھا۔ رفتہ رفتہ گھومتے پھرتے اور نہاتے ہوئے مرد و زن اور بچے ایک جگہ جمع ہونے لگے۔ بیس منٹ کے اندر اندر ساحل پر کوئی دو تین ہزار افراد کا مجمع تھا اور سب کے سب حیرت و شوق سے ہماری آمد کے منتظر۔ بہت سوں نے اپنی اپنی ٹوپیاں ہلا ہلا کر اور فضا میں اچھال کر خوشی سے نعرے بھی لگائے جیسے ہم بہت بڑے ہیرو ہیں جو سمندر کی کوئی ناقابل تسخیر مہم کامیابی کے ساتھ سر کر کے آ رہے ہیں۔

پھر جونہی ہمارا اسٹیمر ایک جگہ رکا بے شمار آدمی دوڑتے ہوئے اور گھٹنوں گھٹنوں پانی میں اچھلتے کودتے ہماری طرف بڑھے ان کے آگے آگے تین آدمی وردیاں پہنے اور پیٹی کے ساتھ لمبے لمبے ریوالور لٹکائے چل رہے تھے دو سیاہ فام اور ایک سفید چمڑی والا کوئی انگریز۔

''خوش آمدید دوستو!'' سفید فام نے ہاتھ اٹھا کر ہمیں سیلوٹ کیا..... فرینیڈو کا قصبہ آپ کا استقبال کرتا ہے۔ آپ ٹرینیڈاڈ کے جزیرے پر ہیں۔''

ہمیں خوشی ہوئی کہ سفید فام انگریز فرانسیسی بول رہا تھا۔ نہ جانے اس نے کیسے بھانپ لیا کہ ہم تینوں فرانسیسی ہیں۔ پھر اس نے ہم سے باری باری ہاتھ ملایا۔ مجمع میں ہر فرد ہم سے ہاتھ ملانے اور قریب سے ہماری ایک جھلک دیکھنے کو بے تاب تھا۔ سفید فام کے دونوں کالے سپاہی ڈانٹ ڈانٹ کر لوگوں کو پیچھے ہٹنے اور دھکم پیل سے باز رہنے کی تلقین کر رہے تھے۔

''آپ لوگ اپنا اسٹیمر یہیں چھوڑ دیں' کوئی شخص کسی چیز کو نہ چھیڑے گا۔'' سفید فام آفیسر نے کہا۔ ''آپ اطمینان سے شہر میں گھومیں پھریں اور پولیس اسٹیشن میں متعلقہ انچارج کو اپنی آمد کی اطلاع بھی دے دیں۔''

اسٹیمر کو لنگر انداز کر کے اور بچا کھچا سامان اسی میں چھوڑ کر ہم ساحل پر اترے۔ لوگ مصافحے اور معانقے کے لیے ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ ان کے اس انداز میں اس قدر والہانہ پن'

ہم نے بھی ان کی مدد کا دوبارہ شکریہ ادا کیا۔ آہستہ آہستہ جہاز دور ہٹنے لگا اور اس کی رفتار بڑھنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ افق کی سیاہ لکیر کے پاس پہنچ کر ایسا ہی سیاہ دھبا نظر آنے لگا جیسا ابتداء میں دکھائی دیا تھا۔ یہ بلاشبہ ہمارے لیے بہت بڑی غیبی مدد تھی جو نہ جانے کس کی نیکیوں کے صلے میں اچانک مل گئی تھی۔ ہم نے خوش ذائقہ پھل اور گوشت مزے لے لے کر کھایا اور تن بدن میں قوت کی نئی لہریں سی اٹھنے لگیں۔ ٹوکری میں اتنی خوراک موجود تھی جو شاید چار دن تک ساتھ دے جاتی اور اب ہمیں پورا یقین تھا کہ سمندر کا یہ ہولناک سفر اختتام کو پہنچنے والا ہے۔ خدا نے چاہا تو ہم دو روز بعد ٹرینیڈاڈ کے ساحل کو چھو رہے ہوں گے۔

✣ ✣ ✱ ✣ ✣

دو روز بخیر و عافیت گزر گئے۔ کوئی حادثہ رونما نہ ہوا' سمندر پُرسکون اور آسمان معتدل۔ ٹرینیڈاڈ کا ساحل ابھی نگاہوں سے اوجھل تھا کہ سفید سفید مرغابیوں اور چھوٹے چھوٹے حسین بگلوں کی لمبی لمبی ڈاریں' مشرق سے مغرب کی جانب پرواز کرتی دکھائی دیں۔ بحری پرندوں کا دکھائی دینا اس بات کی نشانی ہے کہ زمین قریب ہے۔ ماترو کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا' نئی دنیا' نئی سرزمین دیکھنے کا جوش کسے نہیں ہوتا؟ اور پھر یہ تو انیس برس کا ایک ناتجربہ کار معصوم لڑکا تھا۔ جس کے گوشت پوست میں سیر و سیاحت اور مہم جوئی کا ولولہ کوٹ کوٹ کر بھر دیا گیا تھا۔ جان کلاز کی کیفیت بھی ماترو سے مختلف نہ تھی۔ اس پختہ ذہن' پختہ عمر کے حد درجہ تجربہ کار آدمی کے سامنے بھی زندگی کی وہ منزلیں تھیں جنہیں دیکھنے کا کبھی اسے خیال بھی نہ آیا تھا۔ پھر سب سے بڑی تسکین دہ بات یہ تھی کہ ہم اب آزاد انسانوں کی طرح ایک آزاد اور خود مختار برٹش حکومت کے زیر سایہ زندگی کے چند دن گزارنے جا رہے تھے۔ ہمیں پورا یقین تھا کہ ٹرینیڈاڈ میں ہمارا استقبال خوش دلی اور برادرانہ جذبات کے ساتھ کیا جائے گا۔

صبح نو بجے کا وقت تھا کہ مغربی افق پر ایک سرمئی لکیر نظر آئی اور ہم تینوں خوشی سے اچھل پڑے۔ آپس میں بغلگیر ہوئے اور بچوں کی مانند گلے پھاڑ پھاڑ کر نعرے لگانے لگے۔ اس وقت ہمیں اس عالم میں کوئی دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ پاگل ہو گئے ہیں۔ مشرقی ہوائیں اسٹیمر کو دھکیل دھکیل کر مغرب کی جانب لے جا رہی تھیں اور ہم آنکھوں کی دوربینیں بنائے اس سرمئی

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

خلوص اور شفقت تھی کہ ہمیں شبہ ہونے لگا کہیں یہ لوگ ہمارا مذاق تو نہیں اڑا رہے مگر ایسا نہ تھا۔ اس وقت تک ہم نے ان لوگوں کا جائزہ لے لیا تھا' ان میں سفید فام بہت کم اور سیاہ فام یا ایشیائی قوموں کے افراد زیادہ نظر آتے۔ افریقہ کے حبشی بھی تھے اور ہندوستان کے باشندے بھی' مصر والے بھی اور انڈونیشیا کے باسی بھی' چند چینی اور جاپانی چہرے بھی دکھائی دیئے۔ ہندوستانی عورتیں ساڑھیاں باندھے اور چوٹی کے بال جوڑے کی شکل میں لپیٹے ادھر اُدھر گھوم رہی تھیں۔

ہم ساحل کے قریب ہی کچھ فاصلے پر بنے ہوئے ایک ریستوران کی طرف بڑھے۔ وہاں بہت سے لوگ بیٹھے اپنی اپنی پسند کے مشروب اور کھانے کی چیزوں سے شغل کر رہے تھے۔ آہستہ آہستہ مجمع چھٹنے لگا اور ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔ یہاں لوگوں نے خود بخود مجھے کیپٹن کیپٹن کہہ کر مخاطب کرنا شروع کر دیا۔ ان کا خیال تھا ایسے چھوٹے سے اسٹیمر میں ہم تین آدمیوں کا انتہائی خطرناک سینکڑوں میل کا سمندری سفر حد درجہ مہارت اور دلیری کا ثبوت ہے۔ ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے تک آناً فاناً ہماری کہانی پہنچ گئی۔ ریستوران کے مالک نے کاؤنٹر سے اٹھ کر خود ہم سے اشاروں میں دریافت کیا ہم کیا کھانا اور کیا پینا پسند کریں گے۔ اس نے یہ بھی واضح کر دیا کہ وہ کسی چیز کی قیمت ہم سے وصول نہیں کرے گا۔ مالک نے ایک ویٹر کو بلا کر انگریزی میں کچھ سمجھایا۔ چند منٹ بعد وہ ایک بڑی ٹرے میں بھنے ہوئے گوشت کے پارچے' انڈوں کا آملیٹ چند تازہ روٹیاں اور تر بوز سجا کر لے آیا۔ ہم نے ڈٹ کر کھانا کھایا۔ چند لمحوں بعد وہی ویٹر مالک کے اشارے پر سگرٹوں کے تین پیکٹ اور ماچسیں لے کر نمودار ہوا۔ ابھی ہم نے سگریٹ سلگا کر دو تین کش لیے ہی تھے کہ سامنے کی کرسیوں سے اٹھ کر ایک عمر رسیدہ اور باوقار آدمی ہماری جانب آیا۔ اس کے عقب میں دو عورتیں بھی تھیں۔ ایک ادھیڑ عمر کی اور دوسری بالکل نوجوان' کوئی سترہ اٹھارہ برس کی لڑکی۔

''اگر اجازت ہو تو ہم لوگ آپ کے پاس بیٹھ جائیں۔'' آدمی نے عمدہ فرانسیسی بولتے ہوئے کہا۔ میں نے جواب دیا: ''آپ بڑے شوق سے یہاں تشریف رکھیں۔'' ویٹر جلدی سے ان تینوں کے لیے کرسیاں گھسیٹ لایا۔ بیٹھنے کے بعد آدمی نے عورتوں سے ہمارا تعارف کراتے ہوئے کہا: ''یہ میری بیوی ہے اور یہ میری بیٹی..... میرا ایک لڑکا بھی ہے جو

آج کل لندن کے ایک اسکول میں تعلیم پا رہا ہے۔ ابھی ابھی ہمیں پولیس آفیسر نے بتایا کہ آپ بہت دور سے آئے ہیں اور فی الحال اس چھوٹے سے قصبے میں اجنبی ہیں۔ میں خلوص دل سے اپنا گھر پیش کرتا ہوں۔ امید ہے میری یہ درخواست رد نہ فرمائیں گے۔ معاف فرمایئے میں اپنا تعارف کرانا بھول گیا۔ مجھے بووین کہتے ہیں اور میرا پیشہ وکالت ہے۔ ٹرینیڈاڈ کے دارالسلطنت پورٹ آف سپین میں میرا آفس ہے۔ یہاں سے کوئی بیس پچیس میل دور۔ یقین کیجیے آپ کو میرے گھر میں کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی۔''

مسٹر بووین نے اپنی بات ختم کی اور مسکرانے لگے۔ ان کی بیوی اور صاحبزادی اس امید میں ہماری طرف تکنے لگیں جیسے ہم ان کی پیش کش قبول کرنے والے ہیں۔ بلاشبہ ہم سان فرنینڈو میں مطلق اجنبی تھے اور ابھی تک ہمیں اپنے وطن فرانس کا کوئی ایسا فرد دکھائی نہ دیا تھا جو ہماری دلجوئی کرتا۔ فطری طور پر ہر شخص اپنے ہم وطنوں اور ہم زبانوں میں رہنا پسند کرتا ہے۔ انگریزی ہم بالکل نہیں جانتے تھے اور نہ بول سکتے تھے۔ بہت معمولی سی شد بد مجھے اور جان کلاز کو ضرور تھی مگر وہ بھی سمجھنے کی حد تک۔ چند لمحوں کے اندر اندر میں نے سوچ کر فیصلہ کیا کہ ہمیں یہ پیش کش قبول کر لینی چاہیے۔

ان تینوں کے چہرے خوشی سے ایک دم روشن ہو گئے۔ میں نے مسٹر بووین کی توجہ جان کلاز کی طرف دلائی جس کے لیے ٹانگ کی تکلیف کے باعث پیدل چلنا دشوار تھا۔ اگرچہ ان کے پاس ایک چھوٹی سی موٹر کار تھی جس میں ہم سب آسانی سے سما سکتے تھے مگر انہوں نے فوراً اسی ریستوران سے ایک ڈاکٹر کو فون کیا اور ہمیں بتایا کہ ڈاکٹر نے کل دوپہر کو اپنے کلینک میں آنے کا وقت دیا ہے۔ وہیں ایکسرے وغیرہ کا بھی انتظام ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر نے خدمت خلق کے رضا کاروں کے آفس میں فون کیا اور ہدایت کی کہ وہ اپنا ایک آدمی ساحل پر بھیج دیں تاکہ اسٹیمر کی نگرانی کی جا سکے۔ پھر انہوں نے ہمیں اپنی گاڑی کی پچھلی نشست پر بٹھایا اور چند منٹ بعد ہم شہر کی بارونق' اجلی اور صاف ستھری سڑکوں سے گزرتے ہوئے ایک خوش نما مکان کے دروازے پر رکے جس کے ساتھ عشق پیچاں کی بیلیں لپٹی ہوئی تھیں۔ مکان ایک حسین باغیچے کے وسط میں بنایا گیا تھا جہاں دائیں بائیں اندرونی برآمدے کے سامنے دو فوارے بھی چل رہے تھے۔

''میں آپ کے لیے بستر وغیرہ تیار کرتی ہوں۔'' مسز بووین کہنے لگیں' ''اتنے میں

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

آپ لوگ غسل خانے میں جا کر شیو وغیرہ بنائیں۔ شیو کا تمام سامان اور تولیے صابن وغیرہ سب کچھ وہیں موجود ہے۔''

دو دن ہم نے مسٹر بووین کے گھر میں اس طرح گزارے جیسے جیتے جی جنت میں پہنچ گئے ہوں۔ بہترین ناشتہ لذیذ کھانا' نفیس چائے یا قہوہ اور قصبے کے بازاروں میں ملنے والے وہ تمام پھل جو ہمارا میزبان خرید کر کھانے کی میز پر سجا دینے کی استطاعت رکھتا تھا۔ اتنی محبت' اتنا پیار اور اتنا اخلاق ہمیں زندگی میں اس سے پیشتر کبھی اور کہیں نہ ملا تھا۔ ہم نے انہیں اپنے بارے میں ایک ایک بات بتا دی تھی کہ ہم چور' ڈاکو اور قاتل ہیں۔ انسانیت اور اخلاق کے نام پر بہت بڑا داغ لیکن ان کا کہنا یہی تھا کہ سب باتیں درست مگر تم لوگ بہر حال ہمی جیسے انسان ہو' صرف ماحول نے تمہیں گھسیٹ کر اس مقام تک پہنچا دیا ہے جس کے تم شاکی ہو۔ ابھی تم لوگ جوان ہو' تمہارے سامنے زندگی کی طویل شاہراہ ہے۔ اپنے سامنے کوئی مقدس اور اونچا نصب العین رکھو پھر خدا بھی تمہاری مدد کرے گا۔

اس گھر میں اپنائیت کا ایسا احساس ہوا کہ ہم اپنے پچھلے تمام رنج اور مصائب بھول گئے۔ جان کلاز کا کلینک میں معائنہ ہوا اور ڈاکٹر نے ایکسرے دیکھ کر یقین دلایا کہ بہت جلد یہ تکلیف دور ہو جائے گی۔ ہڈی جڑ رہی ہے اور امید ہے پندرہ بیس روز تک مریض اپنے پیروں پر کسی سہارے کے بغیر چلنے پھرنے لگے گا۔ تیسرے روز وکیل نے ہمیں بتایا کہ بعض قانونی پیچیدگیوں کے باعث قصبے میں ہم زیادہ سے زیادہ دو ہفتے قیام کر سکیں گے۔ اس کے بعد یہاں سے رخصت ہونا لازمی ہے تاہم اس دوران میں گھومنے پھرنے اور ہر جگہ اٹھنے بیٹھنے کی آزادی ہے۔

دوپہر کو کھانے کے بعد مسٹر بووین نے ہمیں اپنی گاڑی میں بٹھایا اور پولیس اسٹیشن لے گئے۔ صدر دروازے پر متعین پولیس گارڈ نے ہمیں سلیوٹ کیا' گارڈ کے تمام سپاہی سیاہ فام تھے اور ان کی وردیاں انڈے کی طرح سفید۔ سفید وردیوں میں ان کے کالے جسم عجیب سے لگ رہے تھے۔ اسٹیشن کے اندر مختلف کمروں میں بھی زیادہ تر سیاہ فام افسر اور کلرک دکھائی دیئے۔ ایک بڑے سے کمرے میں پولیس چیف کی نشست تھی۔ یہ ایک بھاری بھرکم انگریز تھا۔ اس نے اٹھ کر خندہ پیشانی سے ہاتھ ملایا اور ہمیں کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ اچھی خاصی فرانسیسی بول لیتا تھا۔

''میں آپ لوگوں سے چند رسمی سے سوال کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا' ''کسی خدشے کے بغیر ان سوالوں کے جواب دیجیے گا۔ آپ یہاں اپنے آپ کو مجرم سمجھیں نہ قیدی..... آپ کی حیثیت قصبے میں نو واردوں کی ہے' اس لیے پولیس کا فرض ہے کہ قانون کے مطابق آپ کی شناخت کرے۔'' اس نے ایک لمحہ توقف کے بعد مجھ سے پوچھا:

''براہ کرم اپنا اور اپنے ساتھیوں کا نام بتایئے۔''

''ہنری پیپلن' جان کلاز اور فرانس ماترو۔''

''کیا عمریں ہوں گی آپ کی؟''

''چھبیس..... جونتیس..... انیس برس۔''

''بہت خوب..... کس جرم کی پاداش میں آپ لوگوں کو حکومت فرانس نے شیطانی جزائر میں بھیجا تھا؟''

''قتل کے جرم میں..... یہ الگ بات کہ وہ قتل ہم نے کیے بھی نہیں تھے۔''

''میں اپنے جرم کا اقرار کرتا ہوں جناب'' ماترو نے کہا۔ ''میں نے ایک ٹیکسی ڈرائیور کو قتل کیا تھا۔ اس وقت میری عمر سترہ برس کی تھی۔''

پولیس افسر نے ماترو کی طرف دیکھ کر ٹھنڈا سانس بھرا اور کہا:

''اگر تم انگلینڈ میں ہوتے تو شاید اس جرم کی پاداش میں پھانسی پا گئے ہوتے۔ بہر حال اپنے اپنے ملک کا رواج اور قانون ہے۔ ہمیں معلوم ہے ان شیطانی جزائر میں قیدیوں کے جو کیمپ کھولے گئے ہیں ان میں انسانوں پر کیا کیا ظلم ڈھائے جاتے ہیں۔ ایسے ظلم جن سے پھانسی پر لٹک جانا ہزار درجے بہتر ہے۔ مجھے آپ سے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ قانون کے مطابق آپ دو ہفتوں سے زائد ٹرینیڈاڈ یا کسی بھی مقبوضہ برطانوی علاقے میں قیام نہ کر سکیں گے۔ دوسری بات یہ کہ جب تک آپ یہاں رہیں کسی غیر قانونی حرکت کا خیال بھی دل میں نہ لایئے۔ ہمیں معلوم ہے آپ کے پاس ایک اچھا اور مضبوط اسٹیمر ہے۔ ہم رائل نیوی والوں سے درخواست کریں گے کہ وہ آپ کے اسٹیمر کی ضروری مرمت کر دیں۔ جس قدر ساز و سامان آپ کو درکار ہے' آپ ہم سے کسی معاوضے کے بغیر وصول کر لیجیے اور یہاں سے رخصت ہو جایئے۔ میرا خیال ہے جنوبی امریکہ میں کوئی بھی ملک آپ کو آسانی

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

سے قبول کرے گا۔ وینزویلا کی طرف جانے کی کوشش نہ کیجیے' وہاں جاتے ہی آپ کو پکڑ لیا جائے گا۔ پھر مہینوں برسوں آپ سے بے گار لینے کے بعد جب آپ کا دم لبوں پر ہوگا وہ آپ کو فرانس کے حوالے کر دیں گے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ ابھی جوان ہیں' صحت مند ہیں اور آپ کے سامنے ایک روشن مستقبل ہے۔ شیطانی جزائر سے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر نکل آنا آسان ہرگز نہ تھا' لیکن آپ نے یہ کارنامہ انجام دیا ہے۔ آپ اپنی جوانمردی' مستقل مزاجی اور عزم سے بھرپور صلاحیتیں زندگی سنوارنے میں کیوں نہ صرف کریں؟ مجھے آپ کی مدد کر کے دلی خوشی ہوگی' خدا آپ کا حامی و ناصر ہو۔ میرا فون نمبر نوٹ کر لیں۔ سان فرنینڈو یا ٹرینیڈاڈ میں کسی بھی لمحے آپ کو میری فوری مدد کی ضرورت ہو تو فون کے ذریعے مجھے اطلاع کر دیجیے' میں فوراً مدد کو پہنچوں گا۔''

اس نے برقی گھنٹی کا بٹن دبایا' ایک اردلی نے کمرے میں آ کر زوردار سلیوٹ کیا۔ پولیس چیف نے اسے قہوہ لانے کا حکم دیا۔ قہوہ پینے کے دوران اس نے ایک کاغذ پر ہمارے نام عمر اور جرائم کی تفصیل پوچھ پوچھ کر درج کی' پھر رخصت کرنے باہر تک آیا۔

''کاش! ہمارا برطانوی قانون اس کی اجازت دیتا۔'' اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا' ''پھر میں آپ لوگوں کو ٹرینیڈاڈ میں مستقل طور پر آباد ہو جانے کی اجازت دے دیتا۔ امید ہے آپ اس مجبوری کو معاف فرمائیں گے۔''

دو ہفتے کی مدت ہی کیا تھی؟ پلک جھپکنے میں یہ عرصہ بیت گیا۔ سان فرنینڈو میں ہم سے جو سلوک کیا گیا اس کی یاد نا قابل فراموش ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ہم میں زندہ رہنے کی آرزو بیدار ہوئی۔ انسانیت اور اعلیٰ اخلاقی اقدار پر ہمارا ایمان پختہ ہوا اور ہمیشہ کے لیے یہ سبق ذہن نشین ہو گیا کہ دنیا اتنی بری جگہ نہیں اور اس میں اچھے آدمی بھی کثرت سے ہیں۔

رائل نیوی والوں نے ہمارے اسٹیمر کی مرمت اس خوبی سے کی کہ اسے بالکل نیا بنا دیا۔ کھانے پینے کی بہت سی اشیا کے انبار ہمارے پاس لگ گئے جو نیوی اور پولیس کے علاوہ بعض شہریوں نے بھی اپنی خوشی سے دیئے تھے۔ نئی پتلونیں' نئی قمیصیں اور جیکٹیں' گائے کے روسٹ کیے ہوئے گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے۔ یہ سامان اتنا زیادہ تھا کہ ہم اسے ایک ماہ تک بخوبی برت سکتے تھے۔ سب سے قیمتی اور پرخلوص تحفہ ہمیں مسٹر بووین کی بیوی اور بیٹی نے دیا۔ یہ وہ گروپ فوٹو تھے جو ہم نے اپنے قیام کے دوران ان کے ساتھ اتروائے

تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے کئی سو ڈالر کی رقم بھی لفافے میں بند کر کے ہمارے حوالے کی۔ ہر چند ہم نے انکار کیا لیکن وہ نہ مانے اور سخت افسردہ ہونے لگے۔ ہم نے یہ رقم لے لی۔

جس روز ہمیں رخصت ہونا تھا مسٹر بووین نے ایک نقشہ میز پر بچھایا' وہ ہمیں راستے سمجھانے لگے' کولمبیا کی پہلی بندرگاہ سانٹا مارٹا سات سو بیس میل' پانامہ بارہ سو اور کوسٹاریکا پندرہ سو میل دور تھی۔ مسٹر بووین نے بتایا کولمبیا میں ہمارا قیام خطرناک ہو سکتا ہے۔ وہاں ابھی تک کسی مفرور مجرم نے پناہ نہیں لی تاہم برٹش کونسل سے رابطہ قائم کر کے مدد لی جا سکتی ہے۔ برٹش ہنڈوراس یہاں سے کوئی اٹھارہ سو میل کے فاصلے پر ہے اور وہاں کا برطانوی گورنر ہمارا رشتے دار بھی ہے۔ اگر تم وہاں جا سکو تو یہ سب سے بہتر ہے۔ میں اس کے نام خط لکھے دیتا ہوں۔ ممکن ہے وہ تمہیں خصوصی اختیارات کے تحت اپنے علاقے میں سال دو سال تک پناہ دے سکے۔ پھر اسی وقت گورنر ہنڈوراس کے نام خط لکھ کر ہمارے حوالے کیا۔

ادھر یہ سوچ سوچ کر ہمارے حواس گم تھے کہ سینکڑوں ہزاروں میل کا یہ دوسرا سمندری سفر اس چھوٹے سے اسٹیمر میں ہم کیوں کر طے کر سکیں گے۔ اگر ایک مرتبہ قسمت نے یاوری کی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر بار قسمت ہمارا ساتھ دیتی رہے گی..... لیکن مرتا کیا نہ کرتا؟ ہمیں بہرحال سان فرنینڈو سے نکل ہی جانا تھا۔

مسٹر بووین نے سوچ بچار کے بعد ہمارے لیے سفر کا ایک نقشہ تجویز کر ہی لیا۔ پہلی منزل..... چھ سو میل دور..... کوراکاؤ کی بندرگاہ..... دوسری منزل کوئی ایسا جزیرہ جو برٹش ہنڈوراس اور کوراکاؤ کے درمیان واقع ہو نقشے پر ایسا کوئی جزیرہ نہ تھا۔ ''تاہم اندازے سے طے ہوا کہ کوئی نہ کوئی جزیرے چھوٹا یا بڑا ہوگا ضرور۔ یہ قیاس بھی اس لیے تھا کہ سمندر کا یہ حصہ بے شمار آباد اور ویران جزائر سے پٹا پڑا تھا اور یہ ضروری نہیں تھا کہ نقشے پر ہر جزیرے کا اندراج کیا جاتا۔ تیسری منزل..... ہنڈوراس..... جنوب مغرب میں گوئٹے مالا کی سرحد کے ساتھ تھا۔

ایک بار پھر ہم سمندر کے بے کراں سینے پر سفر کر رہے تھے۔ نیوی کے انجینئروں نے اسٹیمر پر پوری توجہ دی تھی۔ اس کے جتنے حصے سمندر کی لہروں کے تھپیڑے کھا کھا کر کمزور ہو گئے تھے وہاں انہوں نے نئے تختے لگائے تھے اور آہنی کیلیں ٹھونکی تھیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے ہمارا کیبن بھی پختہ کر دیا تھا اور دو نئے بادبان اور ایک نیا مستول بھی لگایا تھا' عام

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

حالات میں اگر ہم اس اسٹیمر کی ایسی مرمت کرانے لگتے تو کم از کم ایک ہزار ڈالر ضرور خرچ ہو جاتے۔ انہوں نے ہمیں دو نئے قطب نما' ایک تھرمامیٹر اور دواؤں کا ایک بکس بھی دیا۔ سب سے قیمتی چیز جو ہمیں نیوی والوں سے ملی وہ بیڑی سے چلنے والا چھوٹا سرچ لائٹ سسٹم تھا۔ انہوں نے سمجھا دیا تھا اسے کیونکر اور کن کن مواقع پر کام میں لایا جا سکتا ہے۔

آپ خود تصور کر سکتے ہیں اس زبردست اہتمام اور ساز و سامان کے ساتھ ہمارے پست حوصلے کس قدر بلند ہوئے ہوں گے۔ جب ہم نے سمندر میں اسٹیمر کا رخ جنوب مغرب کی طرف کیا تو ہوا نے ہماری پذیرائی کی اور ڈیڑھ گھنٹے کے اندر اندر ہم نے چالیس میل کا سفر طے کر لیا۔ ہوا صبح سے شام تک ہمارے موافق چلتی رہی اور ہم نے دیکھا۔ سمندر کے اس حصے میں کئی برطانوی چھوٹے بڑے جہاز بھی ہمارے دائیں بائیں دس دس پندرہ پندرہ میل کے فاصلے سے سفر کر رہے ہیں۔ جان کلاز نے حساب لگایا کہ اگر ہم کسی روکاٹ کے بغیر اسی رفتار سے چلتے رہے تو کوراکاؤ تک پہنچنے میں پانچ دن اور پانچ راتیں لگیں گی۔

ابتدائی تین روز ہم بے حد مطمئن اور خوش رہے۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی تفریحی سفر پر نکلے ہوئے ہوں۔ ماترو اور جان کلاز کی گم شدہ صحت لوٹ آئی تھی۔ روز بروز ہم اپنی پہلی منزل کوراکاؤ سے نزدیک تر ہوتے جا رہے تھے۔ مسٹر بووین نے ہمیں یقین دلایا تھا کہ وہ کوراکاؤ کی انتظامیہ کے سربراہ کو ایک تار ہماری آمد سے متعلق بھجوائیں گے تاکہ وہ ہمارا خاص خیال رکھے۔

تیسرے اور چوتھے روز کی درمیانی رات ہمیں یکا یک یوں لگا جیسے اسٹیمر کو ایک ان دیکھی قوت زبردست دھچکے دے رہی ہے۔ اس صورت حال سے ہم خوف زدہ ہو گئے۔ لہریں بظاہر پرسکون تھیں اور طوفان کی آمد آمد کے کوئی آثار نہ تھے' پھر یہ کیا بلا تھی جو ہمارے اسٹیمر سے چمٹ گئی تھی۔ کبھی دھچکا دائیں طرف سے لگتا کبھی بائیں طرف سے اور کبھی پشت سے۔ آسمان پر گہری دھند کے باعث کوئی ستارہ جھلملاتا دکھائی نہ دیتا تھا اور ہمارے ہر طرف گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اسٹیمر کے چاروں طرف سے عجیب و غریب ڈراؤنی آوازیں آنے لگیں جیسے بے شمار گیدڑ یا الو چیخ رہے ہوں۔ یہ آوازیں کبھی تیز ہو جاتیں' کبھی ہلکی دہشت سے ہم تھر تھر کانپ رہے تھے۔ ماترو کا بہت برا حال تھا۔ اس کا کہنا تھا بدروحوں نے ہمارے اسٹیمر کو گھیر لیا ہے لیکن سمندر میں بھلا بدروحوں کا کیا کام؟ کئی میل تک

یہی کیفیت رہی۔ اسٹیمر برابر دھچکے کھاتا رہا آوازیں..... ہیبت ناک' ڈراؤنی اور پراسرار آوازیں برابر کانوں میں آتی رہیں۔

رات بھر یہ انوکھا اور لرزہ خیز کھیل جاری رہا۔ نہ جانے ہم کتنے میل دور نکل گئے ہوں گے۔ صبح کاذب کے دھندلکے میں ایک بار مجھے یوں محسوس ہوا جیسے دائیں جانب سے سفید سفید کوئی جسم سیاہ پانی میں سے اچھلا اور دوبارہ غڑاپ سے پانی میں ڈوب گیا۔ اس پراسرار سفید جسم کی اونچائی یا چھلانگ بارہ چودہ فٹ سے کچھ زائد ہی بلند تھی۔ جان کلاز نے بھی اسے دیکھا پھر تو ہمارے اردگرد ایسے بہت سے جسم بار بار سمندر میں سے ابھرنے اور ڈوبنے لگے۔ انہی جسموں کے اندر سے وہ ڈراؤنی چیخیں بلند ہو رہی تھیں' کبھی کبھی ایسا دھوکا ہوتا جیسے عورتیں بین کر رہی ہوں یا گیدڑ چلا رہے ہوں۔ اسٹیمر برابر جھٹکے پہ جھٹکے کھا رہا تھا۔

جب مشرقی افق کا اجالا ہمارے اسٹیمر کے آس پاس منڈلانے لگا تو یہ دیکھ کر ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ جن سفید سفید جسموں سے ڈر کر ہم تھر تھر کانپ رہے تھے وہ تو ڈولفن مچھلیاں ہیں۔ ہر مچھلی کی جسامت تیس چالیس فٹ سے کم نہ ہوگی۔ سب سے چھوٹی مچھلی جو ہم نے دیکھی وہ بارہ فٹ لمبی تھی۔ دراصل ہم ڈولفن مچھلیوں کے علاقے میں گھس آئے تھے اور ہم نے جہاز رانوں کی عادت کے برعکس ان مچھلیوں کی ضیافت کے لیے کوئی خوراک وغیرہ پانی میں نہ پھینکی تھی۔

''ڈولفن مچھلی انسان سے محبت کرتی ہے اور میلوں تک اس کے ساتھ سفر کرنے میں خوشی محسوس کرتی ہے۔'' جان کلاز نے کہا'' یہ بالکل بے ضرر ہے۔ بعض اوقات شوخی پر کچھ زیادہ ہی اتر آئے تو چھوٹے موٹے جہاز اور اسٹیمر کو الٹ بھی دیتی ہے۔''

مچھلیاں اردگرد بالکل قریب سے اپنا لمبا سا منہ کھول کر طرح طرح کی آوازیں نکالتیں جیسے ہم سے کھانے کو مانگ رہی ہوں پھر مایوس ہو کر غوطہ لگا جاتیں۔ میں نے گائے کے گوشت کے چند پارچے ان کی نذر کیے تب پیچھا چھوٹا اور اسٹیمر کو ان کے دھکوں سے نجات ملی تاہم ایک رات میں سیروں خون خشک ہو گیا۔

اس سے اگلی رات ہلکے سے سمندری طوفان کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ طوفان ہمارے حق میں فائدہ مند ثابت ہوا۔ اس کا رخ اس جانب تھا جدھر ہم جا رہے تھے: چنانچہ اسٹیمر تقریباً دگنی رفتار سے چلنے لگا۔ وہ کیفیت تمام رات جاری رہی۔ ہم میں سے کوئی بھی پلک نہ

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

جھپک سکا۔ اسٹیمر کی حد سے بڑھی ہوئی رفتار خطرناک بھی ثابت ہوسکتی تھی۔ بڑی مشکل سے ہم نے بڑا بادبان کھول کر ہوا کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی۔ اس میں کچھ کامیابی نصیب ہوئی مگر بے پناہ مشقت نے ہمارے جسموں کا ایک ایک بند ڈھیلا کر دیا طلوع شمس کے ساتھ ہی کوئی بیس پچیس میل دور سمندر میں ابھری ہوئی چٹانوں کا بے حد طویل سلسلہ نظر آیا۔ ان چٹانوں کے درمیان روشنی کا ایک بہت قدیم مینار سر اٹھائے کھڑا تھا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ چٹانوں کے اندر سے گزرنا جان لیوا ہوسکتا ہے۔

اسٹیمر برق رفتاری سے چٹانوں کی طرف معانقے کے لیے بڑھ رہا تھا اور اسے روکنے کی تمام کوششیں ناکام ہوگئی تھیں' ہم نے مزید دو بادبان جو مخالف رخ پر کام کرتے تھے۔ پوری طرح کھول دیئے تھے اس کے باوجود اسٹیمر مست ہاتھی کی مانند جھومتا ہوا چٹانوں کی طرف دوڑ رہا تھا جیسے کوئی مقناطیسی کشش اسے آواز دے رہی ہو۔

ایک دھماکے کے ساتھ اسٹیمر سب سے اگلی چٹان سے ٹکرایا اور اس کا رخ مغرب سے مشرق کی طرف ہوگیا۔ اگر نیوی کے فرشتوں نے اس کے سامنے والے حصے میں لوہے کی چادریں نہ لگائی ہوتیں تو اسی ٹکر سے اس کے پرخچے اڑ جاتے تاہم یہ حصہ ٹیڑھا ہوگیا' ٹوٹا نہیں نقصان صرف یہ ہوا کہ لکڑی کا کیبن ٹوٹ کر ہمارے اوپر آن پڑا اور کیلیں ہمیں زخمی کر گئیں۔ جان کلاز کا چہرہ خون میں تر نظر آیا' ماترو کی پیشانی سے خون کا فوارہ جاری تھا' خود میری ہتھیلیاں زخمی ہوگئیں اور گردن پر بھی خراشیں آئیں دھکے سے اسٹیمر کا رخ جو بدلا اس نے عافیت کی ایک راہ نکال دی۔ مخالف ہوا کا زور کم کرنے کے لیے جو بادبان ہم نے کھولا تھا اس کی ہوا نے ہمیں چٹانوں کے اس درے میں پہنچا دیا جس کا درمیانی فاصلہ پچاس ساٹھ فٹ کے لگ بھگ تھا۔ یہاں بے شمار چٹانیں سینہ تانے کھڑی تھیں۔ خدا کا شکر کہ اسٹیمر کی رفتار اس دھکم پیل اور مسلسل جھٹکوں کے باعث بہت سست پڑ گئی تھی۔ اس موقع پر چپوؤں نے بڑا کام دیا۔ اسٹیمر اب ایک ٹوٹے پھوٹے ناکارہ ڈھانچے میں بدل چکا تھا۔ ڈیڑھ دو گھنٹوں کی جان توڑ مشقت کے بعد ہم کسی قدر کھلے حصے میں پہنچے۔ اسٹیمر کی حالت یہ تھی کہ وہ کسی بھی وقت ڈوب سکتا تھا اور کورا کاؤ کا ساحل لحہ بہ لحہ قریب ہوتا جا رہا تھا۔ لہروں کا جوش و خروش مدھم پڑ گیا اور ہوا ایک دم تیز ہونے لگی تھی۔ یہ اچھی علامت تھی۔ تین گھنٹے بعد عین ساحل پر پہنچ کر اسٹیمر نے دم توڑ دیا۔ ہمیں بچی کھچی چیزوں میں سے کچھ بھی اٹھانے کا

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

موقع نہ ملا۔ خود ہم نے پانی میں چھلانگیں لگا دیں اور جوں توں کر کے سو ڈیڑھ سو فٹ کا فاصلہ ایک دوسرے کو سہارا دیتے ہوئے طے کیا۔ ساحل کی نرم گیلی ریت پر لیٹ کر ہم نے دیر تک اپنا پھولا ہوا سانس درست کیا تھکن' نیند اور مشقت کے باعث دم لبوں پر تھا۔ بھوک کا یہ حال کہ بیان سے باہر اور کھانے کے لیے کچھ بھی نہیں..... جزیرے کی طرف نظر دوڑائی تو دور تک آدمی نہ آدم زاد..... ریت کا ایک وسیع و عریض سمندر..... جا بجا مویشیوں اور پرندوں کے ڈھانچے پڑے ہوئے..... اس خوف سے حالت اور غیر ہونے لگی کہ ہم کورا کاؤ کے بجائے کسی اور جزیرے پر آ گئے ہیں۔

سہ پہر تک ہم وہیں ساحل پر لیٹے رہے فضا میں ٹھنڈ بڑھتی جا رہی تھی اور اڑنے والے بگلوں اور مرغابیوں کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ پھر یہ پرندے اتر اتر کر ساحل پر ادھر ادھر بیٹھنے لگے' دیکھتے دیکھتے ان کی تعداد ہزاروں سے بھی تجاوز کر گئی جان کلاز نے ادھر اُدھر متلاشی نظروں سے دیکھا' پھر مجھے اشارہ کیا۔ میں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا' ماترو نے بھی اس کا ایک بازو پکڑ رکھا تھا۔ سان فرینڈو میں پندرہ روز کے علاج سے اس کی ٹانگ خاصی ٹھیک ہوگئی تھی مگر جوڑ ابھی کمزور تھا۔ نئے حادثے نے اسے بے حد نڈھال کر دیا تھا۔ میں حیران تھا اس کے ذہن میں اب کیا ہے۔ ہم پہلے دو سو فٹ کے فاصلے پر جنوب کی طرف گئے' وہاں جان کلاز نے ریت کے مختلف گڑھوں کا جائزہ لیا۔ مایوسی سے سر ہلایا پھر ہم جزیرے کی طرف بڑھنے لگے۔ مزید دو سو فٹ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد جان ایک جگہ رکا' جھک کر ریت کا جائزہ لیا' پھر مجھ سے کہا: ''یہاں سے ریت ہٹاؤ۔'' میں نے تعمیل کی۔ کوئی دو ڈھائی فٹ تک ریت ہٹائی تو میرا ہاتھ کسی نرم نرم بیضوی چیز سے ٹکرایا' نگاہ ڈالی تو وہاں کچھوے کے بہت سے انڈوں کا ڈھیر لگا تھا۔ یہ انڈے خاصے بڑے تھے۔ تعداد پچاس ساٹھ سے بھی زائد۔ سب انڈے نکال لیے پھر ہم انہیں توڑتے گئے اور زردی اپنے حلق میں انڈیلنے لگے۔ اس تدبیر سے بھوک کچھ مٹ گئی اور جسم میں جان سی آ گئی۔

''مجھے معلوم تھا ایسے ویران ساحلوں پر مادہ کچھوے کثرت سے انڈے دیتی ہے۔'' ان نے بتایا۔ ''صرف تلاش کا مسئلہ ٹیڑھا ہے ابھی ہم اور جستجو کریں تو مختلف جگہوں پر سے بے شمار انڈے برآمد کر سکتے ہیں..... آؤ پہلے یہ معلوم کریں کہ یہ جزیرہ ویران ہے یا اس جگہ کوئی رہتا ہے۔''

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

جوں جوں ہم آگے بڑھ رہے تھے ہماری حیرت اور خوف میں اضافہ ہو رہا تھا۔ گدھوں کے ڈھانچے اور سڑے ہوئے گوشت کی بو سے ناک پھٹی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ تھوہر کے خودرو پودوں اور خاردار جھاڑیوں کی وہ کثرت کہ الامان! سمجھ میں نہ آتا تھا کہ گدھوں کے اتنے ڈھانچے کہاں سے آئے۔ آگے چل کر ہمیں مری ہوئی بکریاں بھی دکھائی دیں جو تھوہر کے پودوں کے پاس پڑی تھیں۔ ہم رکے بغیر چلتے رہے۔ دفعتہً ایک مکان دکھائی دیا۔ دبے پاؤں ڈرتے ڈرتے ہم اس کے قریب پہنچے۔ دروازہ کھلا تھا ہم ایک ایک کر کے اندر داخل ہوئے۔ فرش پر ایک جانب تیل سے جلنے والا چولہا پڑا تھا۔ چند چینی' مٹی اور المونیم کے برتن..... پانی کی ایک صراحی' نہایت کثیف اور میلا سا بستر لوہے کے ایک پرانے پلنگ پر بچھا ہوا' ایک طرف لکڑی کی میز پر آئینہ' کنگھا' سر میں ڈالنے والے تیل کی شیشی' کھونٹی پر لٹکا ہوا کینوس کا ایک تھیلا۔ میں نے اسے ٹٹولا..... اس میں ریزگاری بھری ہوئی تھی لیکن کس ملک کی ریزگاری؟ شاید ہالینڈ کی۔ ہم نے اس میں سے کوئی سکہ نکالے بغیر تھیلا جوں کا توں وہیں ٹانگ دیا..... اس کے بعد صراحی میں سے پانی نکال کر پیاس بجھائی' طے پایا کہ صاحب مکان کو تلاش کیا جائے۔

سورج مغرب میں خاصا جھک گیا تھا اور ہم اسی جانب ایک پگڈنڈی پر چلے جا رہے تھے' ابھی ہم مشکل سے نصف میل ہی گئے ہوں گے کہ ایک حیرت انگیز تماشا دکھائی دیا۔ اس لق و دق ویرانے میں ایک شخص پرانی فورڈ گاڑی میں بیٹھا چلا آ رہا تھا' قریب آن کر اس نے بریک لگائے۔ اس نے اوپر سے نیچے تک ہم میں سے ہر ایک کا جائزہ لیا پھر فرانسیسی زبان میں بولا:

''آؤ بیٹھو میری گاڑی میں.....'' اس نے حکم دیا جیسے ہم اس کے غلام ہوں ہم اس کی گاڑی میں لد گئے اس نے گاڑی چلا دی' چند لمحے بعد کہنے لگا:

''تم لوگ غالباً سمندر کے راستے آئے ہو تمہارا حلیہ بتاتا ہے کہ.....''

''جی جناب.....'' میں نے قطع کلام کر کے کہا' ''ہمارا اسٹیمر چٹانوں سے ٹکرا کر تباہ ہو گیا۔ بڑی مشکل سے جان بچانے میں کامیاب ہوئے۔''

''بڑے سخت جان ہو بھئی'' اس نے تعریفی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''اور جناب والا تشریف کہاں سے لا رہے ہیں؟'' اس مرتبہ اس کا لہجہ یک دم طنزیہ ہو گیا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

''ٹرینیڈاڈ سے۔''

''ہوں! اور ٹرینیڈاڈ میں آنے سے پہلے کہاں تھے؟''

''فرنچ گیانا میں۔''

''بھئی واہ! یہ خوب کہی کس جرم میں وہاں بھیجے گئے تھے استاد؟''

''قتل کے..... ہم تینوں نے کئی کئی قتل کیے ہیں'' میں نے ذرا مزا لینے کے لیے حاشیہ چڑھایا۔ وہ چند لمحے چپ چاپ بیٹھا کار ڈرائیو کرتا رہا۔ جانے کہاں سے آیا تھا اور کہاں جا رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر کچھ فکر کی گہری لکیر ابھر آئی تھی۔ آخر اس نے کہا:

''تم خاصے جی دار نظر آتے ہو؟ کیا اس لونڈے نے بھی قتل کی وارداتیں کی ہیں؟'' اس کا اشارہ ماترو کی طرف تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ اس لونڈے نے پیرس میں دن دہاڑے چاقو سے ایک ٹیکسی ڈرائیور کے ٹکڑے اڑا دیئے تھے۔ اس کے بعد میں نے اپنا' جان کلاز اور ماترو کا تفصیلی تعارف کرایا۔ وہ غور سے سنتا اور مسکراتا رہا۔ میں خاموش ہوا تو اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا:

''مجھے ڈاکٹر نیل کہتے ہیں۔ اس علاقے کا نام ''ڈنکی آئی لینڈ'' ہے یعنی گدھوں کا جزیرہ..... یہاں کی تین چیزیں مشہور ہیں۔ گدھے' بکریاں اور تھوہر۔ میں اس پورے جزیرے کا واحد مالک ہوں اور اسے ترقی دینے کی اسکیمیں بنا رہا ہوں۔ میری خواہش ہے یہاں اچھی رہائشی کالونیاں بن جائیں۔ میں لوگوں کو پٹے پر زمین دینے کے بارے میں بھی غور کر رہا ہوں۔ کوراکاؤ یہاں سے کوئی بارہ میل دور ہے۔ پہلے ڈنکی آئی لینڈ بھی کوراکاؤ ہی کا ایک حصہ تھا مگر اب میں نے اس کا نام الگ رکھ دیا ہے۔''

ڈاکٹر نیل ایک دلچسپ آدمی ثابت ہوا۔ تھوڑی دیر ہی میں وہ ہم سے خاصا بے تکلف ہو چکا تھا۔ ہم نے بھی اسے اپنے بارے میں کچھ اور باتیں بتائیں۔ اس نے یقین دلایا کہ وہ ہر ممکن حد تک ہماری مدد کرے گا۔

سورج چھپتے چھپتے ڈاکٹر نیل کی فورڈ کار ایک ہموار میدان میں پہنچی جس کے عین درمیان میں دو منزلہ مکان بنا ہوا تھا۔ اس مکان پر سفید قلعی شاید حال ہی میں پھیری گئی تھی۔ مکان کے اردگرد چار دیواری تھی جس کی اونچائی اندازے کے مطابق آٹھ فٹ ہو گی۔ اس کے اوپر تین فٹ اونچی لوہے کی خاردار تار لگائی گئی تھی' گاڑی ایک مضبوط پھاٹک پر رُکی۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

ڈاکٹر نے تین بار ہارن بجایا۔ دو منٹ بعد ایک قوی ہیکل حبشی نے دروازہ کھولا اور گاڑی اندر داخل ہوئی۔ حبشی نے اتنا بھاری دروازہ بڑی آسانی سے بند کر کے لوہے کا بھاری قفل اندر سے ڈال دیا۔ پھر وہ دوڑتا ہوا کار کی طرف آیا اور ادب سے گردن جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ ڈاکٹر نے اس سے ایک ایسی زبان میں چند باتیں کیں جو ہماری سمجھ سے باہر تھی۔ غالباً وہ حبشی کو ہمارے بارے میں کچھ ہدائتیں دے رہا تھا۔ ڈاکٹر کے ہر جملے پر وہ گردن ہلا کر ادب سے کہتا:

''ہاں آقا..... بہت بہتر آقا..... ایسا ہی ہوگا جناب.....'' حبشی کے منہ سے نکلے ہوئے یہی الفاظ تھے جو میری سمجھ میں آ رہے تھے' اس کے بعد ڈاکٹر نے مجھ سے کہا:

''یہ میرا نوکر ہے۔ میں نے اسے سب کچھ سمجھا دیا ہے۔ یہ آپ کے لیے کمرہ اور بستر تیار کرے گا۔ مکان میں کھانے پینے کا سامان وافر مقدار میں موجود ہے۔ جو جی چاہے کھائیے۔ میں آج رات ایک ضروری کام سے کوراکاؤ جا رہا ہوں' صبح واپس آؤں گا۔ آیئے آپ کو اپنا مکان دکھاؤں۔''

مکان باہر سے جس قدر چھوٹا نظر آیا اندر سے اتنا ہی وسیع تھا۔ ڈاکٹر نیل نے اس کی مضبوطی پر خاصا زور دیا تھا اور دل کھول کر روپیہ خرچ کیا۔ یہاں ہم نے تیل سے چلنے والا ایک جنریٹر بھی دیکھا جو بجلی پیدا کرتا تھا۔ مکان کے اندر ایک بہت بڑا تہہ خانہ بھی تھا جس میں مختلف اجناس کی بوریاں قرینے سے رکھی تھیں۔ یہ بات ہمارے فہم و ادراک سے بہت بالا تھی کہ ڈاکٹر نیل کو آخر اس لمبے چوڑے مکان' اتنی وسیع چار دیواری..... اور چار دیواری کے اوپر تین فٹ اونچی آہنی خاردار باڑ' لکڑی کے مضبوط پھاٹک' ان کے اندرونی جانب لگائے جانے والے بھاری قفل اور اس قوی ہیکل حبشی غلام کی کیا ضرورت پیش آئی۔ یہ شخص بہت پراسرار بلکہ خطرناک ہو سکتا تھا۔

ایک بار پھر اس عجیب و غریب زبان میں حبشی سے باتیں کر کے ڈاکٹر نیل رخصت ہو گیا۔ حبشی پھاٹک بند کر کے آیا اور ہمیں ایک کمرے میں لے گیا جہاں لوہے کے پلنگ پڑے تھے۔ ایک گوشے میں دریوں اور چادروں کا انبار لگا تھا اس نے بڑی پھرتی سے ہمارے بستر بچھائے اور بٹن دبا کر بتی جلائی' پھر معنی خیز انداز میں اپنے سفید سفید دانت نکال کر بولا:

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

''کھانا تیار کرنے میں ایک گھنٹہ لگے گا۔ اگر آپ زیادہ بھوک محسوس کر رہے ہوں تو میں کچھ پھل اور بسکٹ پیش کر سکتا ہوں۔''

ادھر انتظار کی تاب کہاں تھی؟ ایک ٹرے میں چند سیب' تھوڑے سے آلو کیلے اور نمکین بسکٹوں کے دو ڈبے لے کر حبشی واپس آیا اور کچھ کہے بغیر رخصت ہو گیا۔ ہم کھاتے رہے اور ڈاکٹر نیل کے بارے میں رائے زنی ہوتی رہی۔ اس دوران میں ہم نے اپنے کمرے کا جائزہ بھی لیا۔ بارہ فٹ لمبا اور سات فٹ چوڑا اونچائی کوئی اٹھارہ فٹ کے لگ بھگ' اس میں صرف ایک روشن دان اور ایک کھڑکی جس میں پون انچ موٹی لوہے کی سلاخیں لگی تھیں البتہ ایک گوشے میں پانی سے بھری ہوئی بالٹی' المونیم کا ایک مگ اور حوائج ضروریہ کے لیے پاٹ دھرا تھا۔ ہم سوچنے لگے' آخر اس کمرے میں یہ پاٹ رکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ طرح طرح کے وہم' وسوسے اور شبے ہمارے ذہنوں میں سر اٹھانے لگے۔ ایک نئے خیال کے زیر اثر میں اپنی جگہ سے اٹھا اور دبے پاؤں دروازے کی طرف بڑھا کان لگا کر پرلی طرف آواز وغیرہ سننے کی کوشش کی اور یہ معلوم کر کے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ دروازے کے باہر یقیناً کوئی ذی روح دیوار سے چپکا کھڑا ہے۔ اس کے سانس لینے کی مدھم آواز صاف سنائی دے رہی تھی' کون ہو سکتا تھا یہ؟ حبشی غلام کے سوا پورے مکان میں اور کوئی نہ تھا۔ تو کیا یہ کالا دیو باہر کھڑا ہماری باتیں سننے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے دروازہ کھولنا چاہا مگر دروازہ باہر سے بند تھا۔ پھر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی جو آہستہ آہستہ دور ہوتی چلی گئی۔

جان کلاز اور ماترو کا دہشت سے بُرا حال تھا' مضبوط اعصاب کے مالک ہونے کے باوجود میں نے دیکھا کہ جان کی ٹانگیں کانپ رہی ہیں۔ بغیر کچھ کہے وہ دونوں ساری صورت حال سمجھ چکے تھے۔

''ہمیں دھوکے سے اس کمرے میں قید کر دیا گیا ہے دوستو!'' میں نے اعلان کیا۔ انہوں نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے پہلے کھڑکی' پھر روشندان کی طرف دیکھا اور مایوس ہو کر گردن جھکا لی۔

''یہ حبشی غلام ہم تینوں پر بھاری ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے پاس کوئی چاقو' ریوالور یا پستول بھی نہیں'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

یہ سنتے ہی ماترو نے اپنی ڈب میں ہاتھ ڈال کر وہ لمبا چمک دار چاقو نکال لیا جو کوڑھیوں کے جزیرے میں لاپس بونے سے حاصل کیا تھا۔ چاقو دیکھتے ہی ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے اب کوئی خوف نہ رہا ہو۔ ہم نے سرگوشیوں اور اشاروں میں طے کیا کہ حبشی پر بالکل ظاہر نہ ہونے دیں گے کہ ہم یہ چال بازی سمجھ گئے ہیں۔ ایک گھنٹہ کیا دو گھنٹے گزر گئے اور وہ کھانا لے کر نہ آیا تو ہمارا شبہ یقین میں بدل گیا۔ اب ہم نے تینوں پلنگوں کا معائنہ کیا' لوہے کے یہ ایسے پلنگ تھے جو عموماً ہسپتالوں میں مریضوں کے لیے ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر نیل نے غالباً انہیں کسی نیلام میں خریدا ہوگا۔ تھوڑی سی جدوجہد کے بعد ہم ایک پلنگ کے دو آہنی پائے الگ کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ یہ بڑی حوصلہ افزا بات تھی۔ ایک ماترو والا چاقو اور دوسرے لوہے کے دو پانچ پانچ سیر وزنی پائے۔ مسئلہ یہ تھا کہ حبشی کو کس بہانے کمرے میں داخل ہونے پر مجبور کیا جائے؟ اس کے لیے ایک تدبیر جان کلاز کے زرخیز ذہن نے یہ سوچی کہ ہم آپس میں زور زور سے دھینگا مشتی کریں۔ ایک دوسرے کو گالیاں بکیں اور جس قدر ہنگامہ کر سکتے ہوں کریں۔ ہم ہی میں سے ایک شخص چند منٹ بعد اس انداز میں چیخے چلائے جیسے اس کا گلا گھونٹا جا رہا ہو۔ حبشی غلام اس دھوکے میں آ کر ضرور دروازہ کھولے گا اور اندر آئے گا پھر اس کو ختم کر دیا جائے۔

یہ مسکوٹ کر کے ہم نے ہنگامے کا آغاز کیا۔ تین منٹ بعد ہی حبشی کا مکروہ چہرہ کھڑکی کی سلاخوں سے باہر دکھائی دیا۔ پہلے تو ہمیں لڑتے جھگڑتے دلچسپی سے دیکھتا رہا اور جب اس نے دیکھا' یہ جنگ لمحہ بہ لمحہ زور پکڑ رہی ہے تو اس نے ہمیں ڈانٹا:

''اُلّو کے پٹھو لڑائی بند کرو ورنہ میں اندر آن کر تم سب کو ماروں گا۔''

''ابے جا بڑا آیا مارنے والا کالے کتے کی اولاد'' میں نے حبشی کو یہ کہہ کر پانچ سات سنا دیں۔ یہ گالیاں سن کر اس کا ناریل چٹخ گیا۔ کھڑکی سے ہٹ کر راہداری کی طرف دندناتا ہوا آیا۔ بس وہ چند لمحے ہمارے لیے قیمتی تھے۔ ایک ثانیہ ضائع کیے بغیر میں نے لوہے کا پایہ اٹھایا اور دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ قفل کھلنے کی آواز آئی پھر دونوں کواڑ جدا ہوئے اور حبشی کا سیاہ پہاڑ سا جسم کمرے میں نظر آیا۔ اپنے بدن کی پوری قوت سمیٹ کر میں نے دونوں بازو بلند کیے اور دھائیں سے آہنی سریا حبشی کی کھوپڑی پر بجا دیا۔ ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے کے وقفے میں وہ کالا دیو گھوما' میری طرف غیظ آلود نظروں سے دیکھا۔ مجھے

یوں لگا جیسے اس ضرب کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ سریا دوبارہ اٹھایا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح دھڑام سے پیٹھ کے بل زمین پر گرا۔

حبشی کے منہ سر سے خون بہہ رہا تھا اور وہ بے ہوش پڑا تھا۔ ہم نے اس کی نیکر کی جیب میں سے بیرونی پھاٹک کے قفل کی کنجی نکالی۔ پھر اسے وہیں چھوڑ کر کمرے سے باہر آئے۔ دروازہ بند کر کے قفل لگایا۔ دور تہہ خانے کی طرف سے جنریٹر چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ اس وقت سارا مکان بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ ہمیں کھانے کی چند چیزیں مل گئیں اور پھر ہم گہری نیند سو گئے۔

نیند کے عالم میں یوں محسوس ہوا جیسے میں ایک بھیانک خواب دیکھ رہا ہوں۔ وہ حبشی غلام میرے سرہانے کھڑا مجھے شعلہ بار نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ ابھی تک اس کی کھوپڑی سے خون رس رس کر اس کا سیاہ چہرہ مزید خوفناک بنائے دیتا تھا۔ جان کلاز اور ماترو کو شاید اس نے قتل کر دیا ہے۔ میں ان کی لاشیں اپنے قریب ہی دیکھتا ہوں۔ پھر مجھے حبشی کے ہاتھ میں وہی چاقو دکھائی دیتا ہے جو ماترو کے پاس تھا۔ یکا یک وہ اپنا ہاتھ بلند کرتا ہے اور چاقو میرے سینے میں گھونپنا چاہتا ہے۔ میں بری طرح چیختا ہوں لیکن آواز میرے حلق سے نہیں نکلتی' حبشی ایک شرمناک گالی دے کر زور سے ٹھوکر میری پسلیوں میں رسید کرتا ہے۔ ایک ہولناک چیخ کے ساتھ میری آنکھ کھل جاتی ہے' میں قالین پر چت پڑا ہوں۔ کمرے کی چھت کے وسط میں لٹکا ہوا تیز روشنی کا بلب جل رہا ہے۔ میرا خواب حقیقت کا روپ دھار چکا ہے' میرے سرہانے خون میں نہایا ہوا وہ حبشی غلام کھڑا ہے اور ڈاکٹر نیل کا ستا ہوا چہرہ بھی دکھائی دے رہا ہے۔ اس کے ہونٹ سختی سے بھنچے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر کے پیچھے وردیاں پہنے تین پولیس والے بھی موجود ہیں۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ریوالور اور باقی دو کے پاس رائفلیں ہیں۔ جان کلاز اور ماترو اپنی جگہ بے حس و حرکت بیٹھے میری طرف دیکھ رہے ہیں۔ ڈاکٹر نیل ولندیزی زبان میں پولیس والوں سے کچھ کہتا ہے۔ وہ اثبات میں گردن ہلا رہا ہے اور میری طرف خونخوار نظروں سے دیکھتا جاتا ہے پھر اس نے شکستہ فرانسیسی میں مجھ سے کہا:

''تم لوگ پولیس کی حراست میں ہو۔ خبردار اگر کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو میرے ساتھی تمہیں فوراً شوٹ کر دیں گے۔ اٹھو تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہے۔''

حبشی غلام نے ایک اور ٹھوکر میری پسلیوں میں دے ماری۔ رائفل بردار سپاہیوں کے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

پاس ہتھکڑیاں بھی تھیں۔ انہوں نے پہلے جان کلاز اور ماترو کے ہاتھوں میں یہ زیور پہنائے پھر میری باری آئی۔ اس کے بعد وہ ہمیں دھکے دیتے' گھونسے مارتے اور ٹھوکروں پر رکھتے ہوئے بیرونی پھاٹک کی طرف لے کے گئے۔ ڈاکٹر نیل اور حبشی پولیس والوں کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔

حبشی کی مار پیٹ ایسی تھی کہ پکے پھوڑے کی طرح بدن دکھ رہا تھا..... نہ جانے ابھی کتنے مصائب و آلام کے پہاڑ ہم پر ٹوٹنے والے تھے۔ تمام راستہ ویران اور بے آب و گیاہ پڑا تھا۔ کوئی بارہ تیرہ میل کا فاصلہ' پرانی جیپ نے ایک گھنٹے میں طے کیا۔

جس عمارت میں پولیس اسٹیشن قائم تھا وہ حد درجہ بوسیدہ اور دو سو برس قبل کے ولندیزی طرز تعمیر کا بہترین نمونہ تھی۔ تنگ کمرے' اونچی چھتیں' پلستر ادھڑے ہوئے فرش' لکڑی کی کھڑکیوں میں لوہے کی سلاخیں' دروازے اتنے نیچے کے لمبے قد کا آدمی گردن جھکا کر اندر داخل ہونے پر مجبور ہو.....

سیاہ فام پولیس افسر نے ہمیں لے جا کر تھانے کی حوالات میں بند کر دیا۔ حوالات کا یہ کمرہ کیا تھا' ٹین کی چھت کا ایک چھ فٹ لمبا اور پانچ فٹ چوڑا کیبن جس کے فرش پر میلی سی دری پڑی تھی۔ چھت کے عین درمیان لوہے کی زنجیر سے پرانی طرز کا لیمپ لٹکا ہوا بھڑ بھڑ جل رہا تھا۔ اس کی زرد روشنی میں ہم نے دیکھا کہ دری پر نہ جانے حشرات الارض کی قسم میں سے کون کون سے کیڑے مکوڑے رینگ رہے ہیں۔ اس کے علاوہ مچھروں کی بہتات تھی۔

وہ رات ہم نے اس دوزخ میں کاٹی۔ مچھروں نے کاٹ کاٹ کر ہمارے برہنہ بدن سجا دیئے۔ ایسی اذیت اس سے پہلے کبھی نہ اٹھائی تھی' سورج نکلا مچھر غائب ہوئے اور ہمیں نیند نے آن دبوچا مگر مشکل سے چند منٹ ہی سونے پائے تھے کہ ایک مکروہ شکل کے کالے سپاہی نے ہمیں جگا کر اشارے سے بتایا کہ چیف بلاتا ہے۔ ہم نے اس سے پوچھا' منہ ہاتھ دھونے کا کوئی انتظام ہے؟ اس نے کچھ نہ سمجھ کر نفی میں گردن ہلائی اور ہمیں اٹھنے کا حکم دیا۔ اس نے اپنی پیٹی میں لکڑی کا ڈنڈا بھی اڑس رکھا تھا اور پستول بھی..... چار و ناچار ہم اٹھے اور اس کے ساتھ لڑکھڑاتے قدموں سے عمارت کے پرلے حصے میں داخل ہوئے وہ ہمیں ایک اور سپاہی کی نگرانی میں دے کر خدا جانے کدھر غائب ہو گیا۔

کامل آدھ گھنٹہ کھڑے رہنے کی سزا بھگتنے کے بعد ہمیں ایک کمرے میں دھکیل دیا گیا۔

یہ پولیس چیف کا کمرہ تھا' ایک بڑی سی میز کے پیچھے بھاری بھرکم اور عقابی نظروں والا انگریز براجمان تھا۔ یہاں وہ تینوں پولیس والے بھی ایک گوشے میں اٹن ٹن کھڑے دکھائی دیئے جو ہمیں آدھی رات کو گرفتار کر کے اس مخصوص جگہ لائے تھے۔ ان کے علاوہ سر سے پیر تک سفید براق وردیاں پہنے چند اور افسر بھی کرسیوں پر بیٹھے نظر آئے۔ پولیس چیف کا کمرہ خاصا سرد تھا۔

پولیس چیف نے عینک آنکھوں سے سرکا کر پیشانی پر لٹکائی۔ ہماری جانب گھور کر دیکھا جیسے نگاہوں ہی نگاہوں میں ہماری شخصیتوں کو تول رہا ہو۔ پھر سامنے پڑے ہوئے ایک کاغذ پر سرسری نظر ڈال کر ولندیزی میں اس پولیس افسر سے کچھ کہا' جو ہمیں گرفتار کر کے لایا تھا۔ اس نے جواب میں لمبی تقریر کی۔ لب و لہجے کی خشونت سے یہ اندازہ کرنا کچھ زیادہ دشوار نہ تھا کہ یہ تقریر سراسر ہمارے خلاف ہے۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے چیف کو یہ بھی بتایا کہ کس طرح ہم نے حبشی غلام کے سر میں پلنگ کا آہنی پایہ مارا تھا وغیرہ وغیرہ۔ اس کے بعد چیف میری طرف متوجہ ہوا اور فرانسیسی زبان میں بولا:

''ڈاکٹر نیل کا تحریری بیان یہ ہے کہ وہ تمہیں اپنے گھر میں چھوڑ کر کوراکاؤ محض اس واسطے آیا تھا کہ پولیس کو تمہارے بارے میں مطلع کرے۔ اسے شک تھا کہ تم لوگ اسمگلنگ کا دھندا کرتے ہو۔ یہی وجہ تھی کہ وہ یہاں سے پولیس کو لے کر گیا تھا..... بولو اب تم اپنی صفائی میں کیا کہنا چاہتے ہو؟ اگر وہ حبشی غلام مر گیا جیسا کہ ڈاکٹر کی رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی کھوپڑی کو صدمہ پہنچا ہے تو تم پر اقدام قتل کا مقدمہ چلایا جائے گا اور جرم ثابت ہونے پر شاید تمہیں موت کی سزا دی جائے۔''

یہ سن کر پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ تب میں نے اسے سب کچھ بتایا اور کہا ہم فرنچ گیانا کے قیدی کیمپ سے بھاگے ہوئے ہیں۔ ٹرینڈاڈ سے آ رہے ہیں۔ اگر وہ چاہیں تو سان فرنینڈو کے وکیل مسٹر بووین یا وہاں کے پولیس چیف سے ہمارے بیان کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ ہمیں دراصل ڈاکٹر نیل پر شبہ تھا کہ وہ پراسرار طریقے پر اپنے مکان میں لے گیا' پھر اس کے حبشی غلام نے ہمیں کمرے میں بند کر کے باہر سے تالا ڈال دیا۔ ہمیں خوف تھا کہ وہ ہمیں مار ڈالے گا۔

مسٹر بووین کا نام سن کر پولیس چیف نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر ایک پولیس افسر سے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

کچھ کہا' وہ جلدی سے باہر گیا اور ایک فائل اٹھا لایا۔ چیف نے یہ فائل کھولی' اس میں سے ایک کاغذ برآمد کیا اسے پڑھا اور مسکرا کر بولا:

''ٹھیک ہے مسٹر ہنری پیپلن! چند روز قبل سان فرینڈو سے پولیس چیف کا اطلاعی تار ہمیں ملا تھا۔ میں مسٹر بووین کو بھی ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ بہرحال ہم ان سے بھی ضرورت پڑی تو تصدیق کر لیں گے۔ فی الحال آپ کو یہیں پولیس اسٹیشن ہی میں رہنا ہوگا۔ میں آج ہی آپ کا کیس گورنر کوراکاؤ کے پاس بھجوا رہا ہوں۔ وہی فیصلہ کرے گا آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ میں امید کرتا ہوں آپ اس دوران میں کوئی ایسی حرکت نہ کریں گے جو آپ کا جرم مزید سنگین بنا دے..... اس کے علاوہ آپ یہ دعا بھی کریں کہ ڈاکٹر نیل کا سیاہ فام نوکر ہلاک نہ ہو جائے ورنہ.....''

اس نے اٹھ کر ہم تینوں سے مصافحہ کیا۔ ولندیزی زبان میں ایک پولیس افسر کو کچھ ہدایات دیں اور ہمیں رخصت کر دیا۔ اس مرتبہ ہمیں ایک کشادہ اور آرام دہ کمرے میں لے جایا گیا جہاں دس بارہ حوالاتی پہلے سے موجود تھے۔ دروازے پر مسلح سنتریوں کا پہرہ تھا۔ حوالاتیوں نے فرش ہی پر بستر جما رکھے تھے ان میں سے کئی سیاہ فام تھے' دو تین جرمن اور ایک اطالوی۔ سنتری نے ہم سے اشاروں میں پوچھا کسی چیز کی ضرورت ہے۔ ہم نے اسے بتایا کھانے کے لیے کچھ لے آؤ۔ امریکی ڈالر میرے پاس محفوظ تھے' اس موقع پر بہت کام آئے' ہم نے ضرورت کی چند چیزیں منگوا لیں۔

دوسرے حوالاتیوں نے ہمیں گھیر لیا اور بڑی مشکل سے ہم انہیں سمجھا پائے کہ ہمارا قصور کیا ہے۔ سبھی نے ہمدردی کا اظہار کیا اور امید دلائی کہ جلد رہا کر دیئے جاؤ گے۔ سنا ہے گورنر بہت شریف اور انصاف پسند آدمی ہے۔ تین روز ہم اس حوالات میں رہے' چوتھے روز شام کے وقت دو پولیس افسر وہاں آئے اور مجھے اپنے ساتھ چیف کے پاس لے گئے۔ وہاں میں نے ڈاکٹر نیل کو بھی دیکھا۔ اس کا چہرہ از حد سنجیدہ تھا۔ پولیس چیف نے افسوس اور ہمدردی کے ملے جلے تاثرات سے بتایا کہ حبشی ہسپتال میں مر گیا ہے۔ موت زیادہ خون بہہ جانے کے سبب واقع ہوئی۔ یہ سن کر میرا کلیجہ بیٹھ گیا' موت کا سایہ سر پر منڈلاتا دکھائی دیا' پولیس چیف نے کہا:

''مسٹر پیپلن' گھبراؤ نہیں۔ مسٹر بووین کو میں نے اس حادثے کے متعلق تار دے دیا

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ہے۔ امید ہے وہ جلد کوراکاؤ پہنچیں گے اور تمہارا مقدمہ اپنے ہاتھ میں لے لیں گے۔ ممکن ہے اس حبشی کے رشتے دار خون بہا لینے پر آمادہ ہو جائیں۔ اب ہم مقدمے کے فیصلے تک آپ کو دوسرے حوالاتیوں اور اپنے ساتھیوں سے الگ رکھنے پر مجبور ہیں۔''

مجھے انہوں نے اسی وقت ہتھکڑی لگا لی اور ایک ایسی کوٹھڑی میں لے گئے جہاں میری طرح ایک اور بدنصیب شخص پہلے سے موجود تھا۔ اس کے چہرے پر گھنی ڈاڑھی تھی' سر کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے۔ آنکھیں خون کبوتر کی مانند سرخ' ہونٹ موٹے موٹے۔ جسم پر بے حد کثیف اور بدبودار لباس۔ اس کے ہاتھوں میں ڈبل ہتھکڑیاں اور پیروں میں بیڑیاں پڑی تھیں۔ وہ اس وقت کچھ کھا رہا تھا اور اس کا جبڑا ایسے حرکت کر رہا تھا جیسے مویشی جگالی کرتے ہیں۔

وہ مجھے دیکھ کر کچھ متعجب ہوا' کچھ مسکرایا اور غرانے کی سی آواز حلق سے نکالنے لگا۔ میں نے خیال کیا شاید گونگا ہے مگر فوراً ہی میرے ساتھ آنے والے محافظ نے اس سے ولندیزی زبان میں گفتگو شروع کر دی۔ شاید میرے بارے میں اسے بتا رہا تھا۔ پھر محافظ نے ٹوٹی پھوٹی فرانسیسی میں مجھے بتایا:

''اس شخص کا نام انتونیو ہے اور یہ کولمبیا کا رہنے والا بڑا نامور بدمعاش' اسمگلر اور قاتل ہے۔ بڑی مشکلوں سے قابو میں آیا ہے۔ اس کا کیس بھی آج کل گورنر کے زیر غور ہے اور امید ہے بہت جلد اسے پھانسی کی سزا دے دی جائے گی۔''

میں نے احتجاج کیا کہ مجھے ایسے خطرناک شخص کے ساتھ کیوں رکھا جا رہا ہے لیکن اس نے اس احتجاج کا کوئی جواب نہ دیا اور سلاخوں والے دروازے میں قفل ڈال کر چلا گیا۔ اس تمام عرصے میں انتونیو مجھے عجیب سی نگاہوں سے تکتا رہا۔ کئی بار اس نے بولنے کے لیے لب کھولے مگر خاموش رہا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے اپنے ایک تھیلے میں ہاتھ ڈال کر سبز رنگ کے پتے نکالے' انہیں گنا' پھر ان میں سے ایک پتہ منہ میں ڈال کر جبڑا چلانے لگا۔ بقیہ پتے اس نے پھر تھیلے میں ڈال لیے۔ میں نہ سمجھ سکا آخر یہ کس پودے یا درخت کے پتے ہیں جنہیں وہ مزے لے لے کر چبا رہا ہے۔

✣ ✣ ✱ ✣ ✣

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

.....7.....

یہ تھا انجام اس تمام جان لیوا تگ ودو کا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا' موت کا فرشتہ کہاں سے چلا اور کہاں تک تمہیں گھسیٹ لایا موسیو ہنری پیپلن .....اب بولو کیا ارادے ہیں۔ کوراکاؤ کی اس ہیبت ناک پھانسی کی کوٹھڑی میں مرنا قبول ہے؟ پولیس چیف نے بتایا تو ہے کہ مسٹر بووین بہت جلد یہاں پہنچیں گے لیکن کیا ضروری ہے کہ وہ میرا مقدمہ جیت ہی جائیں؟ حبشی غلام بہرحال موت سے ہمکنار ہو چکا اور یہ بھی ثابت ہے کہ میں نے اس کی کھوپڑی پر لوہے کی وزنی سلاخ دے ماری تھی۔ سنتے ہیں یہ انگریز لوگ قاعدے قانون کے بڑے پابند ہیں۔ اگر ان کا قانون یہ کہتا ہے کہ قاتل کو موت کی سزا ہونی ہی چاہیے تو مسٹر بووین کی وکالت کیا کام دے گی؟ غرض سینکڑوں وسوسے اور اوہام تھے جو اس ناچیز کے دماغ میں ہجوم کیے ہوئے تھے۔ طرح طرح کی اگلی پچھلی تصویریں سی بن رہی تھیں' جان کلاز اور ماترو کا خیال بھی آیا۔ انہیں جب پتہ چلے گا کہ میرا کیا حشر ہونے والا ہے تو وہ جیتے جی مر جائیں گے۔ پھر اس حبشی کو مارنے میں وہ دونوں بھی تو میرے ساتھ شریک تھے۔ ممکن ہے انہیں بھی سزا میں دھر لیا جائے۔

مجھے کچھ خبر نہیں وقت کس طرح کٹا اور دن کا اجالا غائب ہو کر رات کب آئی۔ انتونیو اسی طرح ایک گوشے میں بیٹھا جگالی کر رہا تھا۔ اس دوران میں متعدد بار اس نے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر وہ پتے نکالے اور منہ میں رکھ لیے۔ اس نے میرے قریب آنے یا مجھ سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔ غالباً وہ میرے بارے میں یہ سوچ رہا ہوگا کہ کہیں میں اس سے بڑا مجرم تو نہیں ہوں۔ اندھیرا بڑھ گیا تو ایک سیاہ فام گن مین نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں تیل سے جلنے والی لالٹین تھی۔ لوہے کی سلاخوں میں سے یہ ننھی منی لالٹین اس نے میری طرف بڑھائی۔ میں نے کچھ کہے بغیر لالٹین لے کر ایک طرف رکھ دی۔ تھوڑی دیر بعد دوسرا

آدمی آیا۔ اس کی بغل میں کمبل دبا ہوا تھا اور بائیں ہاتھ میں المونیم کا ایک ڈول تھا جس کے اوپر ایک پلیٹ دھری تھی۔ یہ دونوں چیزیں بھی میں نے وصول کر لیں۔ ڈول کے اندر ابلے ہوئے چاول تھے اور پلیٹ میں تھوڑا سا دہی تھا' میری بھوک پیاس اڑ چکی تھی تاہم چند لقمے کھائے۔ میں نے اشارے سے انتونیو کو بھی کھانے کی دعوت دی۔ وہ مسکرایا اور پہلی بار میں نے اس کے سفید چمکتے ہوئے دانت دیکھے۔ ان دانتوں نے اس کی شکل اور منحوس بنا دی تھی۔ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ میری دعوت کے جواب میں تھیلے کے اندر ہاتھ ڈال کر ایک پتا نکالا اور میری طرف بڑھایا۔ اس مرتبہ میں نے انکار میں گردن ہلا دی۔ وہ کچھ سنجیدہ ہو گیا پھر ایک دم ہنس پڑا۔ پھر نہ جانے کہاں سے اس نے ایک سگار برآمد کر کے میری طرف پھینکا۔ یہ تحفہ مجھے قبول کرنا پڑا۔ یہ چار انچ لمبا پتلا سا سگار تھا۔ میں نے لالٹین کی چمنی اونچی کر کے سگار سلگایا دو تین کش لگاتے ہی چودہ طبق روشن ہو گئے۔ خدا رحم کرے کس قدر کڑوا اور تیز تمباکو تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ چند لمحوں بعد ہی میں اپنے تن بدن میں ایک نیا سرور اور نئی قوت کی لہریں ابلتی ہوئی محسوس کرنے لگا۔ اس جادو اثر سگار نے تمام وسوسے' تمام اوہام اور فاسد ڈراؤنے تصورات ذہن سے کھرچ کر پھینک دیئے۔ انتونیو نے میری یہ کیفیت بھانپ لی۔ اظہار مسرت کے طور پر اس نے زور زور سے ہنس کر گردن ہلائی' پھر اپنی زبان میں کچھ کہا جس کا ایک لفظ بھی میرے پلے نہ پڑا۔ وہ سمجھ گیا کہ میں کچھ نہیں سمجھا۔ چنانچہ اس نے اشارے سے سگار مانگا میں نے سگار اسے دے دیا۔ اب اس نے بھی تین چار کش اس قوت سے لگائے کہ سگار آدھا ہی رہ گیا۔ اپنی باری لے کر اس نے سگار پھر میری طرف بڑھایا اور یوں ہماری اس دوستی کا آغاز ہوا جس میں فی الحال اشارے تھے' کنائے تھے اور زبان کا کوئی دخل نہ تھا۔ اس نے لوہے کی ایک پتلی سی کیل کے ذریعے کوٹھڑی کے کچے فرش پر نقشہ بنا کر مجھے سمجھایا کہ اس کا اصل دھندا کیا ہے اور کن کن علاقوں میں اس کے آدمی کام کر رہے ہیں۔ وہ اسمگلروں کے ایک بہت بڑے گروہ کا خود مختار لیڈر تھا۔ اردگرد کے تمام جزیروں میں اس کے تنخواہ دار ایجنٹ پھیلے ہوئے تھے.....

اروبا آئی لینڈ میں اس کا ہیڈ کوارٹر تھا جہاں چرس' افیم اور کوکین کے بڑے ذخائر اس نے مختلف زیر زمین کمین گاہوں میں چھپا رکھے تھے۔ وہ نہ صرف یہ نشہ آور چیزیں بڑے پیمانے پر اسمگل کرتا بلکہ آدمی اور اسلحہ بھی ادھر سے ادھر لاتا اور لے جاتا تھا۔ اس نے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

اشارے سے بتایا کہ میں اب تک پچاس ساٹھ افراد اپنے ہاتھ سے موت کے گھاٹ اتار چکا ہوں اور میری گرفتاری کے لیے دس ہزار انگلش پاؤنڈ کا انعام مقرر ہے۔ حال ہی میں کورا کاؤ کے ساحل پر میں نے دو مسلح محافظ شوٹ کر دیئے اور بھاگنے کی کوشش کرتے ہوئے پکڑا گیا۔ میری گرفتاری ماریوہا چا کے چھوٹے سے جزیرے میں ہوئی جسے پولیس کے دو سو جوانوں نے گھیرے میں لے لیا تھا۔ اتفاق سے میں اس وقت تن تنہا تھا۔ جب تک پٹی میں لگے ہوئے کارتوس کام دیتے رہے' میں نے اپنے آپ کو پولیس کے حوالے نہ کیا..... پھر اس نے مجھے اشارے سے سمجھایا کہ یہ لوگ خواہ کتنی ہی کوشش کر لیں مجھے پھانسی پر نہیں لٹکا سکتے اور چند روز کے اندر اندر میں اس کوٹھڑی سے آزاد ہو کر دوبارہ اپنے گروہ سے جا ملوں گا۔ اس نے مجھ سے پوچھا: ''کیا تم میرے ساتھ فرار ہونا پسند کرو گے؟'' میں نے اقرار میں جواب دیا۔ یہ معلوم کر کے وہ بے حد خوش ہوا۔ ایک بار پھر اس نے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹا سا پتا نکالا' آدھا خود اپنے منہ میں رکھا اور آدھا مجھے دیا۔ میں اس سے پہلے اس کے سگار کا لطف اٹھا چکا تھا' بے تامل یہ پتا منہ میں رکھ کر چبا گیا۔ جونہی اس کا عرق حلق سے اترا یوں محسوس ہوا جیسے انگارا کھا لیا ہو روح کھینچ کر زبان پر آ گئی' زور کا ایک چکر آیا۔ یوں لگا جیسے کوٹھڑی کی ہر شے رقص کر رہی ہے۔ خود میں نے اپنے آپ کو کئی ہزار میل کی رفتار سے خلا میں پرواز کرتے ہوئے پایا۔ انتونیو' لالٹین' چاول کا ڈول اور کمبل سب میرے ساتھ خلائے بسیط میں اڑ رہے تھے۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں بند کیں تو ایسا محسوس ہوا جیسے میں پاتال کی گہرائیوں میں گرتا چلا جا رہا ہوں..... پھر گھپ اندھیرے نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا.....

آنکھ کھلی' کوٹھڑی کے باہر صبح کا اجالا پھیل چکا تھا اور میرے بدن کا ایک ایک جوڑ بری طرح فریاد کناں تھا جیسے رات بھر میری دھنائی کی گئی ہو۔ حلق میں کانٹے سے پڑے تھے اور ہونٹ سوج کر موٹے موٹے ہو گئے تھے۔ میں نے گارڈ کو آواز دینے کی کوشش کی مگر زبان نے کام کرنے سے انکار کر دیا۔ نوزائیدہ بچوں کی طرح غاؤں غاؤں کر کے رہ گیا۔ زبان کو ہاتھ لگایا تو پتہ چلا کہ ہونٹوں کی مانند زبان بھی سوج چکی ہے..... سراب بھی چکرا رہا تھا۔ میں نے گردن گھما کر انتونیو کو ڈھونڈنا چاہا' دیکھا وہ اپنے گوشے میں ہاتھ پیر پھیلائے گہری نیند کے مزے لے رہا ہے۔ بڑی مشکل سے گھسٹ گھسٹ کر انتونیو کے قریب پہنچا اور ہاتھ مار کر اسے جگایا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میری حالت دیکھی اور دانت نکال کر ہنسنے لگا۔

''سور کی اولاد تم ہنس رہے ہو اور یہاں میرا دم لبوں پر ہے۔'' میں نے دانت پیس کر دل ہی دل میں اسے سینکڑوں گالیاں دیں۔ اس نے لپک کر اپنا تھیلا اٹھایا اور پھر وہی پتا نکال کر مجھے دینے لگا۔ مجھے اور تاؤ آیا' ممکن تھا میں اپنے وحشی پن پر اتر آتا اور اس بدمعاش کی خوب ٹھکائی کرتا لیکن یہ سوچ کر کہ آدمی بے ڈھب ہے' ذرا سی بات پر دشمنی مول لینا ٹھیک نہ ہوگا۔ میں نے اس سے دو دو ہاتھ کرنے کا فیصلہ ترک کر کے اشارے سے ہونٹوں اور زبان کے بارے میں بتایا..... میری یہ حالت دیکھ کر وہ اور خوش ہوا۔ پھر اس نے بتایا یہ کوکین کے پتے ہیں اور کیا میں نے اس سے پہلے کوکین کبھی نہیں چکھی؟ جی میں آیا اس خبیث کو واقعی موت کا مزا چکھا ہی دوں مگر اس کی آنکھوں میں خلوص اور ہمدردی کے جذبات مچلتے دیکھ کر مجھے بھی اپنی باچھیں چیر کر ہنسنا پڑا۔ بتایا کہ میں نے یہ بے ہودہ نشہ کبھی نہیں کیا۔ یہ جان کر انتونیو نے ایسا منہ بنایا جیسے کوکین نہ کھا کر میں نے اپنی تمام زندگی ضائع کر دی ہو۔

اتنے میں دو مسلح گارڈ آئے' ایک نے دروازے کا قفل کھولا اور باہر ہی رکا رہا۔ دوسرا اندر آیا اس نے چائے سے بھرے ہوئے دو مگ ہمارے حوالے کیے' چائے کے ساتھ کھانے کے لیے ڈبل روٹی کے دو دو ٹکڑے بھی تھے۔ پھر اس نے چاولوں کا ڈول اور لالٹین اٹھائی اور باہر نکل گیا۔ چند لمحوں بعد واپس آیا اور شکستہ فرانسیسی میں مجھ سے کہنے لگا: ''رفع حاجت کی ضرورت ہے تو ساتھ چلو۔'' میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے لپک کر میرے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی۔ پہلے گارڈ کے ہاتھ میں ٹامی گن تھی۔ اس نے لوہے کے دروازے میں بھاری قفل ڈالا اور دوسرے گارڈ کے ساتھ مل کر مجھے ایک بار پھر اس حصے میں لے گیا جہاں دوسرے قیدی رکھے گئے تھے۔ جیل کے احاطے میں ایک نل لگا تھا اور اس کے ساتھ ہی دو یا تین بیت الخلا تھے۔ میں نے نل کے پاس پہنچ کر اطمینان سے ہاتھ منہ دھویا۔ کچھ جان میں جان آئی۔ زبان اور ہونٹوں کی سوجن بھی کم ہو چکی تھی تاہم بولنے میں بڑی دقت تھی۔ جلد جلد حوائج ضروریہ سے فارغ ہو کر واپس اسی کال کوٹھڑی میں جا رہا تھا کہ قیدیوں کی ایک جماعت کے ساتھ جان کلاز اور ماترو اسی جانب آتے دکھائی دیئے۔ ہماری نظریں ملیں اور چشم زدن میں وہ دونوں مجھ سے لپٹے ہوئے تھے۔ انہیں سب کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ جان کلاز غم زدہ تھا اور ماترو کی خوبصورت معصوم آنکھیں آنسو بہا رہی تھیں۔ ہمیں آپس میں باتیں کرنے کا موقع دیئے بغیر محافظوں نے جدا کر دیا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کوٹھڑی میں واپس آیا تو انتونیو وہاں نہ تھا۔ آدھ گھنٹے بعد معلوم ہوا اسے گورنر کی عدالت میں لے جایا گیا ہے۔ غالباً اس مقدمے کا فیصلہ سنایا جا رہا تھا۔ میں نے محافظ سے کہا' وہ مجھے پولیس چیف کے پاس لے چلے۔ میں اس سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اس نے بتایا' پولیس چیف انتونیو کے ساتھ ہی گورنر کے آفس گیا ہے۔ دوپہر کے بعد ان کے واپس آنے کی توقع ہے۔ قید تنہائی میں پہلے بھی کوڑھیوں کے جزیرے میں کاٹ چکا تھا۔ زندگی کی کچھ امید وہاں بھی نہ تھی اور یہاں کوراکاؤ کی اس پھانسی کوٹھڑی میں بھی زیادہ پرامید نہ تھا۔ یہ طے تھا کہ اگر مسٹر بووین میری وکالت کا فرض ادا کرنے میں ناکام رہے یا سان فرنینڈو سے نہ آ سکے تو.....اس سے آگے سوچنے کی زحمت میں نے اپنے ذہن کو نہ دی۔ دوپہر تک چت لیٹا چھت کی طرف تکتا رہا۔ سونے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ جی چاہتا تھا جو کچھ ہونا ہے وہ جلد ہو جائے۔ انتظار اور امید و بیم کی یہ کیفیت ہر لحظہ ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ دو مسلح سیاہ فام گارڈ کوٹھڑی کے باہر دائیں بائیں مستعدی سے ٹامی گنیں ہاتھوں میں لیے کھڑے تھے۔ ان کی نگاہوں میں میرے لیے نفرت' حقارت اور غصے کے سوا کچھ نہ تھا۔ ایک دو بار میں نے ان سے وقت دریافت کیا اور جواب میں جھڑکیاں سن کر خاموش ہو گیا۔ کوٹھڑی میں پینے کا پانی نہ تھا۔ پانی کی فرمائش پر وہ یوں انجان بن گئے جیسے میری بات سمجھتے ہی نہیں۔ بارہا اشارے سے بتایا پیاس کے باعث مرا جاتا ہوں' دو گھونٹ پانی لا دو مگر وہ پتھر کے بے جان مجسموں کی مانند اپنی جگہ کھڑے رہے اور میں بھونکتا رہا' بلکتا رہا' چلاتا رہا' دوپہر کیا سر پہر بھی بیت گئی۔ انتونیو ابھی تک واپس نہ آیا تھا۔ کیا معلوم انہوں نے اسے لے جا کر پھانسی ہی پر لٹکا دیا ہو' اس تصور سے بدن میں تھرتھری چھوٹ گئی۔

سورج چھپنے سے تھوڑی دیر پہلے وہ آ گیا۔ اس کی آنکھیں پہلے سے زیادہ سرخ تھیں' ڈاڑھی اور مونچھوں کے بال کھڑے اور موٹے موٹے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ محافظوں نے اسے ہتھکڑی اور بیڑی سمیت اندر دھکیل کر دوہرا دروازہ بند کر دیا۔ مجھے دیکھ کر انتونیو کے لبوں پر عجیب سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ سیدھا اس گوشے میں گیا جہاں اس کا کمبل بچھا تھا۔ کمبل کے سرہانے کی جانب اندر ہاتھ ڈال کر اس نے اپنا تھیلا برآمد کیا۔ اس میں سے دو پتے نکالے ایک اپنے منہ میں دبایا دوسرا میری طرف پھینکا۔ میں نے انکار میں گردن ہلا دی۔ اس مرتبہ اس نے برا نہ مانا اور پتا اٹھا کر تھیلے میں ڈال لیا۔ پھر اس نے انگلیوں کے اشارے

سے بتایا آج سے ٹھیک تیسرے روز سورج نکلنے سے پندرہ منٹ پہلے اسے پھانسی دے دی جائے گی۔ گورنر نے رحم کی اپیل کو مسترد کر دیا ہے۔ لیکن خوف زدہ ہونے کی کوئی بات نہیں' آدمی موقع کی تاک میں ہیں اور انہوں نے اپنے تمام انتظامات مکمل کر لیے ہیں وہ اپنے لیڈر کو ہر قیمت پر آزاد کرانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

اسی شام انتونیو سے ملنے کے لیے تین آدمی آئے۔ ان میں سے ایک نے پادریوں کا سا لباس پہن رکھا تھا۔ دائیں ہاتھ میں بائبل اور بائیں ہاتھ میں صلیب۔ دوسرے دو آدمی شاید اس کے نائب تھے اور انہوں نے سیاہ لبادے پہن رکھے تھے۔ محافظوں نے انہیں کوٹھڑی میں داخل ہونے کی اجازت دے دی۔ اندر آ کر انہوں نے بائبل پڑھنا شروع کر دی اور پادری نے ادھر اُدھر چور نگاہوں سے دیکھنے کے بعد شستہ فرانسیسی میں مجھ سے کہا:

''موسیو پیپلن! خاموشی سے میری بات سنیے۔ ہم انتونیو کے آدمی ہیں اور اس نے بتایا ہے کہ آپ فرار ہونا پسند کریں گے۔ یقین کیجیے موسیو اگر اس کوٹھڑی سے نہ نکلے تو یہ لوگ آپ کو پھانسی پر لٹکا دیں گے۔ یہاں سیاہ فام باشندوں کی کثرت ہے اور چونکہ ان کی برادری کا ایک آدمی آپ کے ہاتھوں مارا جا چکا ہے اس لیے وہ بہت مشتعل ہیں۔ آج بھی انہوں نے گورنر کی رہائش گاہ کے سامنے زبردست مظاہرہ کیا کہ قاتل کو کھلے میدان میں پھانسی دی جائے ورنہ وہ بغاوت کر دیں گے.....ان حالات میں آپ کا بچ نکلنا ممکن ہی نہیں۔ ہم نے بڑی مشکل سے ان سیاہ فام محافظوں اور جیل کے دوسرے پہرے داروں کو رشوت دے کر اس بات پر رضامند کیا ہے کہ وہ رات کے سناٹے میں صرف انتونیو کو نکل جانے کی اجازت دے دیں گے۔ اس مقصد کے لیے ہماری جانب سے ایسے حالات پیدا کر دیے جائیں گے جن کی مدد سے فرار ہونے کا عمل آسانی سے انجام پایا جائے گا۔ انتونیو کے ساتھ آپ بھی نکل سکیں تو ہمیں خوشی ہوگی۔''

میں نے اسے بتایا میں پھانسی پر لٹک کر مرنے کے بجائے محافظ کی گولی کھا کر مرنے کو ترجیح دوں گا۔ یہ سن کر وہ خوش ہو گیا اور کہنے لگا'' آپ بہادر آدمی ہیں موسیو پیپلن! میں نے آپ کے کارنامے آپ کے ساتھیوں کی زبانی سنے ہیں۔ کاش ہم ان دونوں کو بھی چھڑا سکتے تاہم آپ ان کی فکر نہ کریں۔ چند روز بعد بہرحال انہیں رہا کر دیا جائے گا۔ ان کے لیے کوئی پیغام دینا ہو تو دے دیجیے' میں انہیں پہنچا دوں گا۔ مجھے ابھی اس بھیس میں کئی اور قیدیوں سے ملنا ہے۔''

میرے پاس کوئی پیغام اس کے سوا نہ تھا کہ زندگی رہی تو پھر کبھی ملاقات ہوگی' یہ الفاظ کہتے ہوئے میری آواز بھرا گئی اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ پادری نے اپنے لبادے کے اندر ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹا سا پستول نکال کر میرے حوالے کیا۔ ''یہ خود کار ہتھیار ہے موسیو! اس میں چھ گولیاں ہیں آپ اسے بے دھڑک استعمال کریں۔ اپنی جان بچانے کے لیے ہر ربہ استعمال کر لینے کا اختیار ہے۔''

وہ یہ باتیں کرتا رہا اور اس کے دونوں ساتھی اونچی آواز میں بائبل پڑھتے رہے۔ پادری نے ہمیں دو چابیاں بھی دیں جن کی مدد سے میں اپنی اور انتونیو کی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں کھول سکتا تھا۔ اس کے بعد وہ چلے گئے۔ انتونیو چپ چاپ بیٹھا جگالی کرتا رہا۔ مجھے حیرت تھی یہ شخص کچھ اور نہیں کھاتا ہے' اس کے باوجود خاصا قوی ہیکل نظر آتا تھا۔ اس نے مجھے اشاروں سے بتایا بس رہائی میں چند گھنٹے باقی ہیں۔

رات کو پھر وہی ابلے ہوئے نمکین چاول اور پانی کی طرح پتلا شوربا' ایک گارڈ لالٹین روشن کر کے لایا اور دوسرے نے مٹی کی صراحی بھر کر ہمارے پاس رکھ دی۔ اس کے بعد چائے کا ایک پیالہ بھی عنایت ہوا۔ سیاہ فام پہرے داروں کا رویہ میرے ساتھ تو ویسا ہی درشت تھا لیکن انتونیو کے ہر حکم کی وہ فوراً تعمیل کرتے۔ اس نے انہیں سگار لانے کے لیے کہا سگار لائے گئے اس کے بعد اس نے اپنا پرانا کمبل پرے پھینک دیا اور ہسپانوی زبان میں نہ جانے کیا کہا کہ چند لمحوں بعد نیا کمبل دیا گیا۔ جب پہرے دار اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو گئے تو انتونیو نے اٹھ کر بپھرے ہوئے چیتے کی مانند کوٹھڑی میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ ہر بار وہ رُک کر میری طرف دیکھتا کچھ سوچتا اور پھر ٹہلنے لگتا۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے تک وہ اسی طرح ٹہلنے کے بعد اپنے کمبل پر بیٹھ گیا۔ تھیلے میں سے کوکین کا نیا پتا نکال کر جبڑے میں دبایا اور جگالی کرنے لگا۔ میں نے اندازہ کیا اب شام کے سات بجے ہوں گے۔ باہر سناٹا تھا۔ دور کہیں سے کتے کے بھونکنے کی آواز آ رہی تھی۔ باہر شاید ہوا تیز ہو گئی تھی کیونکہ صحن میں لگے ہوئے بڑ کے درخت کی شاخیں شور پیدا کر رہی تھیں۔ میں نے محسوس کیا۔ دماغ نیند سے بوجھل ہونے لگا ہے لیکن آنکھیں کسی طرح بند نہیں ہوتیں۔ یقیناً یہ اس کوکین کے پتے کا اثر تھا جو میں نے گزشتہ روز کھایا تھا۔ خیال آیا اگر آج رات ہی ہمیں نکل بھاگنا ہے تو نیند ہرگز نہیں آنی چاہیے۔ ایسا نہ ہو عین فرار کے موقعے پر نیند سے میرا برا حال ہو۔ یہ سوچ کر انتونیو سے پتا

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

طلب کیا۔ اس نے فوراً تھیلے میں ہاتھ ڈال کر ایک بڑا پتا نکالا اور آدھا توڑ کر میرے حوالے کیا۔ پھر اشارے سے سمجھایا اسے چباتا رہوں اور پیک کم سے کم نگلوں تاکہ اعصاب سو نہ جائیں اور میں حسب ضرورت چل پھر سکوں..... میں نے ایسا ہی کیا۔ کوکین کا پتا چبانے میں لطف تو آیا لیکن زبان اور ہونٹ تھوڑی دیر بعد ہی سوج کر کپا ہو گئے اور میں بولنے اور بات کرنے سے عاری ہو گیا لیکن اس میں نقصان ہی کیا تھا؟ یہاں میری بات سمجھنے والا تھا کون؟ اکلوتے روشن دان سے چاندنی جھانکنے لگی۔ شاید یہ چودھویں رات ہوگی۔ ساڑھے نو بجے چاند روشن دان کے بالکل اوپر آ گیا۔ روشن دان کی سیاہ فولادی سلاخوں سے میں اسے بخوبی دیکھ رہا تھا۔ کوکین کے نشے کا اثر تھا کہ چند لمحوں بعد مجھے ایک کے بجائے آسمان پر دو چاند دکھائی دینے لگے..... پھر دو سے تین..... تین سے چار پھر ان کی تعداد بڑھتی چلی گئی..... گھبرا گھبرا کر میں نے بار بار آنکھیں بند کیں کھولیں۔ لیکن ہر بار چاندوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ تب میں نے انتونیو کو چاند کی طرف متوجہ کیا۔ اسے چاند یا چاندنی سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ پہلے تو بالکل نہ سمجھا میں کیا کہنا چاہتا ہوں لیکن جب سمجھ گیا تو ہنس ہنس کر دہرا ہو گیا۔ اس نے مجھے بتایا اسے تو ایک ہی چاند دکھائی دے رہا ہے اور مجھے چاہیے کہ اٹھ کر پانی پیوں میں نے پانی پیا لیکن وہ کیفیت قائم رہی۔ میں نے منہ پھیر لیا اور دیوار کی طرف مڑ کر آنکھیں بند کر لیں خدا جانے اس میں کتنی دیر گزری..... ایک گھنٹہ..... ایک رات یا ایک صدی..... ہوش آیا تو چاندنی غائب تھی۔ اس کی جگہ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ بارش کا پانی اگر بوچھاڑ کی صورت میں روشن دان سے نہ آتا تو میں اسے بھی کوکین کا اثر خیال کرتا لیکن نہیں..... آسمان پر بادل گرج رہا تھا۔ بجلی کڑک رہی تھی اور دھونتال مینہ پڑ رہا تھا۔ انتونیو اٹھ کر میرے قریب آیا اور اس نے اسپینش زبان میں ایک لفظ ایسا کہا جس کا مطلب میں سمجھتا تھا۔

''لسٹو'' (میں تیار ہوں)

اس نے سلاخوں سے باہر جھانکا' دونوں مسلح محافظ نہ جانے کہاں پناہ لیے ہوئے تھے یا وہ جان بوجھ کر چلے گئے تھے۔ انتونیو نے دونوں ہاتھ آگے بڑھائے' میں نے چابی نکال کر اس کی ہتھکڑیاں کھولیں۔ پھر بیڑیاں اتاریں۔ اس کے بعد اس نے مجھے زنجیروں سے آزاد کیا۔ ٹین کی چھتوں پر بارش کا پانی اس زور سے پڑ رہا تھا جیسے کسی بڑے کارخانے میں دیو پیکر

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

مشینیں پوری رفتار سے چل رہی ہوں۔ انتونیو نے آزاد ہو کر دروازہ ٹٹولا میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب میں نے دیکھا کہ دروازہ فوراً کھل گیا ہے۔ اس سے تین فٹ کے فاصلے پر دوسرا دروازہ تھا اور میں دیکھ رہا تھا اس میں بھاری قفل پڑا ہے۔ یہ دروازہ لوہے کی پون انچ موٹی سلاخوں سے بنایا گیا تھا۔ دو سلاخوں کے درمیان کوئی پانچ انچ فاصلہ تھا۔ انتونیو نے اپنے اسی تھیلے میں ہاتھ ڈالا۔ میں نے دل میں اسے گالی دی کہ اس نازک موقع پر بھی اس حرامی کو نشے کی سوجھ رہی ہے' لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے فولاد کی ایک چھوٹی اور بالکل نئی ریتی نکال لی۔ یہ ریتی غالباً اسے پادری ہی نے بہم پہنچائی ہوگی۔ حیرت انگیز سرعت اور قوت سے انتونیو نے ایک سلاخ پر ریتی رگڑنی شروع کر دی..... پندرہ منٹ کے اندر اندر اس نے سلاخ کاٹ ڈالی' لیکن اب بھی ہم اس میں سے نکل نہ سکتے تھے۔ چنانچہ اس نے دوسری سلاخ کاٹنے کا مجھے اشارہ کیا۔ پندرہ بیس منٹ میں نے بھی ریتی چلائی اور سلاخ اوپر نیچے دونوں طرف سے کاٹ ڈالی۔ اب پھر انتونیو نے ریتی سنبھالی اور پہلی والی سلاخ کے اوپری جوڑ پر ہاتھ چلانا شروع کیا۔ یہ کام ایسا مشقت طلب تھا کہ آدھ پون گھنٹے ہی میں سردی کے باوجود ہم پسینے پسینے ہو گئے۔ بارش اسی رفتار سے ہو رہی تھی' بادلوں کی گرج اور بجلی کی کڑک نے ہمیں اچھا سہارا دیا' سلاخوں پر ریتی رگڑنے کی آواز اس بے پناہ شور نے جذب کر لی تھی۔

کوٹھڑی سے باہر نکلنے کا وہ لمحہ ناقابل فراموش ہے۔ اگرچہ پادری کا دیا ہوا پستول میرے ہاتھ میں تھا' لیکن ہر آن یوں محسوس ہوتا جیسے ابھی چاروں طرف سے ہم پر گولیوں کی بوچھاڑ ہونے والی ہے اور جیل کے کونوں کھدروں میں چھپے ہوئے سیاہ فام مسلح پہرے دار ہمارا جسم چھلنی کرنے کے لیے تیار ہیں۔ انتونیو نے میرا ہاتھ تھاما اور گھپ اندھیرے میں بارش کی بوچھاڑ میں بھاگتے ہوئے ہم صحن میں داخل ہوئے۔ وہاں کوئی نہ تھا البتہ قیدیوں کی اس بڑی بارک میں جہاں میرے ساتھی بند تھے' روشن دانوں کے اوپر سے مدھم روشنی دکھائی دے رہی تھی..... انتونیو کی بصارت حیرت انگیز حد تک تیز تھی' حالانکہ مجھے دس فٹ سے زیادہ فاصلے کی کوئی شے دکھائی نہ دے رہی تھی۔ وہ چیتے کی مانند دبکتا لپکتا مڑتا' بل کھاتا مجھے اپنے ساتھ گھسیٹے لیے جاتا تھا۔ آناً فاناً جیل کی سات فٹ اونچی چار دیواری کے پاس پہنچ کر ہم لمحہ بھر کو رکے' پھر اس نے میرا ہاتھ چھوڑ کر بندر کی طرح جست کی اور دیوار پر چڑھ گیا۔ پھر

جھک کر میرا ہاتھ تھاما اور اپنی بے پناہ قوت کے زور پر مجھے بھی اوپر کھینچ لیا۔ جیل والوں نے دیوار پر ٹوٹے ہوئے شیشے جمار رکھے تھے۔ دفعتہً مجھے یوں احساس ہوا جیسے میری بائیں ہتھیلی میں خنجر گھونپ دیا گیا ہے۔ ایک نوکیلا شیشہ ہتھیلی کو لہولہان کر گیا تھا' لیکن اس وقت چیخنے کا موقع تھا نہ کچھ سوچنے سمجھنے کا..... ادھر انتونیو نے پرلی طرف چھلانگ لگائی ادھر میں نے اس کی پیروی کی' پرلی طرف بارش کا پانی جمع تھا۔ میں اس پانی اور کیچڑ میں منہ کے بل گرا اور آنکھوں کے سامنے چنگاریاں سی اڑنے لگیں۔ انتونیو نے پھر میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور ہم دونوں تیزی سے اس موسلا دھار بارش میں ایک طرف بھاگنے لگے۔ مجھے کچھ خبر نہ تھی کہ میرا ساتھی کدھر جا رہا ہے۔ میں اندھا دھند اس کی تقلید کر رہا تھا' بہت جلد معلوم ہو گیا کہ ہم کوراکاؤ گاؤں میں سے گزر رہے ہیں' ہر طرف گھپ اندھیرا تھا جسے آسمان پر چمکنے والی بجلی ایک ثانیے سے بھی بہت کم وقفے میں دور کرتی اور اس معمولی وقفے میں مجھے اپنی آنکھوں سے کام لینا پڑتا تھا۔ انتونیو تمام راستوں سے خوب واقف تھا۔ وہ تیز رفتاری سے لگڑ بگے کی مانند اچھلتا کودتا مسلسل دوڑ رہا تھا' گاؤں کی گلیاں پتلی' کچی اور ٹیڑھی تھیں' جا بجا بارش کا پانی کھڑا تھا اور کہیں ٹخنوں ٹخنوں دلدل..... میرا خیال تھا کہ انتونیو کے ساتھی جیل سے نکلتے ہی ہماری مدد اور رہنمائی کو موجود ہوں گے لیکن کوئی بھی نہ تھا۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ انتونیو کے ساتھیوں کو یہ اندازہ نہ تھا کہ ہم آج ہی رات فرار ہو جائیں گے۔

دوڑتے دوڑتے انتونیو نے اپنے تھیلے میں سے کوکین کا پتا نکال کر مجھے دیا اور میں نے اسے منہ میں رکھ لیا۔ اس کی تاثیر عجیب تھی۔ جونہی اس کا کسیلا عرق حلق سے اترا جسم میں ایک نئی چستی اور قوت بھر گئی اور میری پہلے کی خستہ حالت یک لخت دور ہو گئی۔ اب میں بھی دنیا و مافیہا سے بے پروا اور کسی قسم کے خطرے سے بے نیاز دیوانہ وار انتونیو کے ساتھ بھاگ رہا تھا۔ اب یاد آتا ہے کہ ہم ساری رات اسی طرح دوڑتے رہے اور ایک منٹ کے لیے بھی آرام کیا' نہ ستائے۔ بارش اسی طرح ہوتی رہی' کوراکاؤ کا گاؤں بہت پیچھے رہ گیا تھا اور نہ جانے ہم کس کس آبادی اور کون کون سے علاقوں سے گزر کر اب ایک گھنے جنگل کے اندر داخل ہو گئے تھے..... تھکن کا احساس ناپید تھا بلکہ جی چاہتا کہ زندگی بھر اسی طرح دوڑتا رہوں۔ اس بھیانک رات کی یہ مہم مرتے دم تک یاد رہے گی۔ جنگل سے نکل کر ایک پرپیچ پہاڑی راستے میں داخل ہوئے۔ آہستہ آہستہ بارش تھمنے لگی اور مشرق کی جانب سے صبح کے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

اجالے کی سنہری لکیر افق پر نظر آنے لگی۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ہمارے سامنے ٹھاٹیں مارتا ہوا سمندر تھا۔ یہ جزیرے کا جنوبی ساحل تھا۔ کنارے کے ساتھ ساتھ ماہی گیروں کی جھونپڑیاں دور تک پھیلی ہوئی تھیں اور پانی میں بہت سی چھوٹی بڑی بادبانی کشتیاں' اسٹیمر اور لانچیں کھڑی دکھائی دے رہی تھیں۔

انتونیو مجھے انہی جھونپڑیوں میں سے ایک کے اندر لے گیا۔ اس میں اندھیرا تھا لیکن یہ جاننے میں کوئی دقت نہ ہوئی کہ وہاں چند آدمی موجود ہیں اور گہری نیند سو رہے ہیں۔ کم از کم دو آدمیوں کے خراٹوں کی آواز جھونپڑی میں گونج رہی تھی' انتونیو نے جاتے ہی اپنی زبان میں زور زور سے کچھ کہا۔ غالباً گالیاں دی ہوں گی۔ ان گالیوں کا اچھا نتیجہ برآمد ہوا۔ سونے والے جاگ گئے۔ ایک نے شاید انتونیو کی آواز پہچان کر ٹارچ روشن کی۔ پھر وہ اسے دیکھ کر ہیبت زدہ ہو کر سجدے میں گر گئے۔ انتونیو نے پھر غرا کر کچھ کہا اور ایک آدمی کے سر پر لات ماری۔ وہ الٹ کر اوندھے منہ گر گیا۔ میں نے دیکھا باقی تین تھر تھر کانپ رہے ہیں جیسے انہوں نے کسی بھوت کو دیکھ لیا ہو۔

دس منٹ بعد ہم انتونیو کے ان آدمیوں کی معیت میں ایک بار پھر ساحل کی طرف جا رہے تھے۔ ایک بڑی موٹر لانچ میں ہمیں سوار کیا گیا' اس کا انجن اسٹارٹ ہوا اور لانچ تیزی سے سمندر کا سینہ چیرتی ہوئی شمال کی جانب چلنے لگی۔ انتونیو اپنے آدمیوں سے نہ جانے کیا باتیں کرتا رہا' وہ سب غور اور ادب سے سنتے رہے اور بار بار احترام میں گردنیں ہلاتے رہے۔ اس نے میری طرف اشارہ کر کے انہیں شاید میرے بارے میں ان تمام باتوں سے آگاہ کیا جو اس کے علم میں تھیں۔ میں بتوں کی طرح چپ چاپ اس شان دار لانچ کے اندر بنے ہوئے کیبن میں بیٹھا باری باری سب کی صورتیں تک رہا تھا۔

سورج نکلنے کے چند منٹ بعد ہماری لانچ ایک خوب صورت جزیرے پر رُکی' میرے اندازے کے مطابق ہم نے سمندر میں کامل دو گھنٹے سفر کیا۔ اس وقت تک سورج خاصا بلند ہو چکا تھا۔ اس تمام سفر میں ہم نے کوکین کے پتوں کے سوا کچھ کھایا نہ پیا۔ سچ تو یہ ہے کہ پیاس لگی نہ بھوک۔ مجھے برابر جان کلاز اور ماترو کی یاد ستاتی رہی۔

جب ہم اس ننھے سے حسین جزیرے پر اترے تو ہر شے سنہری' تیز اور گرم دھوپ میں نہائی ہوئی تھی۔ سفر کے دوران ہی میں ہمارے بھیگے ہوئے کپڑے خشک ہو چکے تھے لیکن کیچڑ

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

اور دلدل کے باعث حلیہ ایسا تھا کہ جو دیکھتا وہ ڈر جاتا۔ میرے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی میں گہرا زخم آیا تھا۔ لیکن اب زخم پر خون اچھی طرح جم چکا تھا اور اس میں کوئی درد یا تکلیف بھی محسوس نہ ہو رہی تھی۔ مجھے بتایا گیا اس جزیرے کا نام ریو ہاچا ہے اور یہیں سے پولیس نے گھیرا ڈال کر انتونیو کو گرفتار کیا تھا۔ یہ جزیرہ دراصل اسی کی ملکیت ہے۔ جونہی موٹر لانچ سے اتر کر ہم ساحل پر آئے بہت سے ماہی گیروں اور دوسرے آدمیوں نے ہمیں گھیر لیا۔ انتونیو کو دیکھ کر وہ خوشی سے پاگل ہو گئے۔ بعض لوگوں نے رقص شروع کر دیا اور انتونیو کو کندھوں پر اٹھا کر جلوس کی صورت میں دوڑنے لگے' میں ان چاروں آدمیوں کے حلقے میں تھا جو موٹر لانچ لے کر آئے تھے۔ حیران تھا اتنے آدمیوں کی موجودگی میں پولیس نے انتونیو کو کیسے پکڑا ہوگا۔ یہ بعد میں پتہ چلا' پولیس نے ایکا ایکی اس مکان کو گھیر لیا تھا جس میں اتفاق سے انتونیو تن تنہا آرام کر رہا تھا اور اس کے ساتھی مختلف مہموں پر گئے ہوئے تھے۔

ایک بڑی سی عمارت میں ہمیں لے جایا گیا' تھوڑی دیر بعد کھانے کے لیے طرح طرح کے پھل' ابلی ہوئی مچھلیوں اور گوشت کے ڈھیر ہمارے سامنے رکھ دیئے گئے۔ خوب پیٹ بھر کر کھایا اور محسوس ہوا کوکین کا یہ اثر بھی نرالا ہے کہ اول تو بھوک لگتی ہی نہیں اور آدمی کھانے بیٹھ جائے تو کھاتا ہی چلا جاتا ہے۔ انتونیو نہ جانے کہاں چلا گیا تھا' ایک گھنٹے بعد وہ اس کمرے میں آیا جہاں مجھے رکھا گیا تھا۔ میں اسے دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ اس کی ڈاڑھی غائب اور سر کے بال بھی تراش دیئے گئے تھے۔ لمبے ناخن کٹے ہوئے اور لباس صاف ستھرا۔ بلاشبہ وہ ایک خوب صورت بدن کا طاقت ور جوان آدمی تھا اور اپنے گروہ کی سرداری کے ہر طرح لائق..... مجھے دیکھ کر وہ ہنسا اور اپنے آدمیوں سے کچھ کہا۔ مجھے بتایا گیا میں چاہوں تو غسل وغیرہ کر کے نئے کپڑے پہن سکتا ہوں مگر اس وقت مجھے نیند آ رہی تھی لیکن میں نہانے کے لیے تیار تھا۔ دو آدمی مجھے ایک غسل خانے میں لے گئے جہاں صابن' تولیہ اور آئینہ سب کچھ موجود تھا۔ مجھے مقامی باشندوں کا سا لباس بھی پہننے کو دیا گیا' میں نے کہا میری ہتھیلی پر گہرا زخم ہے اس کا علاج ہونا چاہیے۔ چند لمحوں بعد ایک سیاہ فام آدمی ہاتھ میں تھیلا اٹھائے ہوئے آیا اس نے میرے زخم کا معائنہ کیا اور اشارے سے بتایا گھبرانے کی بات نہیں معمولی زخم ہے' ٹھیک ہو جائے گا۔ اس نے اپنے تھیلے میں سے عجیب عجیب رنگوں کی ڈبیاں برآمد کیں۔ ان میں نہایت بدبودار مرہم سا تھا۔ زخم پر دو تین قسموں کا مرہم باری باری لگا کر اس نے اوپر ایک زرد رنگ کا پتا رکھا پھر دھجیاں سی باندھ دیں۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

شام ہوئی تو وہ آدمی نمودار ہوا جو پادری کا بھیس بھر کر کورا کاؤ جیل میں آیا تھا اور جس کا دیا ہوا پستول اب بھی میرے پاس تھا' میں اسے دیکھ کر ایسا خوش ہوا جیسے کوئی پرانا دوست مل گیا ہو۔ وجہ یہ تھی کہ وہ روانی سے فرانسیسی بول سکتا تھا۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر خوش ہوا۔ گرم جوشی سے مصافحہ کر کے بولا:

''میں آپ کو رہائی کی مبارک باد دیتا ہوں۔ موسیو پیپلن' لیکن یہاں زیادہ دیر تک ٹھہرنا پریشانیوں کا باعث بن سکتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ انتونیو سے سبھی ڈرتے ہیں اور کورا کاؤ کی برٹش حکومت کو اچھی طرح اس کی قوت کا اندازہ ہے۔ وہ اسے پھانسی پر کبھی لٹکا ہی نہیں سکتے لیکن محض اپنے وقار کی نمائش کے لیے گورنر نے اسے موت کی سزا سنائی تھی۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ خود جیل والوں کے اشارے پر ہم نے انتونیو کی رہائی کے انتظامات کیے تھے؟ گورنر نے در پردہ انہیں ہدایت جاری کی تھی کہ انتونیو اور موسیو پیپلن کو جیل سے بھاگ نکلنے کا موقع دے دیا جائے۔ آپ خوش قسمت ہیں کہ انتونیو کے ساتھ ہی آپ کو رکھا گیا تھا ورنہ وہاں کے سیاہ فام باشندے آپ کے بے حد خلاف تھے اور اگر برٹش حکومت آپ کو رہا کر بھی دیتی تو کوئی نہ کوئی سیاہ فام مشتعل ہو کر آپ کو ضرور ٹھکانے لگا دیتا..... بہر حال اب فرمایئے کیا ارادے ہیں؟''

''کیا مجھے یہاں سے کہیں اور جانا ہوگا؟'' میں نے کہا' ''کیا یہ ممکن نہیں کہ میرے دونوں ساتھی جان کلاز اور ماترو کسی طرح یہاں آ سکیں۔''

اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بولا: ''موسیو' انہیں ان کے حال پر چھوڑیے' فی الحال آپ اپنی فکر کیجیے۔''

میں سوچ میں پڑ گیا اور یکا یک میری چھٹی حس بیدار ہوگئی۔ اندر ہی اندر ایک نامعلوم خطرے کا خدشہ ذہن میں منڈلاتا نظر آیا۔ مجھے اس شخص کی باتیں بڑی پُراسرار لگ رہی تھیں۔ یاد آیا کورا کاؤ جیل میں جب اپنے دو ساتھیوں سمیت آیا تھا تو اس نے کچھ اور باتیں بتائی تھیں۔ اب یہ کچھ اور کہتا ہے۔ آخر ان میں صحیح اور غلط کیا ہے' کیوں ہے؟ میں بہر حال ان وحشیوں کے پھندے میں گرفتار تھا اور یہ ہرگز مناسب نہ تھا کہ انہیں اپنا دشمن بنا کر مزید آفتیں مول لوں۔ جن لوگوں سے برطانوی حکومت بھی خوف کھاتی ہو ان کے سامنے میری حیثیت ہی کیا ہے۔ اگر چاہیں تو چیونٹی کی طرح مجھے پاؤں سے مسل ڈالیں۔ میں اسی غور و فکر میں ڈوبا ہوا تھا کہ وہ شاید میری پریشانی بھانپ کر بولا:

''آپ جانتے ہیں موسیو پیپلن! انتونیو کا دھندا کیا ہے؟ دن رات جان ہتھیلی پر رہتی ہے اس کا ہیڈ کوارٹر اروبا آئی لینڈ میں ہے اور وہاں وہ صرف انتہائی قابل اعتماد ساتھیوں کو جانے کی اجازت دیتا ہے۔ مجھے معلوم نہیں آپ کی منزل مقصود کیا ہے۔ میں صرف یہ کہوں گا کہ اگر آپ انتونیو کے گروہ میں شامل ہو جائیں تو مزے میں رہیں گے۔ ویسے آپ اپنے بارے میں کوئی بھی فیصلہ کرنے میں آزاد ہیں۔''

میں خاموش رہا' جرائم کی دنیا میں رہ کر جو کچھ دیکھا' جو کچھ کیا تھا' یہ اسی کی سزا تھی۔ اب میں انتونیو جیسے قاتل اور بے رحم شخص کے گروہ میں شامل ہو کر پھر اسی تاریک غار میں جا گرتا۔ کیا خبر یہ شخص آج خوش ہے کل ناراض ہو جائے اور میرا تیا پانچا کر ڈالے۔ وہ خود کہتا ہے اس نے پچاس ساٹھ قتل کیے ہیں۔ کیا ایسے شخص کے ساتھ رہنا مناسب ہوگا؟ دوسرا مسئلہ یہ تھا میں اب کدھر کا رخ کروں؟ کہاں پناہ لوں؟ کیا اتفاق تھا کہ پورا کرہ ارض میرے لیے اجنبی بن چکا تھا' ایک بھگوڑے مجرم کے لیے کہیں جائے اماں نہ تھی۔

''موسیو! کیا آپ تیرنا جانتے ہیں؟'' اس نے اچانک مجھ سے پوچھا۔ میں حیرت سے اس کا منہ تکنے لگا۔ مطلق سمجھ میں نہ آیا' اس غیر متعلقہ سوال سے اس کا کیا مقصد ہے؟

''میں سمجھا نہیں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ تیرنا بے شک مجھے آتا ہے۔''

''آہ..... اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ غوطہ خوری بھی جانتے ہوں گے۔''

دوسرا سوال اور بھی عجیب تھا۔ کاش اس وقت مجھے اندازہ ہوتا کہ بظاہر اس بے ضرر سوال کے صحیح جواب میں میرے لیے کس قدر مصیبتیں اور پریشانیاں پوشیدہ ہیں لیکن یہ قدرت کے وہ اسرار ہیں جن کا جواب انسان کے پاس کبھی نہ ہوا۔ میں نے اپنے مخاطب کو تعجب کی نظروں سے دیکھتے ہوئے اثبات میں گردن ہلائی۔

''جی ہاں اس فن سے بھی کچھ نہ کچھ آگاہ ہوں۔ فرمایئے کہاں غوطہ لگوایئے گا۔''

ایک معنی خیز تبسم اس کے پتلے پتلے لبوں پر نمودار ہوا۔ آنکھوں کی چمک کچھ اور بڑھ گئی اور وہ مجھے ایسا درندہ دکھائی دینے لگا جو کئی روز سے بھوکا ہو اور جس کے سامنے اچانک شکار آ جائے۔ ایسا شکار جس میں بچاؤ کی جرأت باقی نہ ہو۔

''بہت خوب موسیو! بہت خوب!'' وہ بولا' ''آپ تو خاصے کام کے آدمی ہیں اور میرا خیال ہے انتونیو یہ سن کر خوش ہوگا..... ہم آپ کے لئے جلد ایک اچھا کام تلاش کریں گے'

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

پھر آپ کو کہیں جانے کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔ اچھا آپ تھکے ماندے ہیں' آرام کیجیے' باقی باتیں پھر ہوں گی۔''

اس نے گرم جوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور میں پریشان تھا کہ آخر وہ کون سا کام ہے جسے یہ لوگ میرے لیے تلاش کریں گے اور جس کا تعلق غوطہ خوری سے ہوسکتا ہے..... مجھے کچھ خبر نہیں کب وہ کمرے سے نکلا اور میں نے کب اس سے مصافحہ کیا۔ انتہائی راز دارانہ رویے سے میرے ذہن میں شکوک و شبہات کی ایک قیامت مچی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر کے اپنے تھکے ہوئے دماغ اور جسم کو سہارا دینے کی کوشش کی مگر بے سود۔ دل کی دھڑکن ہر لمحہ تیز سے تیز ہوتی جا رہی تھی..... یکا یک بے پناہ پیاس نے مجھے ستانا شروع کیا۔ پانی کی تلاش میں ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی' سامنے ایک بے رنگ کے مشروب سے بھری ہوئی ایک بوتل دھری تھی۔ اسے پکڑ کر اس کا کارک کھولا' بو سے اتنا اندازہ ہوا کہ شراب کی کوئی بوتل ہے۔ دوسرے ہی لمحے میں نے اسے اپنے منہ سے لگا لیا' چند گھونٹ پیے تو احساس ہوا کہ نرالا مشروب ہے خوش ذائقہ شیریں..... بوتل ہاتھ میں لیے میں دوبارہ فرش پر جا بیٹھا اور آہستہ آہستہ پیتا رہا..... وہ آنکھیں جو تھوڑی دیر پہلے نیند سے نڈھال ہو رہی تھیں آپ ہی آپ بند ہونے لگیں..... تن اور اعصاب خود بخود پُرسکون ہو گئے..... میں نے گردن ایک طرف جھکائی اور پھر دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہ رہی۔ صرف یہ احساس زندہ تھا کہ میں نہایت گہری تاریکی میں اترتا چلا جا رہا ہوں۔

✣ ✣ ✱ ✣ ✣

آنکھ کھلی تو اپنے گرد و پیش گہری تاریکی کو مسلط پایا۔ کئی بار ہاتھوں کو حرکت دینے کی کوشش کی..... بے سود اور بے کار..... گردن موڑنے کی سعی بھی لاحاصل نکلی۔ رفتہ رفتہ ذہن کی گم شدہ صلاحیتیں واپس آنے لگیں۔ یکا یک ایک نئے احساس نے جنم لیا..... یہ احساس اپنے ہاتھ پیروں کو صاف محسوس ہو رہا تھا کہ مضبوط ڈوری سے میرے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے گئے ہیں..... اس خوفناک احساس کے قوت پاتے ہی میں نے چیخنے کی کوشش کی لیکن آواز سینے ہی میں گھٹ کر رہ گئی..... جیسے چھاتی پر پتھر کی بھاری سل رکھ دی گئی ہو لیکن حقیقت میں وہاں کسی سل کا وجود نہ تھا..... البتہ میرے منہ میں کپڑا ضرور ٹھونس دیا گیا تھا اور یہی وجہ

تھی کہ میں نہ بول سکتا نہ چیخ سکتا تھا۔ خدا کا شکر کہ باندھنے والے نے میری ناک کے نتھنے بند نہیں کیے تھے اور سانس لینے کا یہ ایک ذریعہ باقی رہنے دیا تھا ورنہ.....

اپنے ہوش و حواس کامل اور صحیح حالت میں لانے کے لیے مجھے خاصی ذہنی جدوجہد سے کام لینا پڑا۔ واقعہ یہ ہے کہ مجھے چھٹی حس نے خطرے کا احساس تو دلا دیا تھا لیکن یہ احساس ہرگز نہ تھا کہ میں اتنی جلد اس حالت سے دوچار ہو جاؤں گا۔ کم بختوں نے میرے ہاتھ اور بازو پشت کے پیچھے لا کر اس انداز میں باندھے تھے کہ کوشش کے باوجود میں جنبش نہ کر سکتا تھا..... میرے نیچے گھاس..... موٹی اور خشک گھاس بچھی تھی۔ اس کے علاوہ کسی اور شئے سے میرے پاؤں مس نہ ہوئے۔ میں کہاں پڑا تھا؟ یہ کون سی جگہ تھی؟ اس کے بارے میں کوئی اندازہ لگانا ممکن نہ تھا۔ اندھیرا اتنا گھپ کہ جیسے میں پاتال میں پڑا ہوں۔ روشنی کی کوئی ننھی سی کرن بھی نظر نہ آتی تھی۔

خدا ہی بہتر جانتا ہے وہ زرد رنگ کا مشروب کیا تھا اور وہاں کس مقصد کے لیے رکھا گیا تھا؟..... ممکن ہے وہ بوتل میرے لیے ہی رکھی گئی ہو..... اگر یہ بات ہے تو ان کے ذہن میں پہلے ہی سے میرے بارے میں ایک خاص منصوبہ مرتب ہو چکا تھا۔ مجھے یہ بھی خبر نہ تھی کہ میں کتنے عرصے بے ہوش رہا اور آیا اسی جزیرے پر ہوں یا وہاں سے کہیں اور منتقل کر دیا گیا ہوں۔ پہلا خیال میں نے یہ باندھا کہ اگر انتونیو یا اس مصنوعی پادری سے میرا آمنا سامنا کبھی ہو گیا تو میں انہیں موت کے گھاٹ اتارے بغیر نہ چھوڑوں گا۔ یہ تصور خاصا دل خوش کن تھا۔ اگر قتل و غارت ہی اپنی زندگی کا محور ٹھہرا ہے تو اس میں ہرج ہی کیا ہے۔

دفعتہً کچھ فاصلے پر ایک ایسی آواز سنائی جیسے دوڑتا ہوا گھوڑا ایک دم رُک گیا ہو۔ پھر یہ آواز قریب آتی گئی..... دھڑکتے دل کے ساتھ میں نے اپنے کانوں کی پوری حسیات اس آواز کو سننے اور پہچاننے پر لگا دیں..... پھر چرچراہٹ کی سی آواز..... اس کے بعد نور کا ایک سیلاب سا اندر گھس آیا..... یہ سورج کی روشنی تھی جو معاً میری آنکھوں پر پڑی اور یوں لگا جیسے میں اندھا ہو گیا ہوں..... میں نے آنکھیں میچ لیں..... اور گردن اس طرح ایک طرف ڈال دی جیسے بے ہوش ہوں۔ آنے والا بالکل میرے پاس آ کر رکا..... میں نے ڈرتے چندھی نظروں سے اسے دیکھا..... میرے سامنے ایک دیو قامت ریڈ انڈین کھڑا تھا۔ اس کا قد چھ فٹ چار انچ کے لگ بھگ۔ چہرہ چوڑا اور اس پر خون جھلکتا ہوا..... کھوپڑی میں

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

سوراخ کر دینے والی چمکیلی آنکھیں..... پھولے ہوئے نتھنے.....موٹے موٹے ہونٹ.....موٹی مضبوط گردن جس کی رگیں تنی ہوئیں..... پیشانی پر سرخ پٹی بندھی ہوئی ..... لمبے اور گھنے سیاہ بال دونوں شانوں اور پشت پر بکھرے ہوئے' جسم بے حد گٹھا ہوا اور سخت..... بازوؤں کی مچھلیوں میں بے پناہ تڑپ.....اوپر کا دھڑ برہنہ نچلے دھڑ پر چست پتلون' جسے چمڑے کی کئی انچ چوڑی پٹی سے باندھا گیا تھا۔ اس پٹی میں تین انچ لمبے کار توس اور ایک لمبا خنجر بھی بندھا ہوا۔ دائیں ہاتھ میں قیمتی دونالی بندوق۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے ہمدردی تھی نہ نفرت' بلکہ ایسی خوشی جو غلام کو دیکھ کر آقا کو ہوتی ہے۔ مجھے ہوش میں پا کر اس کے لب کھلے اور وہ ہنسا۔ یہ ایسی ہنسی تھی جس میں فاتحانہ عنصر تلاش کر لینا کچھ مشکل نہ تھا۔ بندوق ہلا کر اس نے دوسری ٹھوکر میری پسلیوں میں ماری اور میں اذیت سے دہرا ہو گیا۔ اس نے ہاتھ دراز کر کے میرے منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا نکال دیا اور سر کے بال پکڑ کر چہرہ اوپر اٹھایا۔ چند ثانیے تک وہ میری آنکھوں میں جھانکتا رہا' پھر بال چھوڑ دیئے اور جھونپڑی کے دروازے پر جا کر زور زور سے چیخنے لگا۔ شاید کسی کو بلا رہا تھا۔ فوراً ہی بھاگتی ہوئی ایک ریڈ انڈین لڑکی اندر داخل ہوئی اور سیدھی میری طرف آئی۔ مرد نے اسے اپنی زبان میں چند ہدایات دیں جس پر اس نے عمل کا آغاز کر دیا۔ مرد بندوق تانے کھڑا رہا' لڑکی نے پہلے میرے ہاتھ کھولے' پھر گردن کی رسی ڈھیلی کی' اس کے بعد پاؤں آزاد کیے۔ جونہی میں نے لڑکھڑا کر اٹھنے کی کوشش کی' مرد نے بندوق میری چھاتی سے لگا کر دھکا دیا۔ میں گر پڑا اور ہانپنے لگا' لڑکی بھاگی بھاگی جھونپڑی کے دوسرے گوشے میں گئی اور مٹی کے ایک بڑے سے پیالے میں پانی بھر کر لائی۔ دوزانو بیٹھ کر اس نے پانی کا پیالہ میرے لبوں سے لگا دیا۔ پانی پی کر تن بدن میں روح کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے مسکرا کر اپنی زبان میں لڑکی سے کہا ''شکریہ۔'' وہ ہنس پڑی اور اس نے پانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا: ''اور پیو گے؟'' میں نے نفی میں گردن ہلائی۔ مرد اسی طرح چوکنا اور ہوشیار بندوق تھامے کھڑا تھا۔ اس کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکلا۔ لڑکی مجھے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس کی نظروں میں ہمدردی تھی' خلوص تھا اور محبت کی نرم سی جھلک.....ایسی محبت جو کسی مجبور اور بے بس مرد کو دیکھ کر کسی بھی عورت کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے۔

لڑکی سولہ برس کی ہو گی' اس کے کھلے بال کمر سے بھی نیچے لٹک رہے تھے اور ان میں بڑی نفاست سے کنگھی کی گئی تھی۔ اس کا قد میرے برابر یعنی پانچ فٹ نو انچ۔ مرد کی طرح اس نے بھی پیشانی پر سرخ پٹی باندھ رکھی تھی۔ اس کی خوب صورت لمبی گردن میں نیلے پیلے اور سرخ رنگ کے چھوٹے بڑے پتھروں کے کئی ہار پڑے تھے۔ اس کا رنگ تپے ہوئے تانبے کی مانند سرخ تھا۔ رخساروں کی ہڈیاں' کسی قدر ابھری ہوئی اور آنکھیں بڑی بڑی گہری سیاہ.....ٹھوڑی سخت اور بڑی جو اس کی طبیعت کے استقلال کو ظاہر کرتی تھی۔ مرد کی طرح اس کا اوپری دھڑ بھی برہنہ تھا اور نچلے دھڑ میں ٹخنوں تک اس نے سرخ رنگ کا کپڑا لپیٹ رکھا تھا۔

مرد نے مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا اور اس مرتبہ لڑکی نے مجھے سہارا دیا' اس کے بھرے بھرے بازوؤں میں بڑی توانائی تھی۔ مجھے سہارا دیتے ہوئے وہ میرے قریب آ گئی کہ اس کا سانس میرے چہرے کو چھونے لگا۔ نہ معلوم میں کتنا عرصہ اس طرح بندھا پڑا رہا تھا۔ ٹخنے' بازو اور کلائیاں زخمی تھیں اور ان سے خون رس رہا تھا۔ جھونپڑی سے باہر آ کر میں رکا اور گردو پیش کا جائزہ لیا۔ یہ ایک ویران اور حد نظر تک بے آب و گیاہ علاقہ تھا۔ جا بجا ریڈ انڈینوں کی چھوٹی بڑی جھونپڑیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ حیرت کی بات تھی کہ پورے علاقے میں موجود لوگوں نے چھاؤں کے لیے کسی درخت کو باقی نہ رہنے دیا تھا۔ سب کے سب درخت کاٹ ڈالے گئے تھے۔ خدا جانے اس میں ان کی کیا مصلحت تھی۔ ممکن ہے ایندھن کے آسان حصول کے لیے یہ کام کیا گیا ہو۔ جھونپڑیوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ بیس پچیس تک ہو گی۔ بڑی جھونپڑیوں میں کئی کئی دروازے بنائے گئے تھے۔ ہر جھونپڑی مخروطی شکل کی تھی۔ ٹھیک دوپہر کا وقت تھا اور بادلوں سے صاف شفاف آسمان پر سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ جس جھونپڑی میں محبوس تھا وہ اس طرح بنائی گئی تھی کہ اگر اس کے دروازے بند کر دیئے جاتے تو کرن اندر داخل نہ ہو سکتی تھی اور دن ہی میں گھپ اندھیری رات کا سماں پیدا ہو جاتا تھا۔

پہلے مجھے خیال ہوا یہاں ہم تینوں افراد کے سوا کوئی اور نہیں رہتا مگر جلد ہی یہ غلط فہمی دور ہو گئی۔ آہستہ آہستہ جھونپڑیوں میں آرام کرنے والے ریڈ انڈین باہر نکل کر ایک جگہ جمع ہونے لگے۔ ان میں ہر عمر کے افراد تھے بوڑھے ادھیڑ نوجوان کم سن اور نوزائیدہ.....بعض

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

نے اپنے بدن رنگ برنگے کپڑوں سے ڈھانپ رکھے تھے اور بعض بالکل مادر زاد برہنہ تھے۔ چاروں طرف کھڑے تھے۔ ان کی نگاہوں میں حیرت اور دل چسپی تھی۔ بعض آدمیوں نے میرے جسم کو اس طرح ٹٹولا جیسے قصاب ذبح کرنے سے پہلے گائے کو ٹٹولتا ہے۔ پھر وہ قہقہے مار مار کر ہنسنے لگے۔ ایک اور نوجوان لڑکی نے آگے بڑھ کر میرا جسم ٹٹولنا چاہا' لیکن میری ہمراہی لڑکی نے دانت پیس کر اسے زور سے دھکا دے کر پیچھے ہٹا دیا۔ پھر اپنی زبان میں اسے ڈانٹا۔ یہ ڈانٹ بالکل ایسی تھی جیسے وہ مجھے اپنی ملکیت سمجھتی ہو اور کسی دوسری لڑکی کو میرا بدن چھونے کی اجازت دینے کے لیے تیار نہ ہو۔

''اس مرتبہ برے پھنسے ہو موسیو ہنری پیپلن۔'' میں نے دل میں کہا: ''یہ لوگ تمہاری بوٹیاں نوچ نوچ کر نہ کھا جائیں تو پھر کہنا''..... جس لڑکی کو دھکا دیا گیا تھا وہ غیظ و غضب میں بھری ہوئی اٹھی اور خونخوار درندے کی طرح اپنی حریف کی طرف جھپٹی۔ دونوں گتھم گتھا ہو گئیں اور ایک دوسرے کو تھپڑ' گھونسے اور لاتیں مار مار کر لڑنے لگیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے دونوں کے چہرے لہولہان تھے اور کوئی بھی فریق ہار ماننے کو تیار نہ تھا۔ ان کے سانس پھول چکے تھے۔ پیٹ دھونکنی کی مانند حرکت کر رہے تھے۔ رخساروں' ہونٹوں اور گردن سے خون کے فوارے جاری تھے' کبھی ایسا لگتا کہ بس ہار جیت کا فیصلہ ہونے ہی والا ہے۔ کبھی میری ہمراہی لڑکی کا پلہ بھاری ہونے لگتا' کبھی دوسری لڑکی حاوی ہو جاتی۔ تعجب یہ ہے کہ اس خون ریز جنگ کو سبھی دل چسپی اور شوق سے دیکھ رہے تھے۔ کسی نے انہیں چھڑانے کی کوشش نہ کی۔ جونہی لڑنے والیوں میں سے کسی کو تازہ زخم لگتا اور خون کا فوارہ ابلتا' تماشائی خوش ہو کر فلک شگاف قہقہے لگاتے۔ میرا خیال ہے ان لڑکیوں کے پاس اگر چاقو یا خنجر ہوتے تو ان میں سے ایک یا دونوں بہت پہلے ہی ہلاک ہو چکی ہوتیں۔

پندرہ منٹ تک یہ لڑائی پورے جوش و خروش سے جاری رہی۔ اب دونوں کے برہنہ بدن تیز دھوپ کے باعث پسینے میں نہا گئے اور ہونٹوں کے کنارے سے سفید سفید جھاگ پھوٹ نکلا۔ یکا یک میری ہمراہی لڑکی نے ایک ہولناک چیخ مار کر اپنے سفید سفید نوکیلے دانت اپنی حریف کی گردن میں گاڑ دیئے۔ ایسا لگتا تھا وہ اسے کچا چبا جائے گی۔ دوسری لڑکی کی گردن سے خون کی دھار بہہ نکلی اس نے جھٹکا دے کر اپنے آپ کو آزاد کرا لیا۔ اس کے غیظ و غضب اور اشتعال کی کوئی انتہا نہ رہی لپک کر اس نے اپنے پاس کھڑے ہوئے آدمی

کے ہاتھ سے بندوق چھینی اور دھائیں سے اپنی حریف پر فائر جھونک دیا۔ دوسرے ہی لمحے ایک ادھیڑ عمر کا ریڈ انڈین اپنا برہنہ بازو پکڑ کر چلا اٹھا۔ گولی اسے جا لگی تھی۔ یہ دیکھ کر فائر کرنے والی لڑکی نے بندوق پھینک دی۔ ادھیڑ عمر زخمی سے لپٹ کر رونے لگی اور یوں اس خون ریز لڑائی کا خاتمہ ممکن ہو سکا۔ زخمی ریڈ انڈین لڑکی کو اپنے ساتھ لیے ایک اور جھونپڑی کی طرف بڑھ گیا اور میری ہمراہی لڑکی نے فاتحانہ انداز میں میری جانب دیکھا۔ میں مسکرا دیا۔

وحشیوں کے اس مجمع میں ایک شخص چہرے مہرے سے کسی قدر سمجھ دار اور متین نظر آیا۔ وہ بھی مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ دوسرے ریڈ انڈین لوگوں کی نسبت اس کا لباس زیادہ اچھا اور نئی تہذیب سے قریب تھا۔ بندوق اس کے ہاتھ میں بھی تھی اور پیشانی پر سرخ کپڑے کی پٹی بندھی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ میرے قریب آیا اور ہنسنے لگا۔ پھر اس نے اسپینش زبان میں کچھ کہا' میں نے اسے اشارے سے بتایا کہ یہ زبان میں نہیں جانتا۔ اس نے گردن ہلائی اور سوالیہ انداز میں کہا: ''انگلینڈ؟''

''نہیں..... فرانس.....''

''اچھا..... اچھا.....'' اس نے پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے تعریفی نظروں سے مجھے دیکھا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اس کا پنجہ سخت کھردرا اور مضبوط تھا۔ پھر وہ مجھ سے ملی جلی سپنش' فرانسیسی اور انگریزی میں باتیں کرنے کی کوشش کرنے لگا' لیکن بدقسمتی سے میری حالت ایسی تھی کہ میں کچھ سمجھ نہ پایا اور غالباً یہی کیفیت اس کی بھی تھی۔ بہت مشکل سے صرف اتنا جان سکا کہ میں گوجیرہ انڈین کے ایک قبیلے میں ہوں اور اب مجھے اس وقت تک یہیں رہنا ہے جب تک میرا مالک چاہے گا۔ مجھے اس کے ہر حکم کی تعمیل ایک کتے کی طرح کرنی ہوگی اور اگر میں نے انکار یا بھاگنے کا ارادہ کیا تو اس کی سزا..... انڈین نے پہلے مجھے اپنا خنجر دکھایا پھر بندوق ہلائی۔ صریحاً اس کا مطلب یہ تھا کہ میری جان سلامت نہ رہے گی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ انتونیو کے آدمی مجھے اس قبیلے کے ایک آدمی کے ہاتھ بیچ گئے ہیں اور میری غلامی کی مدت زیادہ سے زیادہ دو سال اور کم از کم چھ ماہ ہوگی۔ اردگرد کے تمام علاقے میں ریڈ انڈین قبائل بکھرے ہوئے ہیں اور میں ان کی نگاہوں سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ میں نے ڈبڈبائی آنکھوں سے پوچھا۔ آخر مجھے غلام بنانے کا فائدہ کیا ہے؟ وہ مسکرایا اور کہنے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

لگا''سفید فام! تمہیں ہمارا غلام بننے پر اعتراض کیوں ہے؟ کیا تم نے پہلے ہمیں غلام نہ بنایا تھا لیکن اطمینان رکھو..... ہم تمہارے ساتھ وہ سلوک نہ کریں گے جو تمہاری نسل ہمارے ساتھ کرتی رہی ہے..... تمہارا کام سمندر کی گہرائیوں میں جا کر ہمارے لیے موتی تلاش کرنا ہوگا..... سمجھے ہم نے سنا ہے تم بہت اچھے غوطہ خور ہو..... اور ان دنوں ہمارے پاس غوطہ خوروں کی کمی ہے..... فکر نہ کرو..... تم جتنے موتی نکال کر لایا کرو گے ہم اس میں سے تمہارا حصہ تمہیں ضرور دیں گے..... اور جب تم آزاد ہو کر سفید فام لوگوں میں جاؤ گے تو وہ تمہارے پاس اتنے موتی دیکھ کر حیران ہوں گے..... ان موتیوں کو بیچ کر تم بہت دولت مند بن جاؤ گے۔''

وہ اشاروں اور زبان سے نہ جانے کیا کہہ رہا تھا اور ادھر میری ٹانگیں بری طرح لرز رہی تھیں اور دل اس خیال سے دھڑک رہا تھا کہ شاید ہی ان سے آزادی ملے۔ بے شک میں تیرنا خوب جانتا تھا اور ایک زمانے میں پیرس کے دریائے رائن میں غوطے لگانے کا مشغلہ بھی دوستوں کے ساتھ اختیار کیا تھا لیکن یہ بات تو وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ ایک روز مجھے ریڈ انڈین قبائل کی غلامی قبول کرتے ہوئے سمندروں کے گہرے پانی میں غوطہ زنی کرنی ہوگی۔ بچپن میں ان کے بارے میں عجیب عجیب کہانیاں پڑھی اور سنی تھیں اور ایک ہیبت دل میں اسی وقت سے بیٹھی ہوئی تھی۔ پھر ابھی اپنی آنکھوں سے دو وحشی لڑکیوں کی خونریز جنگ دیکھنے کے بعد زندگی پر سے رہا سہا اعتبار بھی اٹھ چکا تھا۔ جن کی عورتیں اور لڑکیاں آپس میں لڑتے ہوئے اتنی خونخوار اور وحشی ہو جائیں ان کے مردوں اور نوجوانوں کا کیا حال ہوگا؟ میں نے گردن موڑ کر اس دیو پیکر قوی ہیکل انڈین کی طرف دیکھا جس کی جھونپڑی میں مجھے قید کیا گیا تھا۔ غالباً وہی میرا آقا تھا اور مجھے آئندہ ایک بدتر غلام کی حیثیت سے اس کے ہر حکم کی تعمیل میں گردن خم کرنی تھی۔ میرے حلق میں ''پلان'' اس وقت بھی موجود تھا جس میں کم و بیش تین ہزار فرانک پوشیدہ تھے۔ خیال آیا ان وحشیوں سے اپنی آزادی کی قیمت تو دریافت کروں۔ ممکن ہے یہ تین ہزار فرانک لے کر مجھے چھوڑ دیں لیکن دوسرے ہی لمحے اس خدشے نے مجھے روک دیا کہ کیا خبر یہ رقم بھی مجھ سے چھین لی جائے اور آزادی بھی نصیب نہ ہو۔ بہرحال میں نے اس وقت مصمم ارادہ کر لیا کہ مرنا تو ہر صورت میں ہے ہی۔ ایک بار یہاں سے فرار ہونے کی کوشش ضرور کروں گا۔ یہ میں نے بھانپ لیا تھا کہ

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

میری خاطر لڑنے والی انڈین لڑکی نگاہوں ہی نگاہوں میں مجھے اپنائیت کا پیغام دے چکی ہے اور اب اس پیغام سے فائدہ اٹھانا میرا کام ہے۔

میں نے اشارے سے انہیں بتایا کہ میں سخت بھوکا ہوں۔ مجھے کھانے کو کچھ دو۔ ان کم بختوں کو اس کا احساس ہی نہ تھا کہ میں بھی انہی کی طرح گوشت پوست کا بنا ہوا ہوں اور مجھے بھی بھوک پیاس ستا سکتی ہے لیکن بعد میں پتہ چلا کہ وہاں کے تو قواعد و ضوابط اور زندگی بسر کرنے کے اصول ہی نرالے تھے۔ قبیلے کا کوئی فرد اس انڈین لڑکی کے سوا جس نے پہلے پہل مجھے ہاتھ لگا کر اپنی تحویل میں لینے کا اعلان کر دیا تھا' مجھے کچھ کھلا سکتا تھا نہ پینے کو کچھ دے سکتا تھا۔ ایسی حرکت وہاں بہت بڑا جرم تھا۔ اس ''مہذب'' انڈین نے مجھے غلامی کا ''مژدہ جانفزا'' سنانے کے بعد حلق پھاڑ کر آواز دی:

''لالی..... لالی.....''

چند لمحوں بعد وہی لڑکی نمودار ہوئی۔ معلوم ہوا اسی کا نام لالی ہے۔ اس کا رنگ واقعی دہکتے شعلوں کی مانند لال بھبھوکا تھا۔ انڈین نے اسے بتایا کہ تمہارا سفید فام غلام بھوکا ہے اور کھانے کو مانگتا ہے۔ وہ ہنسی اور میرا ہاتھ پکڑ کر ایک وسیع و عریض جھونپڑی میں لے گئی۔ اس جھونپڑی کے تین دروازے تھے۔ ایک مشرق میں دوسرا مغرب میں اور تیسرا شمال کی۔ جانب عورتیں مغربی دروازے سے اندر گئیں۔ جوان اور مسلح مرد مشرقی دروازے سے اور بوڑھے شمالی دروازے سے..... یہ حیرت انگیز رسم تھی اور جیسا کہ مجھے بعد میں پتا چلا سختی سے اس کی پابندی کرنی پڑتی تھی۔ اگر کوئی فرد اپنا مقررہ دروازہ چھوڑ کر دوسرے دروازے سے کسی بھی جھونپڑی میں داخل ہو جائے تو اسے سزا دی جاتی تھی۔ ان وحشیوں کا خیال تھا کہ نوجوان مرد چونکہ سورج دیوتا کی نمائندگی کرتے ہیں اور سورج مشرق سے نکلتا ہے اس لیے انہیں اپنے گھروں میں مشرقی دروازے سے داخل ہونے کا حق ہے' عورتیں ان کی مددگار ہیں اور ان کے لیے اولاد پیدا کرنے کا فریضہ انجام دیتی ہیں اس لیے انہیں مغربی دروازہ استعمال کرنا ہوگا۔ بوڑھے اس معاشرے میں کوئی خدمت انجام دینے کے قابل نہیں' اس لیے وہ شمال سے آئیں گے وغیرہ وغیرہ۔ یہاں ان بوڑھوں کو بے تکلف گولی مار دینے کا رواج بھی تھا جو بیماری' ضعف یا عمر رسیدہ ہونے کے باعث ہلنے جلنے کے قابل نہ رہے ہوں۔

اس جھونپڑی میں بھی خشک گھاس کا فرش تھا اور مختلف کونوں کھدروں میں جانوروں کی کھالیں پڑی تھیں۔ ایک جانب مٹی اور لوہے کے بھدے بے ڈول اور گندے برتن بھی دکھائی دیئے۔ ان میں کوئی فرد بھی جوتے پہنے ہوئے نہ تھا اور نہ جوتے ان کے لیے کوئی پسندیدہ چیز تھے' میرے پاؤں میں پڑے ہوئے چمڑے کے جوتے انہوں نے فوراً اتروا لیے اور انہیں ایک طرف پھینک دیا۔ پھر انہوں نے میری قمیض بھی اتروا دی۔ اس کے بعد ایک عجیب بات ہوئی۔ کسی زمانے میں میں نے اپنے بعض دوستوں کی دیکھا دیکھی اپنی کمر' سینے اور بازوؤں پر طرح طرح کے جانوروں کی شکلیں بنوائی تھیں۔ یہ شکلیں رنگ برنگی تھیں مثلاً سینے پر ایک ببر شیر کی صورت' کمر پر مگرمچھ کی اور بازوں پر عقابوں اور بازوؤں کی کئی چھوٹی بڑی تصویریں دیکھ کر ہر انڈین مرد اور عورت تصویر حیرت بن گیا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر غور سے دیکھتے اور انگلیوں سے باری باری چھوتے۔ میرے قوی ہیکل مالک نے انہیں دلچسپی سے دیکھا اور اشارے سے پوچھا' یہ شکلیں میں نے کیسے بنائیں اور کیا ایسی ہی تصویریں میں اپنے آقا کے جسم پر بھی بنا سکتا ہوں۔ میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور انہیں سمجھایا کہ اگر مطلوبہ چیزیں مجھے دی جائیں تو میں ایسی تصویریں اس کے جسم پر بھی بنا دوں گا۔ انہوں نے مجھے پاس ہی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔ سب عورت' مرد اور بوڑھے جھونپڑی کے فرش پر دائرے کی صورت میں بیٹھ گئے۔ لالی کی حریف لڑکی بھی وہیں موجود تھی اور ابھی تک اس کے زخموں سے خون رس رہا تھا لیکن اس نے انہیں دھونے یا صاف کرنے کی کوشش نہ کی تھی۔ جس ادھیڑ عمر آدمی کے بازو میں گولی لگی تھی وہ بھی وہیں بیٹھا تھا: البتہ اس کے بازو پر پٹی بندھی تھی اس کے چہرے پر کوئی خوف و ہراس یا رنج کے آثار نہ تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہ لوگ ایسے حادثوں کے عادی ہیں اور انہیں پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں دیتے۔ مجھے بتایا گیا کہ لالی کی حریف لڑکی کا نام زوریماں ہے اور وہ لالی کی سگی بہن ہے۔ یہ جان کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ایک سفید فام غلام کے لیے دو سگی بہنیں ایک دوسرے کے خون کی پیاسی ہو سکتی ہیں؟ کسی طرح ذہن اس حقیقت کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نہ ہوتا تھا۔ لالی جتنی مرتبہ بھی میرے قریب آتی زوریماں کی طرف فاتحانہ انداز سے مسکرا کر دیکھتی اور ہنستی ہوئی باہر چلی جاتی۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

''مہذب'' انڈین میرے آقا کے دائیں ہاتھ بیٹھا تھا اور اسے مجھ سے بات کرنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ اس نے مجھے بتایا یہ کولمبیا کا علاقہ ہے اور سمندر اس جگہ سے جنوب کی طرف کوئی پانچ میل کے فاصلے پر ہے۔ مجھے روزانہ سورج نکلنے سے پہلے لالی کے ساتھ سمندر کی طرف جانا ہوگا اور دوپہر تک غوطے لگا کر موتی تلاش کرنے ہوں گے۔ میں نے سمجھانے کی کوشش کی کہ میں غوطہ لگانا نہیں جانتا۔ یہ سن کر وہ ہنسا اور اس نے اپنی زبان میں میرے قوی ہیکل آقا کو بتایا۔ ایک دم اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور چہرے کے خدوخال اس قدر بھیانک ہو گئے کہ میرا کلیجہ دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ اس نے دانت پیس کر اپنے پیش قبضہ پر ہاتھ رکھا۔ میں نے دہشت سے اس کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لیں جس پر بلی جست کرنے والی ہو لیکن دفعتہً وہ مسکرایا۔ یہ مسکراہٹ بھی بڑی سفاکانہ تھی۔ اس نے میرے بدن پر گدے ہوئے جانوروں کی تصویریں دیکھیں اور مہذب انڈین سے کچھ کہا۔ اس نے مجھے بتایا کہ قبیلے کا سردار زاٹو یہ بات سن کر خوش نہیں ہوا۔ وہ کہتا ہے اگر اس سفید چمڑی والے کے بدن پر شیر ببر کی تصویر نہ ہوتی تو وہ ابھی اسے اپنے خنجر سے ہلاک کر دیتا۔ آخر اسے غوطہ لگانا کیوں نہیں آتا؟ انتونیو کو اس نے اسی کام کے عوض سونے کی بڑی بڑی رقم دی ہے اور سفید فام کو خریدا ہے..... اگر غوطہ لگانا نہیں آتا' تو یہ کام سیکھنا چاہیے۔ اتنی مہلت ہے۔ جب تک سورج پانچ مرتبہ نہیں نکلتا پانچ مرتبہ غروب نہیں ہوتا۔ میں نے یہ تنبیہہ سن کر اثبات میں گردن ہلائی۔ جان بچانے کا اس کے سوا کوئی ذریعہ نہ تھا کہ ان کی ہر بات پر گردن جھکاتا رہوں۔

اتنے میں لالی اپنے ہاتھوں میں ابلے ہوئے گوشت کے لوتھڑے اٹھائے اندر آئی۔ ایک لوتھڑا اس نے زاٹو کے آگے دھر دیا۔ دوسرا میرے آگے۔ اس میں سے عجیب طرح کی بساند اٹھ رہی تھی۔ اندازہ نہ ہو سکا یہ کس جانور کا گوشت ہے۔ زاٹو نے جلدی سے لوتھڑا اٹھایا اور بھنبوڑ بھنبوڑ کر ہڑپ کرنا شروع کر دیا۔ لالی نے چھوٹے بڑے ٹکڑے سب کو تقسیم کئے اور اپنی حریف اور سگی بہن زوریماں کے سامنے بھی گوشت رکھا جسے اس نے فوراً قبول کر کے کھانا شروع کر دیا۔ اب وہ بھی مسکرا رہی تھی۔ اس کام سے فارغ ہو کر لالی میرے پاس آن بیٹھی اور اس نے لوتھڑے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاٹ کر مجھے کھانے کا اشارہ کیا بھوک کی شدت ایسی تھی کہ کھانا ہی پڑا۔ عجیب کڑوا کڑوا ذائقہ تھا۔ اس گوشت میں

نمک کثرت سے ڈالا گیا تھا۔ بعد میں علم ہوا کہ گدھے کا گوشت ان وحشیوں کی مرغوب ڈش ہے' کھانے کے دوران میں سبھی مرد و زن بولتے رہے اور مجھے دیکھ دیکھ کر دانت نکالتے رہے۔ غالباً وہ میری شخصیت پر تبصرہ کر رہے تھے' گوشت کھاتے ہوئے کسی نے پانی پیا نہ طلب کیا۔ اس سے فرصت پا کر مٹی کے ایک بڑے پیالے میں پانی لایا گیا۔ ہر فرد پیالہ دونوں ہاتھوں سے تھامتا اور جس قدر پینا ہوتا پی لیتا۔ پھر پیالہ آگے بڑھا دیا جاتا۔ سب نے باری باری اس طرح پیاس بجھائی۔ پیالہ خالی ہو جاتا تو لالی دوڑ کر جاتی اور اسے بھر لاتی۔ مجھے اس طریقے سے بڑی گھن آتی لیکن مرتا کیا نہ کرتا۔ اسی بے ہودہ گندے پیالے میں منہ ڈال کر پانی پینا پڑا اور نہ انکار کی صورت میں زاٹو کا خنجر شاید میری زبان ہی کاٹ ڈالتا۔

''مہذب'' انڈین نے اپنی جیب سے سگار نکال کر لالی کو دیا اور لالی نے سگار میرے ہاتھ میں دے دیا۔ چند لمحوں بعد سب مرد و زن کے منہ میں لمبے لمبے سگار دکھائی دیئے اور جھونپڑی کے اندر دھوئیں کے گہرے مرغولے گردش کرتے ہوئے جمع ہونے لگے۔ چند کش لگاتے ہی طبیعت صاف ہو گئی اور بری طرح متلانے لگی' میں جس انداز میں سگار پی رہا تھا اسے دیکھ کر سبھی ہنستے ہنستے بے حال ہو گئے اور میں ان کا طریقہ تمباکو نوشی دیکھ کر ششدر رہا' ہمارا طریقہ تو یہ ہے کہ سگار یا سگریٹ کا جلتا ہوا سرا باہر ہوتا ہے۔ ان وحشیوں کا طریقہ اس کے برعکس تھا۔ وہ جلتا ہوا سرا منہ کے اندر لے جا کر کش لگاتے تھے۔ مجھے حیرت تھی کہ اس عمل میں ان کی زبانیں اور ہونٹ جلنے سے کیونکر محفوظ رہتے ہوں گے۔

تقریب اس طرح ختم ہوئی کہ زاٹو اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ پھر باری باری ہر فرد آیا اور میرے شانے کو چھو کر باہر نکل گیا۔ زوریماں اور لالی رہ گئیں۔ لالی نے زوریماں سے کچھ کہا۔ وہ آئی اور میرے شانے کو ہاتھ لگایا۔ لالی گردن اونچی کیے فخر سے تنی کھڑی تھی جیسے اس نے زوریماں کو اجازت دے کر اس پر بڑا بھاری احسان کیا ہو۔ پھر لالی میرا ہاتھ پکڑ کر باہر لے آئی۔ ہر فرد اپنی اپنی جھونپڑی کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے جنوب کی طرف حد نظر تک پھیلے ہوئے میدان میں نگاہ کا گھوڑا دوڑایا۔ اتنے فاصلے سے سمندر کا دکھائی دینا ممکن نہ تھا' لیکن جنوب کی جانب سے ہر لحظہ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے یقین دلایا کہ بلاشبہ سمندر ادھر ہی ہے۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

قوی ہیکل زاٹو مجھے لالی کے ساتھ چھوڑ کر نہ جانے کدھر چلا گیا تھا۔ اب کوئی مجھ پر زیادہ توجہ نہ دے رہا تھا لالی مجھے ایک اور جھونپڑی کی طرف لے گئی جو سب سے الگ تھلگ بنی ہوئی اور خاصی بڑی تھی۔ اس کا ڈیزائن مخروطی شکل کا تھا اور اس میں تین کے بجائے آٹھ دروازے تھے۔ جونہی میں اندر داخل ہوا میری آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ فرش پر عمدہ قالین بچھا تھا گھاس پھونس کی دیواروں کے ساتھ ساتھ سرخ مٹی کے کئی چبوترے اور ان چبوتروں پر اونی اور سوتی کپڑے کے دبیز گدے۔ شاید یہ چبوترے اور گدے آرام کرنے کے لیے بنائے گئے تھے۔ دیواروں پر بہت سی بندوقیں لٹک رہی تھیں اور ایک جانب لکڑی کے کئی صندوق کارتوسوں سے بھرے پڑے تھے۔ خنجروں' چھروں اور تیر کمانوں کی بھی کمی نہ تھی۔ جھونپڑی کے وسط میں رکھی ہوئی ایک میز پر بہت سے چھوٹے بڑے سفید موتیوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ میز کے ساتھ ہی ایک بہت بڑے کچھوے کا خول دکھائی دیا۔ اس خول پر ایک عمر رسیدہ شخص گردن جھکائے بیٹھا تھا۔ اس نے ہمارے قدموں کی آہٹ پا کر گردن اٹھائی۔ لاتعداد جھریوں میں اس کی آنکھیں ستاروں کی مانند روشن تھیں۔ ان چمکتی آنکھوں کے گرد اس نے سیاہ دائرے سے بنا دیئے تھے۔ ناک سرخ رنگ میں رنگی گئی تھی' کانوں' ہاتھوں اور گلے میں کوڑیوں' سیپیوں' منکوں کے کئی ہار پڑے تھے' مجھے دیکھ کر اس کے موٹے لبوں پر تبسم کی لکیر نمودار ہوئی پھر ایک بھرپور اور گونج دار آواز جھونپڑی کی فضا میں گونجی۔ اس آواز میں جلال تھا' شکوہ عظمت تھی' سفید چڑی والے غلام..... گوجیرہ قبیلے کا جادوگر تمہیں خوش آمدید کہتا ہے۔ لالی یہ آواز سنتے ہی اوندھے منہ اس کے سامنے گر پڑی۔ بوڑھے جادوگر کا ہیبت ناک چہرہ اور پرجلال آواز ایسی نہ تھی جو اثر سے خالی ہوتی۔ دوسرے ہی لمحے میں بھی بے اختیار اس کے سامنے جھک گیا.....

✣ ✣ ✶ ✣ ✣

.....8.....

وہ لمحات شاید میں مرتے دم تک فراموش نہ کر سکوں۔

دیر تک مجھ پر سکتے کی سی کیفیت طاری رہی۔ یقین ہی نہ آتا تھا کہ کسی آدمی کا چہرہ' اس کے خدوخال اتنے بھیانک' ایسے غیر فطری اور اس درجہ اثر انگیز ہو سکتے ہیں' شیطان یقیناً اس بوڑھے انڈین جادوگر سے کہیں زیادہ حسین ہوگا؟ یہ بار بار شبہہ ہو رہا تھا کہ میں آدمی کے روپ میں یونانی یا ہندی صنمیات کا کوئی نمونہ دیکھ رہا ہوں یا یہ شخص سامری کی ذریات کا کوئی بچا کھچا جزو ہو۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ چمک تھی جیسے زرد زرد شمعیں جل رہی ہوں' آنکھوں کی پتلیاں گردش کرتیں تو مجھے بے اختیار صحراؤں کی بلندیوں میں پرواز کرنے والے وہ منحوس گدھ یاد آتے جو مردار کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں اور جونہی انہیں کسی جانور یا آدمی کی لاش دکھائی دے' پر پھیلا کر دائرے بناتے ہوئے آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگتے ہیں' میں نے محسوس کیا کہ اس لمحے میں خود ایک لاش ہوں جس پر یہ انڈین جادوگر گدھ بن کر منڈلانے والا ہے۔ میں نے اپنے ذہن سے اس بڈھے کا خوف زائل کرنے کی بڑی کوشش کی لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ میں جتنی کوشش کرتا اتنا ہی اس کی شخصیت کا گھناؤنا اثر مجھ پر گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی آواز کسی پہاڑی غار یا کنوئیں میں سے آتی ہوئی سنائی دے رہی تھی۔ اپنی وحشی زبان میں نہ جانے وہ کیا کچھ کہہ رہا تھا' میری سمجھ سے بالا تھا۔ صرف ابتدائی الفاظ ''سفید چمڑی والے غلام..... گوجیرہ قبیلے کا جادوگر تمہیں خوش آمدید کہتا ہے۔'' ایسے تھے جنہیں میں سمجھ سکا تھا۔ یہ ٹوٹی پھوٹی فرانسیسی میں کہے گئے تھے اور میں اسی بات پر ششدر تھا کہ اس بوڑھے کو کیسے علم ہو گیا میں فرانسیسی ہوں۔

میں اس کے سامنے بدستور جھکا رہا۔ یہی حال لالی کا تھا۔ میں نے دیکھا اس کا چمک دار تانبے کی سی رنگت کا بدن تھر تھر کانپ رہا ہے۔ بوڑھے جادوگر نے اس کے سر پر کئی بار اپنا

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

بوسیدہ سیاہ مکڑی کی ٹانگوں سے ملتا جلتا ہاتھ رکھا' غالباً وہ کوئی پراسرار عمل کر رہا تھا پھر اس نے تین بار میرے سر پر بھی یہ منحوس پنجہ رکھا اور میرے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ اب تو کوئی شبہ نہ رہا کہ وہ مجھ پر جادو کر رہا تھا جی میں آیا کہ یہاں سے اٹھ کر بھاگوں مگر زمین نے جیسے پاؤں پکڑ لیے تھے اور قوت ارادی تو بالکل ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ یکا یک وہ چپ ہو گیا۔ لالی نے گردن اٹھائی۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ لالی آنکھیں بند کیے دونوں ہاتھ جوڑے ہوئے تھی۔ میری آنکھیں بھی آپ ہی آپ بند ہو گئیں اور ہاتھ آپس میں اس طرح جڑ گئے جیسے میں کسی دیوتا کا پجاری ہوں اور اس کے سامنے بیٹھا ہوں۔ پھر لالی نے اپنی زبان میں کچھ کہنا شروع کیا۔ میں نے اندازہ کیا کہ وہ میرے بارے میں اسے بتا رہی ہے۔ بولتے بولتے وہ اپنا بایاں ہاتھ میرے گھٹنے پر رکھ دیتی تھی اور میں سمجھ جاتا تھا کہ بات میرے ہی بارے میں ہو رہی ہے۔ پھر وہ خاموش ہو گئی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ خبیث جادوگر میری طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے گردش کرتی پتلیوں میں سے شرارے نکلتے دیکھے۔ اس نے اپنے سامنے مردہ بندر کی ایک کھوپڑی نکال کر رکھی پھر خدا جانے کہاں سے نیلے رنگ کا ایک بڑا سا گولا برآمد کیا۔ یہ گولا کسی عجیب سی چمکیلی دھات کا تھا۔ ممکن ہے بلور کا ہو۔ بہرحال میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس چیز کا بنا ہوا تھا۔ اس کا قطر کوئی ایک فٹ کے لگ بھگ ہوگا۔ بندر کی کھوپڑی کے عین اوپر چپٹی سی جگہ میں اس نے یہ گولہ رکھ دیا۔ پھر پاس ہی رکھے ہوئے ایک مٹی کے برتن میں سلگتے ہوئے انگاروں کو کریدا۔ ان پر کوئی نامعلوم سا سفوف چھڑکا اور زور زور سے گردن ہلا کر کچھ بڑبڑانے لگا۔ چند منٹ بعد میں نے جو منظر دیکھا اس نے یقین دلا دیا کہ سائنس کی دنیا سے ہٹ کر ایک الگ کائنات اور بھی ہے جس کے رموز و اسرار کا پتہ لگانا ہر آدمی کے بس کی بات نہیں۔ میں جو کچھ عرض کر رہا ہوں وہ بہ ہوش و حواس عرض کر رہا ہوں اور جو کچھ میں نے اس روز بوڑھے انڈین جادوگر کی جھونپڑی میں دیکھا' اس کے بارے میں قسم کھا کر کہنے کے لیے تیار ہوں کہ یہ کوئی خواب کا منظر نہ تھا۔ عین حالت بیداری میں یہ کرشمہ نظر آیا تھا۔ میں ان جملوں سے آپ کے اشتیاق کو ہوا دینے کا قصد ہرگز نہیں رکھتا اور نہ بدقسمتی سے میں کوئی قلم کار یا ادیب ہوں جو حاشیہ آرائی کروں گا اس لیے جو کچھ دیکھا وہ بیان کرتا ہوں۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

دھواں رفتہ رفتہ جھونپڑی کو اپنی لپیٹ میں لیتا جا رہا تھا' پہلے ہلکا سرمئی' پھر غلیظ سیاہ۔ دھوئیں کے مرغولے تیزی سے اٹھنے لگے۔ اس میں نہایت مدہوش کن اور نرالی بو تھی جس نے چند لمحوں کے اندر میرے جسم و جان کا احاطہ کر لیا تھا لیکن میرے حواس خمسہ سب کے سب برقرار اور تیز تھے البتہ قریب بیٹھی ہوئی لالی' بوڑھا جادوگر اور جھونپڑی میں رکھی ہوئی کل اشیا اس چمکدار نیلے رنگ کے گولے کے سوا معدوم ہو گئی تھیں۔ یہ عجیب و غریب گولہ ہر لمحہ چمکیلا ہوتا جا رہا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ اس کے اندر کوئی زندہ ننھا منا جسم حرکت کر رہا ہے۔ میں نے نگاہیں اس متحرک وجود پر جما دیں' جس کا محض ہیولا میرے سامنے تھا اور ابھی اس کے خال و خط واضح نہیں ہوئے تھے۔ یہ گولے کے اندر تیزی سے حرکت کر رہا تھا۔ پھر یہ واضح اور نمایاں ہونے لگا اور میں نے دیکھا کہ یہ ایک چھوٹا سا سفید فام بچہ ہے جو پالنے میں لیٹا ہوا انگوٹھا چوس رہا ہے۔ چند سیکنڈ بعد یہ منظر غائب ہو گیا اور جب دوبارہ نیا منظر سامنے آیا تو میں نے حیرت سے دانت بھینچ لیے۔ وہ سفید فام بچہ اب بڑا ہو گیا تھا اور ایک خوب صورت گھر کے آنگن میں چند دوسرے بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ آپ اگر یقین کریں تو بتاؤں کہ وہ بچہ میں خود تھا۔ میں نے اپنا وہ گھر پہچان لیا تھا جہاں میں پیدا ہوا تھا اور جن بچوں کے ساتھ میں کھیل رہا تھا' وہ میرے بہن بھائی تھے۔ ابھی میں اس تماشے کو جی بھر کر دیکھنے نہ پایا تھا کہ ایک اور منظر سامنے آیا۔ وہی سفید فام بچہ اب خاصا بڑا ہو گیا تھا اور اس نے آوارہ نوجوانوں کی صحبت اختیار کر لی تھی۔ پھر یکے بعد دیگرے مناظر تیزی سے بدلنے لگے۔ یہ میری اپنی زندگی کے اوراق تھے جو میرے سامنے الٹے جا رہے تھے۔ میں اپنے گھناؤنے اور جرائم سے بھرپور ماضی کی اصلی اور سچی تصویریں دیکھ رہا تھا۔ ایسی تصویریں جنہیں جھٹلانا میرے لیے ممکن نہ تھا۔ اس وقت ایسی عظیم حیرت اور ناقابل یقین دہشت نے مجھ پر قبضہ جما لیا تھا جسے الفاظ میں بیان کرنا دشوار ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ یہ ہنری پیپلن کی زندگی کے بارے میں ایک متحرک فلم تھی۔ اس پراسرار گولے میں میں نے شیطانی جزائر کے تمام واقعات دیکھے۔ سینٹ مارٹن سے فرار' کوڑھیوں کا جزیرہ' سمندر کا ہولناک سفر' فرنیڈیز کی المناک موت' ٹرینیڈاڈ کے خوشگوار دن' پھر کوراکاؤ جیل کی صعوبتیں ل اور آخر میں انتونیو کے ساتھ فرار..... دفعتہً یہ سب سین غائب ہو گئے اور میں نے اپنے آپ کو انڈین قبیلے کے اندر پایا۔ پھر لالی اور زوریماں کی شکلیں دکھائی دیں..... یہ نظارہ رخصت ہوا تو میرے سامنے ٹھاٹھیں

مارتا سمندر تھا..... کیا دیکھا کہ میں لالی کے ساتھ ایک کشتی پر سوار ہوں..... پھر یک لخت گھپ اندھیرا اور سردی کا بے پناہ احساس۔ ایک جھٹکے کے ساتھ میں نے گردن اٹھا کر ازدگرد دیکھا۔ اپنے آپ کو اس جھونپڑی میں جادوگر کے سامنے بیٹھے پایا۔ بندر کی کھوپڑی پر وہ عجیب و غریب گولا اسی طرح دھرا تھا۔ لالی میرے پاس بیٹھی تھی۔ اس کی نگاہیں بھی شیشے کے گولے پر جمی ہوئی تھیں۔

بوڑھے جادوگر نے دو تین مرتبہ گردن ہلا کر وہ گولا اٹھا کر ایک کپڑے میں لپیٹ دیا۔ بندر کی کھوپڑی بھی پرے ہٹا دی اور میری جانب دیکھ کر یوں مسکرایا جیسے کہہ رہا ہو'' کہو سفید فام غلام..... کچھ اور دیکھو گے؟ خبردار! ہم سے کوئی بات چھپانے کی کوشش نہ کرنا۔ تمہاری زندگی کا ایک ایک دن ہم پر روشن ہے تم خود بھی دیکھ چکے ہو'' میں نے غیر ارادی طور پر گردن جھکا دی۔ بڈھے نے پھر اپنا ہاتھ میرے سر پر رکھا۔ لالی سے کچھ کہا اور وہ مجھے لے کر جھونپڑی سے باہر نکل آئی وہ مجھے دیکھ دیکھ کر یوں ہنس رہی تھی جیسے میں اس کا زرخرید غلام ہوں مگر اس میں غلط بات بھی نہ تھی۔ اس کا نہ سہی میں اس کے سگے بھائی زاٹو کا بہرحال زرخرید غلام تھا۔ وہ واپس مجھے اس جھونپڑی میں لائی جہاں اول اول مجھے رکھا گیا تھا۔ ذہن ابھی تک اس جادوگر کے کمالات میں الجھا ہوا تھا۔ مجھے کوڑھیوں کے جزیرے کا بڈھا زوساں یاد آیا جس نے عجیب شعبدے دکھا کر پاگل کر دیا تھا لیکن زوساں کے شعبدے اس انڈین بوڑھے کے آگے کچھ بھی حیثیت نہ رکھتے تھے۔ یہ تو بلاشبہ زوساں کا بھی باپ نکلا۔ اگر سحر کے ذریعے یہ میرے ماضی کا حال جان سکتا ہے تو مستقبل کب اس کی نگاہوں سے چھپے گا؟ یوں بھی اس نے مستقبل کی ایک ہلکی سی جھلک مجھے دکھلا ہی دی تھی؛ اور یہ وہ منظر تھا جس میں مجھے لالی کے ساتھ سمندر میں ایک کشتی پر سوار دکھایا گیا تھا۔ دل و دماغ ان باتوں کو جھٹلانا چاہتے تھے لیکن آنکھیں اس کے لیے تیار نہ تھیں' میں نے عین بیداری کی حالت میں یہ حیرت انگیز تماشا دیکھا تھا۔

اس رات جھونپڑی کے اندر گھاس کے فرش پر لیٹے ہوئے میں نے اپنے آپ کو واقعات اور حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ مزاحمت' جدوجہد' عزم' استقلال اور کوشش کچھ شک نہیں' انسانی زندگی کا بہترین سہارا ثابت ہوتی ہیں تاہم ان سے بھی بالا کوئی نادیدہ قوت ہے جس کی کارفرمائیوں کے سامنے سب کچھ بے کار اور ہیچ ثابت

PVL PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ہوتا ہے۔ خود میرے وسیع تجربات کی ایک رنگا رنگ دنیا پھیلی ہوئی تھی۔ کہاں کہاں' کیسی کیسی کوششیں آزادی اور عافیت کے لیے ہم نے نہیں کیں' لیکن جونہی کسی منزل کو عبور کر کے نئی منزل میں داخل ہوئے' پتہ چلا کہ پہلے سے بھی زیادہ آفتیں اور مصیبتیں ہمارے استقبال کو موجود ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے اب اس آفت بھری زندگی میں لطف آنے لگا تھا۔ میں نے سوچ لیا کہ اگر مجھے کچھ عرصہ انہی وحشیوں میں رہنا ہے تو بالکل انہی کے سانچے میں اپنے آپ کو ڈھال لینا ہوگا۔

انہوں نے مجھے باندھنے یا نگرانی کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہ کی تھی۔ صرف ایک مرتبہ میرا آقا ضرور آن کر دیکھ گیا تھا کہ میں کس حال میں ہوں۔ جیسا کہ مجھے مہذب انڈین نے بتایا تھا اس کا نام زاٹو تھا۔ لالی اور زوریماں اس کی حقیقی بہنیں تھیں' قبیلے کی سرداری زاٹو ہی کے قبضے میں تھی اور کسی فرد کی مجال نہ تھی کہ زاٹو کے احکام کی خلاف ورزی کا ارادہ بھی کرے۔ آگے چل کر میں نے محسوس کیا کہ قدرت نے ان لوگوں کو بعض پراسرار نوعیت کی صفات عطا کی ہیں۔ ان میں ایک صفت بہت نمایاں تھی اور وہ تھی قیافہ شناسی..... شکل دیکھ کر دلی احساسات اور جذبات کو سمجھ لینا ان لوگوں کے لیے کچھ مشکل نہ تھا۔ کبھی کبھی ایسا لگتا کہ ذہن کے سات پردوں میں بھی کوئی بات ان لوگوں سے چھپا کر رکھنی ناممکن ہے۔ عورتوں میں یہ خاصیت مردوں کی نسبت کچھ زیادہ تھی۔ جب میں مہینے دو مہینے میں ان کی زبان کے بعض الفاظ سمجھنے اور بولنے کے قابل ہوا تو اس حیرت انگیز صفت کا بخوبی احساس ہوگیا۔ اگر میں زوریماں کے بارے میں کچھ سوچتا تو لالی فوراً مجھے بتاتی ''اچھا تو تم اس کمینی کے بارے میں سوچ رہے ہو۔'' اور اگر میں لالی کا خیال دل میں لاتا تو زوریماں سے یہ بات پوشیدہ نہ رہتی۔ اسی طرح وہ دونوں جب میرے یا کسی اور کے بارے میں کچھ سوچتیں تو انہیں خوب پتہ ہوتا کہ کس نے کیا سوچا ہے۔

دوسری صفت جوان وحشیوں میں میں نے دیکھی وہ بے خوفی اور پاگل پن کی حد تک بڑھی ہوئی جرأت تھی' خوف یا ڈر تو ان کے خون میں نہ تھا۔ یہ جرات ان سے ایسے ایسے کام کراتی جن کا تصور بھی ایک مہذب' تعلیم یافتہ اور دور جدید کے شائستہ طبقے کے لیے محال ہے۔ شاید اسی قوت ارادی اور جرات کا کرشمہ تھا کہ یہ لوگ بے دھڑک موت کے جبڑوں میں جا کر زندہ سلامت بلکہ ہنستے کھیلتے واپس چلے آتے۔ مجھے ان کی یہ ادا بہر حال بہت بھائی

اور مشاہدے نے بتایا کہ مزہ اسی زندگی کا ہے جو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بسر کی جائے۔ تیسری چیز صفت تو نہیں ایک قومی شعار یا عادت کہنی چاہیے۔ کوئی شخص کسی سے کچھ مانگتا نہیں تھا۔ چیز کے حصول کے لیے قوت درکار تھی۔ جو طاقت ور ہو وہ اس چیز کا حق دار ہے۔ اس معاملے میں ماں' باپ' بہن' بھائی' دوست' دشمن کی کوئی تمیز نہ تھی۔ خود میرے معاملے میں لالی اور زوریماں میں زور آزمائی ہوئی۔ لالی جیت گئی' زوریماں ہار گئی اور اس نے اپنی ہار کو خوش دلی سے تسلیم کر لیا۔ یہ بعد کی بات ہے کہ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد لالی نے اسے میرے پاس اٹھنے بیٹھنے کی اجازت دے دی۔

گوجیرہ لوگوں میں میرا پہلا دن اور پہلی رات بخیر و عافیت کٹ گئی۔ خدا جانتا ہے جب سے یہ فیصلہ کیا کہ مجھے کچھ نہیں سوچنا ہے' کچھ نہیں کرنا ہے' ایک غلام کی طرح اپنے آقا کا ہر حکم بجالانا ہے' کوئی نافرمانی نہیں کرنی ہے اور آزادی کے بارے میں تو سوچنا ہی فضول ہے' اس وقت سے ایک عجیب طرح کا سکون طبیعت کو مل گیا تھا۔ میں آرام سے پیر پھیلا کے اپنے گھر کی طرح اس بے ہودہ جھونپڑی میں سویا۔ تڑکے آنکھ کھلی' باہر نکلا۔ دیکھا کہ تمام مرد و زن اپنی اپنی جھونپڑیوں سے باہر موجود ہیں اور مشرق کی جانب منہ کیے کھڑے ہیں۔ سورج نکلنے میں ابھی کچھ دیر تھی لیکن افق پر اجالا جس تیزی سے پھیل رہا تھا' اس سے یہ معلوم کر لینا مشکل نہ تھا کہ سورج دیوتا کی سواری برآمد ہونے ہی والی ہے۔ میں نے وحشیوں کو دیکھا' وہ خاموش کھڑے تھے' ان کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں اور کوئی فرد دوسرے سے بات نہیں کر رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ سورج کی بھی پرستش کرتے ہیں۔ انہیں میں میرا آقا زاٹو بھی تھا۔ میں جب ادھر چلا تو غالباً میرے قدموں کی آہٹ سے اس نے اندازہ کیا کہ کوئی آتا ہے۔ اس نے گردن گھما کر مجھے دیکھا' دوڑتا ہوا اس جارحانہ انداز میں آیا جیسے میری ٹھکائی کرے گا مگر صرف اتنا ہوا کہ میرا بازو پکڑ کر گھسیٹتا ہوا لے گیا اور اشارے سے بتایا کہ جس طرح دوسرے لوگ مشرق کی طرف رخ کیے گردن جھکائے کھڑے ہیں ویسے ہی میں بھی کھڑا ہو جاؤں۔ میں نے چوں و چرا کیے بغیر حکم کی تعمیل کی۔ زاٹو نے خوش ہو کر دانت نکال دیئے۔ کچھ عجب نہیں دل میں کہہ رہا ہو ایسا فرمانبردار غلام دیکھا نہ سنا۔

اب مزے دار بات یہ کہ کہاں تو وہ ادب آداب تھے' سورج دیوتا کی آمد کے انتظار میں اور کہاں یہ شوریدہ سری و ہنگامہ خیزی کہ جونہی مہر منور نے روئے زیبا دکھایا' کیا مرد کیا

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

عورت زور زور سے اچھلنے کودنے اور ہاتھ پاؤں ہلا ہلا کر غل مچانے لگے۔ اتنا شور مچایا کہ خدا کی پناہ جسموں میں جیسے بجلیاں سی بھر گئیں۔ ہاؤ ہو کا وہ تماشا کہ الامان! طوعاً و کرہاً مجھے بھی اس اچھل پھاند میں اپنے معزز آقا کی پیکھا دیکھی شریک ہونا پڑا۔ نہ ہوتا تو وہ گردن ناپتا۔ آدھ پون گھنٹے تک یہ اچھل کود اور بے معنی قلابازیاں اور پھپھڑوں کی ورزش جاری رہی۔ معلوم ہوا یہ عبادت طلوع آفتاب کے وقت ہوتی ہے اور قبیلے کا ہر فرد و بشر' بیماروں کے سوا' اس میں لازماً شریک ہوتا ہے۔ پہلے پہل تو مجھے اس رسم سے بڑی چڑ ہوئی لیکن بعد میں تجربے سے پتہ چلا کہ یہ اچھی چیز ہے۔ کم از کم اسی بہانے اچھی خاصی ورزش ہو جاتی ہے اور تمام دن آدمی چاق و چوبند رہتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ان لوگوں کے جسم خوب بنے ہوئے تھے جیسے ترشے ہوئے ہوں اس ہاؤ ہو نے میرے تو واقعی انجر پنجر ڈھیلے کر دیئے۔ بدن کا ایک ایک جوڑ فریاد کرنے لگا۔ پھر سب لوگ اپنی اپنی جھونپڑیوں میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہر جھونپڑی کی چھت اور جا بجا اسی مقصد کے لیے بنائے گئے سوراخوں سے دھوئیں کے مرغولے اٹھنے شروع ہوئے۔ معلوم ہوا ہر گھر میں ناشتہ تیار کیا جا رہا ہے۔ ادھر لالی نے جھٹ پٹ گدھے کے گوشت کے چند لوتھڑے نکالے اور آگ جلا کر ان لوتھڑوں کو بھوننے لگی۔ زاٹو بڑی بے صبری سے ناشتے کا منتظر تھا۔ کوئی پندرہ بیس منٹ بعد ہم دونوں نے یہ کچا پکا گوشت پیٹ میں اتارا۔ میرا آقا لمبے لمبے ہاتھ مار رہا تھا اور میری رفتار بہت کم تھی۔ خدا جانے میں نے کیونکر ان الٹیوں کو روکا جو یہ ذلیل گوشت کھانے کے بعد مجھے ایک طرف جا کر کرنی پڑی تھیں۔ میرے آقا نے حسب معمول مجھے اپنے ساتھ ہی بٹھا کر ناشتہ کرایا۔ پھر ایک کڑوا اور کوئی فٹ بھر لمبا سگار بھی پینے کے لیے عطا ہوا۔ لالی بار بار مجھ پر محبت آمیز نظریں ڈالتی اور کھلکھلا کر ہنستی۔ میں بھی بے چارگی کے انداز میں کبھی مسکراتا کبھی کھسیانی ہنسی ہنس دیتا۔ اس کے سوا اور کرتا بھی کیا؟

اس دھندے سے فارغ ہو کر زاٹو نے لالی سے کچھ کہا' وہ دوڑی دوڑی گئی اور لکڑی کی ایک بھدی سی میز اٹھا لائی۔ اس نے یہ میز میرے اور زاٹو کے درمیان رکھ دی۔ پھر سفید رنگ کا ایک پتھر اسے تھمایا' زاٹو نے اپنی چوڑی چکلی ہتھیلی سے میز کی سطح صاف کی' پھر اس سفید پتھر سے چند شکلیں میز پر بنائیں۔ ان شکلوں کو دیکھ کر میں بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کرنے میں کامیاب ہوا۔ دراصل وہ اس انداز میں مجھ سے گفتگو کرنے کا خواہش مند تھا اور

یہ تصویری زبان تھی جو ہم دونوں کو ایک دوسرے سے تفصیلی متعارف کرا سکتی تھی۔ جو تصویریں زاٹو نے بنائی تھیں وہ ایسی تھیں جیسے بچے چاک سے اپنی سلیٹوں پر بنایا کرتے ہیں۔ یہ ایک گاؤں کی تصویریں تھیں جس میں جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ بہت سے مرد' عورتیں اور بچے اس تصویر میں دکھائے گئے تھے۔ گاؤں کے اوپر سورج بھی بنایا گیا تھا' جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ گاؤں مشرق کی جانب ہوگا' پھر زاٹو نے سفید پتھر سے ایک پگڈنڈی سی بنائی۔ اس پگڈنڈی کے ایک جانب اس نے دوسرا گاؤں بنایا یہاں بھی سورج کی تصویر بنائی گئی۔ میں سمجھ گیا کہ اس کا اپنا گاؤں ہے جو مغرب میں واقع ہے۔ میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ زاٹو خوش ہوا۔ دراصل وہ مجھے بتانا چاہتا تھا کہ مشرق کی جانب جو دوسرا گاؤں ہے وہ بھی ایک انڈین قبیلے کا ہے جس سے ان کے تعلقات اچھے نہیں ہیں۔ دشمنی ظاہر کرنے کے لیے اس نے اپنا چھرا نکالا اور مخالف گاؤں کے ایک آدمی کی تصویر پر رکھ کر اس کی نوک دبا دی۔ میں نے پھر اثبات میں گردن ہلائی۔ اب زاٹو نے کپڑے سے یہ تمام شکلیں صاف کر کے ایک نیا گاؤں بنانا شروع کیا۔ یہ سورج کے حساب سے شمال میں تھا۔ یہاں جو لوگ رہتے تھے وہ بھی گوجیرہ قبیلے کے دشمن تھے۔ میں نے اسے بتایا کہ میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں۔ اب اس نے سفید پتھر مجھے دیا۔ میں نے اس کی بنائی ہوئی بے ڈھنگی شکلیں صاف کر کے بوڑھے جادوگر اور اس کے پراسرار گولے کی تصویر بنائی۔ زاٹو یہ تصویر دیکھ کر حیران ہوا۔ میں نے اسے اشارے سے بتایا کہ اگر وہ میرے بارے میں جاننا چاہتا ہے تو جادوگر کے پاس جائے اور اس گولے میں میرے حالات دیکھ لے۔ پھر میں نے لالی کی طرف بھی اشارہ کیا۔ لالی نے اپنی زبان میں ایک لمبی تقریر کی۔ غالباً وہ اسے میرے بارے میں ان تمام حالات سے آگاہ کر رہی تھی جو اس نے جادوگر کے گولے میں دیکھے تھے۔ زاٹو کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور وہ مجھے گھور رہا تھا۔ پھر اس نے گردن جھٹک کر میرے سینے' بازوؤں اور پیٹھ پر گدے ہوئے ببر شیر' عقاب اور مگرمچھ کی تصویروں کو انگلی سے باری باری چھوا اور پوچھا کہ میں اپنے آقا کے بدن پر کب تک ایسی تصویریں بناؤں گا؟ میں نے اسے سمجھایا کہ اگر ضروری چیزیں مل جائیں تو سات روز تک بنا دوں گا۔ پھر میں نے سوئیوں وغیرہ کی شکلیں بنائیں۔ اس نے گردن ہلا کر کہا کہ جب وہ ونزویلا جائے گا تو یہ سامان لیتا آئے گا۔ ونزویلا کا اشارہ اس نے میز پر سمندر اور ایک کشتی بنا کر کیا۔ پھر ادھر سورج بھی بنا دیا۔ سورج بنائے بغیر اس کی کسی بھی تصویر کا مفہوم سمجھنا مشکل تھا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ان مذاکرات کے بعد وہ اٹھ کر چلا گیا' لالی میرے پاس آن بیٹھی اور مسکرا مسکرا کر میری جانب دیکھنے لگی۔ وہ مجھ سے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن بے چاری کچھ نہ کہہ سکتی تھی البتہ اس کی آنکھیں برابر باتیں کر رہی تھیں۔ ایسی باتیں جن کا مفہوم کوئی بھی جوان آدمی بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ پھر اس نے بڑی بے باکی سے میرے بدن کو چھو چھو کر دیکھنا شروع کیا جیسے میں گوشت پوست کے بجائے کسی اور چیز کا بنا ہوا ہوں۔ کبھی وہ میری ناک پر انگلی لگاتی کبھی کانوں کو چھوتی اور کبھی بال پکڑ کر جھٹکے دیتی۔ اس کی لمبی مخروطی انگلیاں جب میرے برہنہ بدن کو چھوتیں تو گدگدی کے باعث میں ہنس پڑتا۔ میرے ہنسنے سے وہ اور خوش ہوتی۔ پھر جان جان کر میری بغلوں' گردن اور پیٹھ پر انگلیاں لگاتی۔ اظہار محبت کا یہ طریق شاید دنیا بھر میں کہیں اور رائج نہ ہوگا۔ ظالم نے اس قدر گدگدیاں کیں اور میں ہنس ہنس کر ایسا عاجز آیا کہ بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ مجھے روتے دیکھ کر پہلے تو وہ حیران ہوئی' پھر خود بھی رونے لگی۔ اب حیران ہونے کی باری میری تھی۔ میں نے اسے سمجھایا کہ جب وہ مجھے چھوتی ہے تو میرے بدن میں گدگدی سی ہوتی ہے اور جب یہ گدگدی ناقابل برداشت ہو جائے تو آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ میں نے عملاً اس کا مظاہرہ کیا۔ جونہی میں نے انگلیاں اس کی گردن پر رکھیں وہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوگئی۔ میں اس وقت تک اسے گدگداتا رہا جب تک اس کی خوب صورت آنکھوں میں آنسو نہ آ گئے۔

اتنے میں ایک بوڑھی خرانٹ عورت جھونپڑی میں آئی۔ اس نے لالی سے کچھ کہا۔ میری طرف قہر آلود نگاہ ڈالی اور چلی گئی۔ لالی نے میرا ہاتھ پکڑا اور جھونپڑی سے باہر نکلی۔ کچھ فاصلے پر درخت کے کٹے ہوئے تنے سے ایک قوی ہیکل اور بہت خوب صورت سفید گھوڑی بندھی ہوئی تھی۔ لالی نے گھوڑی کے قریب جا کر اس کی گردن پر بوسہ دیا۔ پھر اسے کھول کر دو تین تھپکیاں دیں۔ گھوڑی بھی اسے دیکھ کر خوشی سے ہنہنائی۔ لالی اچھل کر اس پر سوار ہوگئی۔ پھر اس نے مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے بھی لالی کی طرح اچھل کر گھوڑی پر سوار ہونے کی کوشش کی مگر ہر بار دھڑام سے نیچے گرا۔ یہ کرتب وحشیوں کو بے حد پسند آئے اور وہ حلق پھاڑ پھاڑ کر قہقہے لگانے لگے۔ میرے باپ دادا بھی اس طرح گھوڑوں پر کبھی سوار نہ ہوئے تھے۔ میں بھلا ان وحشیوں کی کیا نقل کرتا۔ آخر ایک آدمی آگے آیا اس نے مجھے حقیر تنے کی طرح اٹھایا اور گھوڑی پر بٹھا دیا۔ لالی آگے تھی' میں اس کے پیچھے بیٹھا تھا۔ اس نے

میرے بیٹھتے ہی گھوڑی کی پسلیوں میں لات ماری۔ گھوڑی فراٹے بھرنے لگی اور مارے ڈر کے میری جان نکلنے لگی۔ اول تو زین کے بغیر اس طرح بیٹھنا یوں ہی دشوار تھا' اس پر گھوڑی کی قیامت خیز رفتار' ہر گام پر خدشہ ہوتا کہ اب ٹھوکر لگ کر گری اور میری ہڈی پسلی ایک ہوئی۔ میں نے لالی کو بازوؤں میں بھر لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ ادھر تو میرا یہ حال' ادھر اس نڈر لڑکی کی یہ کیفیت کہ قہقہے لگاتی اور گھوڑی کی پسلیوں میں برابر لاتیں رسید کر کے اس کی رفتار اور بڑھاتی جا رہی تھی۔ میں نے اپنے آپ سے کہا' موسیو ہنری پیپلن' بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ آخر ایک دن تو چھری تلے آئے گی۔ اگر روز اسی طرح سواری کے کرتب دکھائے جاتے رہے تو مرو گے بے موت..... لیکن اس موت کی حسرت ہی رہی۔ چھ ماہ لگاتار پانچ میل گھوڑی پر آنا اور پانچ میل جانا پڑا اور گھوڑی کم بخت نے ایک بار بھی ٹھوکر نہ کھائی۔ اب اسے کس کی خوش نصیبی کہوں؟ آگے چل کر تو میں خود اس رفتار کا عادی ہوگیا' گھوڑی جب تک سرپٹ نہ دوڑتی مجھے چین ہی نہ آتا۔

قصہ کوتاہ ایک میل ادھر ہی سے سمندر کا شور کان میں پہنچا۔ ہم ساحل پر آئے۔ وہاں بڑی رونق تھی۔ گوجیرہ قبیلے کے بہت سے مرد و زن اپنے بچوں سمیت موجود تھے۔ کئی چھوٹی بڑی کشتیاں لہروں کے ساتھ رقص کر رہی تھیں' کشتیاں ان لوگوں نے خود بنائی تھیں اور ان کا سٹائل بھی صدیوں پرانا تھا۔ بعض لوگوں نے بڑے بڑے درختوں کے تنے کھوکھلے کر کے انہیں کشتیوں کی صورت دے دی تھی۔ اب اس علاقے میں درخت کٹنے کا معما حل ہوا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ ان کو نئی اور عمدہ کشتیاں بنانا ضرور سکھاؤں گا۔ آخر یہ ایسا کونسا مشکل کام ہے۔

معلوم ہوا' سمندر کے اس حصے میں بڑی دولت چھپی ہوئی ہے۔ قیمتی موتیوں کی شکل میں..... موتیوں کے علاوہ یہ لوگ مچھلیاں بھی پکڑتے تھے۔ موتی نکالنا مشکل کام تھا۔ مچھلیاں پکڑنا آسان..... تاہم مچھلی کے شکاریوں کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ لالی نے ایک کشتی میں مجھے سوار ہونے کا اشارہ کیا۔ میں مٹی کا مادھو بن کر کشتی میں جا بیٹھا۔ لالی نے چپو سنبھالے اور کمال مہارت سے کشتی کو لہروں پر گھماتی' موڑتی' چکر کھلاتی' آگے بڑھنے لگی۔ اس کے قہقہے اب بھی جاری تھے۔ اسے کشتی کھینے میں کوئی دقت نہیں ہو رہی تھی۔ میں اس کم عمر لیکن حد درجہ باہمت لڑکی کی یہ کاوشیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ بخدا اگر مجھے سمندر

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

میں یوں کشتی کھینا پڑتی تو تارے دکھائی دے جاتے۔ ایک جگہ اس نے کشتی کا لنگر پھینک دیا اور چپو میرے ہاتھ میں تھما کر غڑاپ سے پانی میں کود گئی۔ کوئی دو منٹ بعد ہی وہ ابھری۔ اس نے اپنی گردن میں سیاہ کپڑے کی تھیلی باندھ رکھی تھی۔ کشتی کا سہارا لے کر اس نے یہ تھیلی اندر الٹ دی۔ یہ دس پندرہ بے حد خوب صورت سیپیاں تھیں۔ میں انہیں دیکھتا رہا' لالی نے پھر غوطہ لگایا۔ اس مرتبہ وہ زیادہ گہرائی میں اتری جب وہ سطح پر آئی تو اس کا سانس پھولا ہوا تھا لیکن تھیلی اوپر تک تازہ سیپیوں سے بھری ہوئی تھی۔ ظالم اب بھی مسکرا رہی تھی۔ چند لمحے دم لینے کے بعد اس نے تیسرا غوطہ لگایا۔ ادھر وہ غوطے لگا رہی تھی اور ادھر ہر غوطے پر میرا کلیجہ آپ ہی آپ بیٹھنے لگتا۔ کچھ ایسا وہم سا ہوتا کہ اب دوبارہ یہ لڑکی اوپر نہ آ سکے گی۔ آخر سمندر میں سیپیوں کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ خونخوار مچھلیاں' عظیم الجثہ کچھوے یا وہ سمندری گھاس' جس کے ریشوں میں اگر ایک مرتبہ کوئی جان دار پھنس جائے تو بچ نکلنا ممکن نہیں ہوتا۔ وہ جتنا آزاد ہونے کے لیے جدوجہد کرتا ہے' خونیں گھاس کے یہ ریشے اتنا ہی اسے جکڑتے جاتے ہیں۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ ایک زبردست خنجر لالی کی کمر کے گرد بندھی ہوئی پیٹی میں لگا ہے جو ایسی خطرناک آزمائشوں میں کام دے سکتا ہے' بشرطیکہ اسے استعمال کرنے والا اپنے ہوش وحواس برقرار رکھے اور اس دوران میں اس کا سانس بھی ٹوٹنے نہ پائے۔ میں یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ روزمرہ کی مشق کا نتیجہ ہے کہ لالی جیسی اور کئی لڑکیاں بھی زیادہ سے زیادہ گہرائی میں غوطے پر غوطے لگا رہی ہیں اور سمندر کی پوشیدہ دولت نکال نکال کر اپنی اپنی کشتیوں میں ڈھیر کیے جاتی ہیں۔ دو گھنٹے تک غوطہ خوری کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس دوران میں جگہیں بھی برابر بدلی جاتی رہیں' میں لالی کی قوت برداشت دیکھ دیکھ کر حیران تھا اور سوچ رہا تھا کیا میں بھی ایسی ہی مشقت کا بوجھ برداشت کر سکتا ہوں؟ اس کا جواب بہرحال نفی میں تھا۔

سورج عین سر پر آ گیا۔ موتیوں کی تلاش کا کام ختم ہوا۔ سب کشتیاں ساحل کی طرف لوٹیں۔ جس جس نے سیپیاں نکالی تھیں' گن گن کر ڈھیریوں کی شکل میں جمع کر دیں۔ اب ایک اور رسم کا پتہ چلا۔ نوجوان لڑکیوں یا مردوں کو سیپیاں کھول کر موتی برآمد کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ فریضہ بوڑھی عورتوں کا تھا۔ اس ہجوم میں میں نے اس بڑھیا کو بھی دیکھا جو صبح اس وقت جھونپڑی میں آئی تھی' جب میں لالی کو گدگدیاں کر کر کے ہنسا رہا تھا۔ اس

عورت نے پھر شعلے برساتی نگاہوں سے مجھے گھورا' کچھ بڑبڑائی اور لالی کی جمع کردہ سیپیوں میں سے موتی نکالنے لگی۔ لالی نرم نرم گیلی ریت پر لیٹی ستا رہی تھی۔ پھر وہ اٹھی میرا ہاتھ پکڑا اور گھوڑی کی طرف چلی جسے ریت میں لکڑی کی ایک میخ گاڑ کر رسی سے باندھ دیا گیا تھا۔ میں ایک بار پھر پانچ میل واپسی کے سفر سے لرز گیا۔ لالی میری یہ کیفیت تاڑ گئی۔ اس نے اشارے سے سمجھایا کہ فکر مت کرو' اس مرتبہ میں ذرا آہستہ چلوں گی۔ وعدہ تو اس نے بے شک پورا کیا لیکن مجھے تو یہی محسوس ہوا کہ گھوڑی آندھی کی رفتار سے واپس آئی تھی۔ میرا بند بند بری طرح دکھ رہا تھا جیسے کسی نے خوب دھنائی کی ہو۔

میں نے لالی سے پوچھا کہ ان سیپیوں میں سے جو موتی نکلیں گے کیا وہ تمہیں ملیں گے؟ بڑی مشکل سے وہ میری بات سمجھنے میں کامیاب ہوگئی۔ اشاروں کی یہ زبان واقعی بہت دشوار تھی' ہنس کر اس نے جواب دیا کہ گوجیرہ قبیلے کا کوئی فرد بھی چور نہیں ہے۔ سمندر سے حاصل کی ہوئی سیپیوں میں سے جتنے بھی موتی نکلیں گے وہ برابر کے تین حصوں میں تقسیم کر دیئے جائیں گے۔ ایک حصہ اس بڑھیا کو ملے گا جو ان میں سے موتی نکالے گی۔ دوسرا حصہ لالی کو اور تیسرا زاٹو کے سفید فام غلام کو دیا جائے گا۔ اگر وہ چاہے تو اپنا حصہ آقا کی خدمت میں پیش کر سکتا ہے۔ جو لوگ زاٹو کے ماتحت ہیں اور اس کی سرداری مانتے ہیں ان پر بھی لازم ہے کہ تمام موتیوں کا چوتھائی حصہ سردار کی خدمت میں حاضر کریں۔

زاٹو نے وہ جھونپڑی لالی اور مجھے دے دی تھی جس میں مجھے پہلی بار قید کیا گیا تھا۔ سہ پہر کو موتیوں کا حصہ لے کر وہی خونخوار بڑھیا آئی۔ پانچ موتی میرے حصے میں آئے تھے۔ سب چھوٹے چھوٹے تھے۔ یہ میں نے اپنے آقا کی خدمت میں پیش کر دیئے۔ اس کی فراخ دلی دیکھیے کہ یہ اس نے مجھے واپس کر دیئے اور اشارے سے سمجھا دیا کہ میں اپنے پاس ہی رکھوں۔ ان موتیوں کے بدلے میں اس کی خواہش تھی کہ میں اس کے بدن پر جنگل کے تمام درندوں' چرندوں اور پرندوں کی تصویریں گودوں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اگلے روز سورج نکلنے کے فوراً بعد وہ روانہ ہو جائے گا۔ اسے شہر تک پہنچنے میں تین مرتبہ سورج نکلے اور ڈوبے گا۔ پھر وہ واپس آئے گا اور اس کے ساتھ وہ تمام سامان ہوگا جو بدن پر تصویریں گودنے کے کام آتا ہے۔

میں نے لالی سے اس بڑھیا کے بارے میں پوچھا کہ یہ کون ہے اور کیوں مجھے ایسی

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

لال لال نظروں سے گھورا کرتی ہے' لالی پہلے تو پریشان دکھائی دی' پھر اس نے مجھے زمین پر چند بھدی شکلیں کھینچ کر سمجھایا کہ اس عورت کا ایک بیٹا ہے جو ہمارے دشمنوں سے جاملا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اس پر دوسرے قبیلے کے جادوگر نے جادو کر دیا ہے۔ اس کی شکل اے سفید فام غلام' تجھ سے بہت ملتی جلتی ہے اور اسی وجہ سے وہ تجھے گھور گھور کر دیکھا کرتی ہے۔ لیجیے دوسرے قبیلے میں بھی جادوگر موجود ہے۔ دراصل ان جنگلی قبائل میں اصل حکمرانی انہی جادوگروں کی ہوتی ہے اور یہ سلسلہ ہزاروں برس سے چلا آ رہا ہے۔ یہ لوگ جھوٹ موٹ کے نہیں سچ مچ کے جادوگر ہوتے ہیں۔ ہر مرض کا علاج جادو کے ذریعے کرتے ہیں' کوئی شخص گم ہو جائے اس کا پتہ بھی جادو کے ذریعے لگا لیتے ہیں۔ کسی دشمن کو ہلاک کرنا ہو یا اس پر قابو پانا ہو تو اس کا بہترین ذریعہ بھی جادو ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ لوگ اپنے فن میں کامل ہیں۔

✣ ✣ ✱ ✣ ✣

مجھے اس قبیلے میں آئے ایک ہفتہ ہو گیا ہے' دنوں کی تعداد کا اندازہ میں ان لکیروں سے کر رہا ہوں جو میں نے درخت کے ایک تنے پر چاقو کی نوک سے بنائی ہیں ہر شب سونے سے پہلے مجھے ایک لکیر اس تنے پر کھینچنی پڑتی ہے ورنہ میں بھول جاؤں گا کہ مجھے غلام بنے ہوئے کتنے دن گزر رہے ہیں۔ انتونیو کے ساتھیوں نے سوائے اس ''پلان'' کے جو میرے حلق میں اترا ہوا تھا ہر شئے مجھ سے چھین لی تھی حتیٰ کہ میری وہ گھڑی بھی جو جیلوں اور قید خانوں کی بھیانک کوٹھڑیوں میں بھی میرے ساتھ رہی۔ یہ گھڑی اس وقت بھی میری کلائی پر بندھی تھی جب کوڑھیوں کے جزیرے پر زوساں کے آدمیوں نے مجھے زیر زمین غار میں پھینک دیا تھا۔

زاٹو ابھی تک نہیں لوٹا ہے۔ اس کی بہنیں لالی اور زوریماں کسی قدر فکر مند ہیں' وہ بہر حال کتنی بھی بے پروا اور سنگ دل ہوں' زاٹو قبیلے کا چیف ہونے کے ساتھ ساتھ ان کا سگا بھائی بھی تو ہے۔ اس کے علاوہ زاٹو کی نوجوان بیوی ہے۔ لمبے قد' مضبوط جسم اور چوڑے چکلے کینڈے کی یہ عورت بڑی ہی جفاکش ہے۔ سارا دن مختلف کاموں میں لگی رہتی ہے۔ کبھی کلہاڑے سے لکڑیاں پھاڑ رہی ہے' کبھی جھونپڑی کی تعمیر میں مصروف ہے' کبھی تیر

اندازی اور بندوق چلانے کی مشق کر رہی ہے۔ اس کا کوئی تین سالہ لڑکا بھی ہے' بالکل اپنے باپ زاٹو کا ہم شکل۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ زاٹو کی بیوی حاملہ ہے اور دوسرا بچہ پیدا ہونے کے دن بہت قریب ہیں۔ اس کے باوجود وہ روزمرہ کی مشقت اور معمول کے مطابق اپنے فرائض کی انجام دہی میں ہمہ تن مصروف رہتی ہے۔ لالی اور زوریماں کبھی کبھار مختلف کاموں میں اس کا ہاتھ بٹایا کرتی ہیں' زاٹو کی مسلسل غیر حاضری تشویش کا باعث بن رہی ہے اور اس مسئلے کا حل بڈھے جادوگر کے پاس ہے۔

ایک بار پھر مجھے اسی جھونپڑی میں جانا پڑا ہے۔ لالی کے ساتھ زوریماں اور زاٹو کی بیوی بھی ہے۔ جادوگر اسی جگہ بیٹھا ہے جہاں پہلے روز میں نے اسے بیٹھے پایا تھا۔ جھونپڑی کے ساز و سامان میں ذرہ برابر تبدیلی کے آثار دکھائی نہیں دیتے' ہر چیز اپنی مقررہ جگہ پر دھری ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے یہاں آن کر وقت بھی اپنا اثر کھو دیتا ہے۔ ہم سب جادوگر کے سامنے اوندھے منہ گر پڑتے ہیں' جھونپڑی میں اس کے ہنسنے کی کرخت آواز گونجتی ہے' میں کن انکھیوں سے دیکھتا ہوں اور لرز جاتا ہوں' بڈھے جادوگر کی شکل ہنستے ہوئے کچھ زیادہ ہی ہیبت ناک ہو گئی ہے۔ وہ اپنی زبان میں کچھ کہتا ہے تینوں عورتیں باری باری کچھ جواب دیتی ہیں اور آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتی ہیں۔ میں بھی ایسا ہی کرتا ہوں۔ جادوگر بندر کی وہی کھوپڑی اور نیلے رنگ کا گولا نکال کر سامنے رکھ لیتا ہے۔ میرے دل کے دھڑکنے کی رفتار تیز ہونے لگتی ہے۔ وہی عمل پھر دہرایا جا رہا ہے۔ جھونپڑی میں دھواں پھیل رہا ہے۔ میں اپنا سر بوجھل ہوتے ہوئے پاتا ہوں' لالی زوریماں' زاٹو کی بیوی اور جادوگر سب اس دھوئیں میں چھپ جاتے ہیں' میری نگاہیں اس گولے پر جمی ہیں اور اس کی چمک آہستہ آہستہ بڑھ رہی ہے۔ میں حیرت سے دیکھتا ہوں میرے سامنے انڈین قبیلے کا ایک گاؤں ہے۔ لوگ ادھر اُدھر چل پھر رہے ہیں۔ ان کی شکلیں اور لباس گوجیرہ قبیلے کے آدمیوں سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان کی تعداد گوجیرہ کی نسبت بہت زیادہ ہے۔ ان کی جھونپڑیاں حد نظر تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ان کے گھوڑے اور مویشی بھی ادھر اُدھر کٹے ہوئے درختوں کے تنے سے بندھے ہیں۔ میں لالی اور زوریماں کی دبی دبی آوازیں بھی سن رہا ہوں۔ یقیناً وہ بھی یہ تماشا دیکھ رہی ہیں اور انہوں نے اس گاؤں کو پہچان لیا ہے۔ یکا یک منظر بدل جاتا ہے' میں اپنے آقا زاٹو کو اس حال میں دیکھتا ہوں کہ وہ بھی ایک تنے سے بندھا ہوا

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ہے۔ پنڈلیوں سے لے کر چھاتی تک اس کے گرد رسیاں ہی رسیاں ہیں' اس کی گردن سینے پر ڈھلکی ہوئی ہے اور وہ بے حد نڈھال دکھائی دیتا ہے۔ زاٹو کی بیوی زور سے کچھ کہتی ہے اور ادھر اس کا شوہر اچانک ڈھلکی ہوئی گردن اٹھا کر ادھر اُدھر یوں دیکھنے لگتا ہے جیسے اپنی بیوی کی آواز اس کے کانوں تک جا پہنچی ہو۔ اس کے بعد یہ منظر غائب ہو جاتا ہے۔ چند اور لوگوں کے چہرے یکے بعد دیگرے سامنے آتے ہیں۔ میں انہیں نہیں پہچانتا لیکن لالی' زوریماں اور زاٹو کی بیوی شاید انہیں جانتی ہوں۔

تماشا ختم ہونے کے بعد ہم سب دوبارہ جادوگر کے سامنے ہاتھ پھیلا کر گر پڑتے ہیں۔ وہ باری باری ہر ایک کے سر پر ہاتھ رکھ کر اٹھنے کا اشارہ کرتا ہے۔ تھوڑی دیر ان میں کچھ باتیں ہوتی ہیں' پھر ہم واپس آ جاتے ہیں۔ زاٹو کی بیوی کا چہرہ غصے اور صدمے سے لال بھبھوکا ہو رہا ہے۔ وہ اپنی جھونپڑی میں جا کر ہڈی کا بنا ہوا ایک سنکھ نکال کر لاتی ہے اور اس کا پتلا سرا ہونٹوں میں دبا کر پھیپھڑوں کی پوری قوت سے بجانے لگتی ہے' سنکھ میں سے ایک ڈراؤنی' بے ہنگم اور تھرتھراتی آواز نکل رہی ہے۔ یہ آواز بھی جادو کا کام کرتی ہے۔ سبھی جھونپڑیوں میں سے مرد دوڑ دوڑ کر آتے ہیں اور زاٹو کی بیوی کے گرد جمع ہونے لگتے ہیں۔ ساری بستی میں ایک دم ہل چل سی مچ جاتی ہے۔ مردوں کے ہاتھوں میں بندوقیں' تیر کمان' کلہاڑے اور نیزے ہیں۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ زاٹو کو دشمن قبیلے نے گرفتار کر لیا ہے اور اب گوجیرہ والے اسے آزاد کرانے کے لیے ایک خونریز لڑائی کے لیے بلائے جا رہے ہیں۔ زاٹو بہر حال ان کا سردار ہے' میں سوچ رہا ہوں کیا ایک غلام کی حیثیت سے مجھے بھی اپنے آقا کی آزادی کے لیے اس جنگ میں شریک ہونا چاہیے لیکن اس کا فیصلہ مجھے نہیں کسی اور کو کرنا ہے' میں تو ایک غلام ہوں۔

سنکھ کی آواز اس بات کا اعلان ہے کہ کوئی خطرہ قبیلے کو درپیش ہے اور انڈین قبائل کے قدیم رواج کے مطابق قبیلے کے ایک فرد پر آفت آئے تو اس کا مطلب ہوتا ہے' پورے قبیلے پر آفت آ گئی اور سب کا فرض ہوتا ہے کہ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے مستعد ہو جائیں۔ عورتیں اور وہ لڑکیاں بھی ایسی خطرناک مہموں اور لڑائیوں میں بڑے شوق' ولولے اور جوش سے حصہ لیتی ہیں جنہیں بندوق چلانی آتی ہے یا جو گھوڑے کی سواری میں طاق ہوتی ہیں۔ میں نے دیکھا کہ سنکھ کی ہر لحہ بلند ہوتی کانپتی اور گونجتی ہوئی آواز کے ساتھ ساتھ قبیلے کے

افراد میں زبردست ہیجان پیدا ہو رہا تھا۔ اب وہ اپنی زبان میں ہاتھ اٹھا اٹھا کر نعرے لگا رہے تھے' چلا رہے تھے۔ انہوں نے چیف کی بیوی کے سنکھ بجانے ہی سے جان لیا تھا کہ زاٹو کسی مصیبت میں گرفتار ہے اور اب وہ سب اپنے سردار کے لیے جان تک دینے کو تیار تھے کاش! ایسی یک جہتی' ایسا اتفاق' ایسی محبت مہذب انسانوں میں بھی ہوتی۔ میں نے یہ تمام باتیں سوچیں اور ندامت سے گردن جھکا لی۔

اتنے میں میرے قریب کوئی آ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ وہی شخص تھا جس کے بازو میں زوریماں نے لالی سے لڑتے ہوئے گولی ماری تھی۔ وہ پٹی ابھی تک اس کے بازو پر بندھی ہوئی تھی.....اس کے دوسرے ہاتھ میں ایک پرانی بندوق تھی اور گلے میں کارتوسوں کی پیٹی لٹکی ہوئی تھی' مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا اور اپنی زبان میں کچھ کہا' شاید پوچھ رہا تھا: ''کہو! مسٹر سفید فام' کیا ارادے ہیں؟ اپنے آقا کو رہا کروانے چلو گے؟'' میں نے یونہی اخلاقاً جواب میں مسکرا کر گردن ہلائی۔ وہ ایک دم خوشی سے اچھل پڑا اور مجھے اس بات کی مسرت ہوئی کہ میں اس کا مفہوم سمجھ گیا تھا۔ اس نے اشارے سے بتایا کہ میرے لیے وہ ایک گھوڑا فراہم کرے گا۔ اتنے میں سنکھ بجنا موقوف ہوا اور غل غپاڑہ کرنے والے چپ ہو گئے۔ ہر طرف ایک سناٹا تھا اور سب کی نگاہیں زاٹو کی بیوی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ لپک کر جھونپڑی میں گئی اور اپنے بچے کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر باہر لائی۔ پھر اس نے بازو بلند کیے تاکہ بچہ سب کو دکھائی دے سکے۔ بچے پر نظر پڑتے ہی وحشیوں کے جوش و خروش اور نعروں کی انتہا نہ رہی۔ وہ بالکل جنگلی بھیڑیے نظر آ رہے تھے۔ میں نے سوچا ایسی حالت میں اگر ان کو دشمن مل جائے تو یہ اس کی تکا بوٹی کرنے میں کتنی دیر لگائیں گے۔ یکا یک وہی مہذب انڈین نمودار ہوا جس نے پہلے دن مجھ سے ٹوٹی پھوٹی ہسپانوی' انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں بات کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی چال میں لغزش تھی اور چہرہ بھی اترا ہوا تھا۔ اس دن کے بعد سے آج میں نے اسے دیکھا تھا۔ اندازہ ہوا کہ گزشتہ دنوں وہ خاصا بیمار رہا ہے اور شاید اسی باعث اپنی جھونپڑی سے باہر نہیں نکلا ہوگا۔ ''تعلیم یافتہ'' ہونے کے سبب قبیلے میں اس کے لیے خاص احترام تھا۔ اسے آتے دیکھا تو لوگ ادھر ادھر راستہ دینے کے لیے کھسک گئے۔ یہ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ اسے زاٹو کی بیوی کے بڑا بھائی ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ اس نے لالی زوریماں اور اپنی بہن سے کچھ کھسر پھسر کی' پھر اس کی آنکھیں ابلنے لگیں۔ اس نے دونوں

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

بازو اٹھائے اور نہایت کرخت لہجے میں تقریر شروع کی۔ اس کے ہر ہر جملے پر سامعین بے اختیار غل مچاتے' اپنے ہتھیار زور زور سے ہلاتے اور گیدڑوں کی طرح ہو ہو ہو ہو کر کے خوب چلاتے۔ پھر اس نے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا۔ سینکڑوں آنکھیں ایک دم مجھ پر حملہ آور ہوئیں۔ ایک مکروہ صورت بڑھیا نے اچھل کر مہذب انڈین سے کچھ کہا' جس کے جواب میں اس نے بڑھیا کو دھکا دے کر منہ کے بل گرا دیا۔ بڑھیا لوٹ پوٹ ہو کر اٹھی اور خنجر نکال کر میری طرف دوڑی۔ اگر میں اچھل کر وار خالی نہ دیتا تو اس کا چمک دار خنجر میرے سینے میں اتر چکا ہوتا۔ چند لمحوں کے لیے میں دہشت کے ایسے سمندر میں ڈوب گیا جس سے نکلنا دشوار تھا۔ اتنا احساس ہے کہ لالی اور زوریماں لپکیں اور اس خبیث بڑھیا کے ہاتھ سے خنجر چھینا۔ وحشیوں کے شور نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ انہوں نے مجھے آن گھیرا اور اپنی زبان میں نہ جانے کیا پکار پکار کر کہنے لگے۔ ان کے تیور یک لخت بگڑ گئے تھے اور وہ مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ ان کا رویہ ایک دم اتنا جارحانہ کیوں ہو گیا تھا۔

لالی اور زوریماں مجھے دھکے دیتی ہوئی زاٹو کی بیوی کے قریب لے گئیں۔ پھر انہوں نے چیخ چیخ کر لوگوں سے کچھ کہنا شروع کیا۔ بار بار وہ ہاتھ سے میری طرف اشارہ کرتی تھیں۔ اتنا تو میں سمجھ گیا تھا کہ وہ مجھے بچانے کی کوشش کر رہی ہیں لیکن دوسری طرف مجمع کے تیور برابر الٹتے پلٹتے جا رہے تھے۔ میں نے زندگی سے مایوس ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ سوچتا تھا کہ اب کسی نے فائر کیا یا اب کسی کی کمان سے تیر نکلا' لیکن رفتہ رفتہ یہ وحشیانہ جوش و خروش مدھم پڑنے لگا۔ یہ مجھے بعد میں پتا چلا کہ اس موقعے پر لوگوں کی رائے یہ ہوئی تھی کہ سردار پر یہ آفت اس سفید فام غلام کی وجہ سے آئی ہے اور اگر اس کی قربانی دے دی جائے تو شاید دیوتا راضی ہو کر زاٹو کو رہائی دلوا دیں۔ وہ قبیلہ جس نے زاٹو کو پکڑ لیا تھا بے حد طاقت ور اور خونخوار تھا اور گوجیرہ والوں کا خیال تھا کہ ایک سفید فام غلام کو مار کر اگر دیوتاؤں کو خوش کیا جا سکتا ہے تو اس کام میں دیر نہ کرنی چاہیے۔ وہ منحوس بڑھیا جو خنجر لے کر مجھے ذبح کرنے لپکی تھی' یہ تجویز پہلے پہل اسی نے پیش کی تھی اور اسی نے زاٹو کو جنم دیا تھا۔ یہ باتیں مجھے مہذب انڈین نے اسی وقت سمجھا دیں۔ اس کا خیال تھا کہ مجھے اپنے آقا کی خاطر یہ قربانی ہنسی خوشی دے دینی چاہیے۔ اس نے بتایا کہ آج سے سو برس پہلے ایک سفید فام غلام نے پہلے بھی

اپنے سرخ آقا کے لیے جان قربان کی تھی۔ ادھر میری حالت اس بے کس کی سی تھی جو اپنے آپ کو بھوکے بھیڑیوں کے درمیان پا رہا ہو اور بچ نکلنے کا کوئی امکان نہ ہو۔ اس پورے مجمعے میں میری حمایتی دو سگی بہنیں لالی اور زوریماں تھیں اور قدرت کا یہ کیسا مذاق تھا کہ محض میری وجہ سے ان بہنوں میں بھی سخت رقابت پیدا ہو گئی تھی۔ ایسی رقابت جو دوسرے کے خون ہی سے مٹائی یا بجھائی جا سکتی ہے۔

زندگی میں کتنے ہی مواقع ایسے پیش آئے تھے جب دامن کے چاک اور گریبان کے چاک میں کچھ فاصلہ باقی نہ رہا تھا۔ بارہا موت دائیں بائیں' آگے پیچھے سے فراٹے بھر بھر کر نکل گئی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ موت کی ہیبت ہی دل سے نکل گئی تھی اور یہ جان لیا تھا کہ جب دریا میں اتر ہی گئے تو موجوں کا شکوہ فضول ہے۔ دریا میں اترنے سے پہلے سب کچھ سوچ لینا چاہیے کہ اس کی گہرائیوں میں گہرے ہی نہیں نہنگ بھی ہوتے ہیں۔ مجھے وحشیوں کے اس قبیلے میں پہنچانے کے ذمے دار کچھ اور لوگ تھے۔ میں اپنی خوشی سے یہاں نہیں آیا تھا اور نہ میں نے کبھی تصور کیا تھا کہ زندگی کے ایسے شب و روز بھی میری تقدیر کا حصہ ہیں۔ اب انسانی شکل و صورت کے ان درندوں کے درمیان گھر جانے کے بعد ایک بار پھر موت کی ہیبت میرے دل و دماغ پر چھا گئی تھی۔ موت ایک نئے روپ میں سامنے آئی تھی' بڑی مصیبت یہ تھی کہ ان وحشیوں کے رسم و رواج ہی دنیا سے الگ تھلگ تھے۔ اگر میں ان کی زبان بولنے پر قادر ہوتا تو شاید تب بھی انہیں سمجھا نہیں سکتا تھا کہ میری موت اور زاٹو کی رہائی یا گرفتاری کا آپس میں کوئی رشتہ نہیں ہے۔ یہاں محبت عداوت' دوستی دشمنی' ایثار اور قربانی کے اصول ہی اور تھے۔ لالی اور زوریماں جان پر کھیل کر میری وکالت نہ کرتیں تو میں آج یہ داستان لکھنے کے لیے زندہ نہ رہتا۔ اب اتنے برس بعد جب کہ واقعی قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں وہ دن یاد آتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہونے لگتے ہیں۔

میں نے کوشش کی کہ خوف کی ذرہ بھر بھی علامت کا اظہار اپنے چہرے یا آنکھوں سے نہ ہونے دوں۔ ڈرپوک آدمیوں سے تو یہ ویسے بھی نفرت کرتے ہیں اور اسے زندہ رہنے کا حق دینا جانتے ہی نہیں۔ میں گردن اونچی کیے سینہ تانے کھڑا رہا اور پھیکی پھیکی مسکراہٹ بھی میرے لبوں پر برابر طاری رہی۔ وہ میرے بارے میں نہایت سنجیدگی سے بحث کر رہے تھے کہ پہلے مجھے قربان کر دیا جائے یا زاٹو کو آزاد کرانے کی مہم پہلے روانہ کی جائے۔ آہستہ

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

آہستہ ان کے کئی گروہ بن گئے۔ پہلا گروہ مجھے فوراً ذبح کر دینے کے حق میں تھا اس گروہ میں زاٹو کی ماں' بیوی اور اس کے تمام رشتے دار شامل تھے دوسرا گروہ مجھے اس مہم پر ساتھ لے جانے کا مطالبہ کر رہا تھا۔ اس گروہ کی سرداری لالی کے ہاتھ میں تھی۔ وہ لوگوں کو سمجھا رہی تھی کہ سفید فام بہت بہادر آدمی ہے۔ بندوق چلانا جانتا ہے' گھڑسواری کا بھی ماہر ہے۔ کیوں نہ یہی شخص اپنے آقا کو آزاد کرائے۔ اگر اس کوشش میں مارا بھی جائے تو یہ قربانی دیوتا قبول کر لیں گے۔ تیسرا گروہ جس کا نمائندہ مہذب انڈین تھا۔ اس بات پر مصر تھا کہ اس غلام کو قبیلے میں آئے ہوئے زیادہ وقت نہیں گزرا' اس کے آتے ہی ہم پر مصیبت آن پڑی۔ کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ دیوتا ہم سے ناراض ہیں؟ ابھی اس نے اپنے آقا زاٹو سے وفاداری کا کوئی ایسا ثبوت نہیں دیا جس پر سب کا اطمینان ہو۔ زاٹو سے اس نے کہا تھا اس کے بدن پر جنگل کے بادشاہ کی تصویر بنائے گا۔ کیا اس غلام نے اپنا وعدہ پورا کیا؟ نہیں کیا..... ایک بار پھر جنگلیوں نے اچھلنا کودنا شروع کر دیا۔ انہیں بھڑکانے کے لیے اتنا ہی کہہ دینا کافی تھا کہ سفید غلام نے اپنے آقا کے بدن پر جنگل کے بادشاہ کی تصویر بنانے کا جو وعدہ کیا تھا اسے پورا نہیں کیا۔ اب ان بدبختوں کو کون سمجھاتا کہ زاٹو وہی سامان لینے تو گیا تھا۔ اس موقع پر موت اور نزدیک کھسک آئی' مہذب انڈین کے طرف داروں اور زاٹو کی ماں بہن کے حامیوں نے بندوقیں میری طرف تان لیں۔ لالی اور زوریماں اچھل کر مجھ سے چمٹ گئیں اور انہوں نے بیک وقت بولنا شروع کر دیا۔ جو کچھ ان کے تیوروں سے سمجھ سکا وہ یہ تھا کہ سفید غلام کو دیوتاؤں کے آگے بھینٹ کر دینے کا فیصلہ بالکل صحیح ہے مگر ابھی اس فیصلے پر عمل کرنے کا وقت نہیں آیا۔ فرض کرو زاٹو آزاد ہو کر آ گیا یا ہم نے وہاں جا کر اسے چھڑا لیا تو وہ تم سے پوچھے گا کہ اس کا غلام کہاں ہے؟ پھر تم کیا جواب دو گے؟ کیا تم اپنے سردار کو ناراض کرو گے۔ تم نہیں جانتے کہ سردار کی ناراضی دیوتاؤں کی ناراضی ہے؟ تم لوگ اپنے سردار کو آزاد کرانے کے لیے دشمن قبیلے میں جاؤ اور اس غلام کو یہیں قید کر دو۔ آدمی اس کی نگرانی کریں گے۔ ان آدمیوں کو اجازت دو کہ اگر یہ بھاگنے کی کوشش کرے تو اسے ہلاک کر دیں۔ اگر تم لوگ زاٹو کو آزاد کرا کر لے..... آتے ہو تو غلام کے بارے میں پھر وہی فیصلہ کرے گا کہ اس کی بھینٹ دیوتاؤں کو دی جائے یا نہ دی جائے۔ زاٹو کو نہ پانے کی صورت میں تمہیں اس غلام پر پورا پورا اختیار ہوگا۔

✣ ✣ ✱ ✣ ✣

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

مجھے انہوں نے زاٹو کی جھونپڑی کے عین سامنے کوئی پچاس فٹ کے فاصلے پر درخت کے ایک تنے سے باندھ دیا ہے۔ میری نگرانی پر دو مسلح وحشی مقرر کیے گئے ہیں۔ ان کے پاس چھرے بھی ہیں' بندوقیں بھی۔ اور انداز بڑے جارحانہ ہیں۔ وہ مجھ سے کچھ دور ٹہل رہے ہیں اور آپس میں نہ جانے کیا باتیں کر رہے ہیں۔ رات کا پچھلا پہر ہے' بستی کے سبھی صحت مند اور لڑاکا مرد اپنے سردار زاٹو کو رہا کرانے کے لئے دشمن قبیلے سے جنگ کرنے چلے گئے ہیں۔ دس پندرہ نوجوان عورتیں بھی لالی اور زوریماں سمیت ان کے ساتھ ہیں۔ جس تنے سے انہوں نے مجھے باندھا ہے' اس کے بالکل قریب کسی پرانے درخت کا خاصا وسیع و عریض تنا ہے جسے انہوں نے ہر طرف سے کھوکھلا کر کے بڑے بڑے طاقچے سے بنا دیئے ہیں۔ ان طاقچوں میں تارپین کے تیل کی کئی مشعلیں دھڑا دھڑ جل رہی ہیں۔ ان مشعلوں کی روشنی اردگرد کے میدان میں پھیلی ہوئی ہے۔ کسی کسی جھونپڑی میں سے بچوں کے رونے کی آواز گاہ گاہ آتی ہے یا کوئی بوڑھا انڈین کھانس کھانس کر اعلان کر رہا ہے کہ وہ ابھی تک زندہ ہے۔ انہوں نے میرے ہاتھ پاؤں اس سختی سے باندھے ہیں کہ میں ذرا بھی جنبش کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ میری نگرانی کرنے والے دونوں آدمی اب چپ ہیں اور گھاس پر لمبے لمبے لیٹ گئے ہیں' تھوڑی دیر بعد میں ان کے خراٹوں کی آواز سنتا ہوں۔

میرا ذہن اس وقت ماؤف ہے اور بدن میں سے جان نکلی ہوئی ہے۔ اس تبدیلی پر میں خود بھی حیران ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ موت آنے سے پہلے انسان کے قویٰ اس طرح مضمحل ہو جایا کرتے ہیں؟ اس میں جان بچانے کا عزم باقی نہیں رہتا؟ تھکن سے میں از حد نڈھال ہوں۔ آہستہ آہستہ میری آنکھیں بھی بند ہو رہی ہیں۔ سچ ہے کہ نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ نہیں کہہ سکتا کہ میری حیات کے اب کتنے گھنٹے باقی رہ گئے ہیں۔ اگر زاٹو کو اس کے ساتھی زندہ واپس لانے میں کامیاب نہ ہو سکے تو.....؟ ذہن پھر ماضی کے اوراق الٹ رہا ہے..... ماترو اور جان کلاز کے چہرے سامنے آتے ہیں۔ میری بند آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی ہے۔ پھر ڈیگا کی یاد آتی ہے۔ یہ سب لوگ خدا جانے کہاں ہوں گے اور ان پر کیا بیت رہی ہوگی۔ ممکن ہے ڈیگا اب تک چل بسا۔ ہو ماترو اور جان کلازو ہیں کورا کاؤ کی جیل میں بند ہوں یا وہ بھی میری طرح کسی انتونیو کے ہتھے چڑھ کر بک چکے ہوں گے۔ کون جانے!

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

دفعتہً گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سن کر میں چونک جاتا ہوں' یہ آواز ہر لحہ قریب آ رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کوئی لشکر ادھر سے گزر رہا ہے۔ بے شمار گھوڑے ہیں۔ پھر وحشیوں کے غل غپاڑے اور ہو ہو کا شور سنائی دیتا ہے۔ میرا لہو خشک ہونے لگا ہے۔ شاید وہ لوگ زاٹو کو لے کر واپس آئے ہوں ورنہ..... میری نگرانی کرنے والے دونوں آدمی نیند سے چونک کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور پریشان نظروں سے ادھر دیکھ رہے ہیں جدھر سے آوازیں آ رہی ہیں۔ دوڑتے ہوئے گھوڑوں کے قدموں سے زمین تھرا رہی ہے۔ آوازیں اب بستی کے چاروں طرف سے آ رہی ہیں' جھونپڑیوں میں سے بچے کھچے مرد و زن گھبرا گھبرا کر باہر نکل رہے ہیں۔ پھر ایک قیامت برپا ہو جاتی ہے' آنے والے بھی انڈین ہی ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں جلتی ہوئی مشعلیں ہیں۔ وہ گھوڑوں پر سوار ہیں اور ان کی تعداد میرے اندازے کے مطابق کوئی دو تین سو کے قریب ہوگی۔ وہ ایک بہت بڑے دائرے کی صورت میں بستی کے گرد گھوڑے دوڑا رہے ہیں اور بری طرح چیختے جاتے ہیں پھر انہوں نے مشعلیں پھینک پھینک کر جھونپڑیوں کو آگ لگانی شروع کر دی ہے۔ فائرنگ شروع ہوگئی ہے' گولیاں میرے سر پر سے اور دائیں بائیں سنسناتی ہوئی گزر رہی ہیں۔ دو تین گولیاں اس تنے پر بھی لگی ہیں جس سے میں بندھا ہوا ہوں۔ میں آزاد ہونے کے لیے سر توڑ کوشش کر رہا ہوں مگر بے سود ہے۔ رسیاں میرے گوشت میں گڑی ہوئی ہیں۔ یکا یک ایک مشعل میرے قریب آن گرتی ہے اور وہ رسی آگ پکڑ لیتی ہے جس سے میں بندھا ہوا ہوں۔ رسی تو جل گئی ہے مگر میں بری طرح جھلس گیا ہوں۔ حملہ آوروں نے چُن چُن کر سب آدمیوں اور عورتوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ جھونپڑیوں میں لگی ہوئی آگ آسمان سے باتیں کر رہی ہے۔ آخر میں وہ بوڑھے جادوگر کو بھی پکڑ لائے ہیں۔ انہوں نے اس کے کپڑوں میں آگ لگا دی ہے اور قہقہے لگا رہے ہیں۔ بوڑھا دیکھتے ہی دیکھتے جل کر کوئلہ ہو جاتا ہے۔ اس کا جادو اسے موت کے ہاتھوں سے نہیں بچا سکا ہے۔ میں ایک طرف لاش کی مانند پڑا ہوں' وحشی برابر گھوڑے دوڑا رہے ہیں اور گھوڑوں کے قدموں تلے لاشیں روندی جا رہی ہیں۔ ان کی ہاؤ ہو برابر جاری ہے۔

پھر وہ گھوڑے روکتے ہیں اور ایک ایک لاش کا جائزہ لیتے ہیں کہ اس میں ابھی زندگی کی رمق باقی تو نہیں۔ ایک وحشی میرے قریب بھی آتا ہے اور میری پسلیوں میں زور سے

ٹھوکر مارتا ہے۔ میرے منہ سے چیخ نکل جاتی ہے۔ اس کے ہاتھوں میں لمبا سا نیزہ ہے۔ وہ نیزہ میرے سینے میں گھونپنے کے لیے بلند کرتا ہے مگر میں اس کی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹ لیتا ہوں۔ وہ دھڑام سے گرتا ہے۔ پھر ہم میں ایک خوفناک کشتی شروع ہوتی ہے۔ وحشی چیختے چلاتے ہوئے ہمارے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ میرا حریف قوی ہیکل ہے اور ہر آن اس کا دباؤ مجھ پر بڑھ رہا ہے۔ میں گھونسے بازی کا فن کام میں لا رہا ہوں۔ دو تین زوردار گھونسے اس کے جبڑے پر ایسے رسید کرتا ہوں کہ اس کا منہ لہولہان ہو جاتا ہے۔ اتنے میں کوئی شخص بلند آواز سے کچھ کہتا ہے' میرا حریف مزاحمت ختم کر دیتا ہے۔ وہ بھی ہانپ رہا ہے اور میں بھی کتے کی طرح زبان نکالے ہانپ رہا ہوں۔ گردن گھما کر دیکھتا ہوں۔ چاروں طرف وحشی کھڑے قہقہے لگا رہے ہیں۔ ایک سفید فام خوب صورت شخص آگے بڑھ کر میرے پاس آتا ہے۔ غالباً یہ ان کا سردار ہے۔ حلیہ انڈین وحشیوں کا سا ہے لیکن اس کی شخصیت میں ایسی کوئی بات ضرور ہے کہ میں چونک کر غور سے اسے دیکھنے لگتا ہوں۔ میرا خیال ہے اس کی رگوں میں انڈین کے علاوہ کسی اور گوری نسل کا خون بھی شامل ہے۔ یہ بات مجھے اس کی نیلی آنکھیں اور سنہری بال بتاتے ہیں۔ وہ بھی مجھے غور سے دیکھ رہا ہے۔ پھر وہ مسکرا کر ہسپانوی زبان میں کہتا ہے۔

''کون ہو تم؟ یہاں کیا کر رہے ہو؟ کیا تم اسی قبیلے سے ہو؟''

میں اس سے اپنا تعارف کراتا ہوں۔ وہ خوب ہنستا ہے۔ پھر ایک گھوڑے پر بٹھا کر اپنے ساتھیوں سمیت اس جلتی ہوئی بستی سے رخصت ہو جاتا ہے۔

✣ ✣ ✱ ✣ ✣

اس کا نام ہے زوریلو' قبیلے کا سردار..... اس کی ماں واقعی ہسپانوی تھی جو زوریلو کے باپ کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔ زوریلو کا باپ اپنے قبیلے کا سردار تھا اور گوجیرہ والوں سے اس کی دشمنی ان گنت برسوں سے چلی آ رہی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ ابھی پچھلے برس ہی گوجیرہ کے آدمیوں نے زوریلو قبیلے کی ایک بستی کو تہس نہس کر ڈالا تھا جس کا بدلہ انہوں نے لے لیا..... وہ دراصل زاٹو کی تلاش میں آئے تھے لیکن زاٹو وہاں نہیں تھا۔ وہ جس قبیلے کے پاس تھا اس سے زوریلو کی دوستی تھی۔ جب میں نے اسے یہ تمام باتیں بتائیں تو وہ بہت خوش ہوا اور کہنے لگا کہ وہ وہاں سے کبھی زندہ واپس نہیں آ سکے گا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

زوریلو نے میری خاطر تواضع میں کسر نہ چھوڑی۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ وہ خود مجھے کولمبیا کی آخری سرحد پر چھوڑ کر آئے گا اور وہاں سے سانٹا مارٹا کے قصبے تک پہنچ جانا کوئی مشکل نہ ہوگا۔ زوریلو کی حکومت صرف سانٹا مارٹا کی سرحد سے تین میل ادھر تک تھی۔ اس سے آگے جانا انڈین کے لیے مصیبت کا باعث تھا۔ میں نے لالی اور زوریماں کے بارے میں اس سے سفارش کی کہ اگر ہو سکے تو ان لڑکیوں کی جان ضرور بچائی جائے۔ اگر یہ لڑکیاں نہ چاہتیں تو میں اب تک مر بھی چکا ہوتا۔ زوریلو نے قہقہہ لگا کر کہا کہ اگر میں پسند کروں تو وہ لالی اور زوریماں دونوں سے میری شادی کروا سکتا ہے۔ یہ بات ایسی تھی کہ میں اپنی ہنسی نہ روک سکا۔

ایک دوپہر کو زوریلو نے مجھے گھوڑے پر بٹھایا اور کولمبیا کی آخری سرحد کی جانب روانہ ہو گیا۔ ہمارے عقب میں ایک سو انڈین آدمیوں کی ایک فوج تھی جو حفاظت کے خیال سے ساتھ لے لی گئی تھی۔ دو دن اور دو راتوں کا مسلسل سفر تھا۔ تیسرے روز پو پھٹنے سے کچھ پیشتر انہوں نے عین گھنے جنگل میں اپنے گھوڑے روک لیے' معلوم ہوا سانٹا مارٹا یہاں سے پانچ گھنٹے کی مسافت پر ہے اور یہ فاصلہ مجھے پیدل طے کرنا ہوگا۔ قاعدے کے مطابق وہ مجھے گھوڑا لے جانے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔

''اس میں کئی مصیبتیں ہیں' موسیو پیپلن'' زوریلو نے میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: ''یہاں جس شخص کے پاس گھوڑا ہو اس کا یہ مطلب لیا جاتا ہے کہ وہ مال دار آدمی ہے۔ اس کے پاس اپنا مکان بھی یقیناً ہوگا۔ ایک دو غلام ہوں گے وغیرہ وغیرہ۔ یہ خبر اونچے آدمیوں تک پہنچ جائے گی کہ ایک اجنبی اس علاقے میں گھوڑے پر سوار دیکھا گیا ہے۔ پھر وہ تمہیں پکڑ لیں گے اور الٹے سیدھے سوال کر کے ناطقہ بند کر دیں گے..... سمجھے؟ میں تمہیں گھوڑا لے جانے کا مشورہ نہیں دے سکتا..... ہاں یہ تمہارے لیے پیش کرتا ہوں.....'' اس نے گھوڑے کی زین سے بندھی ہوئی ایک تھیلی میں ہاتھ ڈالا اور سونے کے دس بارہ سکے میرے حوالے کر دیئے۔ ''تمہیں ان کی ضرورت پڑے گی۔'' اس نے کہا' ''انہیں احتیاط سے رکھنا۔ کسی کو دکھانا مت۔ اچھا دوست..... الوداع..... اگر کسی سبب سے تمہیں میرے پاس آنا پڑے تو یہ راستہ یاد رکھنا جس راستے ہم آ رہے ہیں۔ سواری نہ ملے تو پیدل ہی چل دینا' کہیں نہ کہیں میرے آدمی تمہیں مل جائیں گے اور تم میرے پاس پہنچ جاؤ گے.....''

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

میری آنکھوں میں تشکر کے آنسو تھے۔ مجھے ایک نئی زندگی مل گئی تھی' میں نے زوریلو اور اس کے تمام آدمیوں سے فرداً فرداً ہاتھ ملایا۔ پھر وہ گھوڑے دوڑاتے ہوئے نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ دیر تک وہیں کھڑا ان کے گھوڑوں کی ٹاپیں سنتا رہا اور جب یہ آوازیں معدوم ہو گئیں تو ایک ان دیکھی' ان جانی منزل کی طرف میرے قدم اٹھنے لگے۔ ایک تھیلا میرے پاس تھا جس میں ابلے ہوئے گوشت کے ٹکڑے بھرے تھے اور پانی کی دو بوتلیں۔ پانچ گھنٹے کے سفر کے لیے یہ سامان بہت تھا۔

جنگل پہاڑی پر تھا اور بے حد گھنا۔ میں نے کولمبیا کے جنگلوں کے بارے میں بڑی داستانیں سنی تھیں اور اب خود ان داستانوں کا ایک حصہ بن گیا تھا۔ مجھے معلوم تھا ان جنگلوں میں خونخوار بھیڑیوں کی کثرت ہے' زوریلو نے اسی وجہ سے ایک اچھی بندوق اور سو کارتوسوں کی ایک پیٹی بھی میرے حوالے کر دی تھی۔ یہ انتہائی ایثار تھا جو کوئی بھی انڈین ایک اجنبی کے ساتھ کر سکتا تھا۔ انڈین تو بندوق کو جان سے زیادہ عزیز جانتے ہیں۔

سورج نکلنے ہی والا تھا لیکن جنگل میں ابھی تک گھپ اندھیرا تھا۔ میں اندھوں کی طرح اس پگڈنڈی پر چلا جا رہا تھا جو سانٹا مارٹا کی جانب جاتی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ یہ وہ وقت ہے جب رات بھر کے جاگے اور شکار کے لیے نکلے ہوئے بھیڑیے اپنے اپنے بھٹوں کی طرف لوٹتے ہیں۔ میں نے بندوق کندھے سے اتار کر ہاتھ میں لے لی اور اس کے میگزین میں کارتوس بھر لیے۔ بھیڑیوں کے علاوہ ایسے جنگلوں میں ایسے گوشت خور خونی بلے بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں جو درختوں کی شاخوں میں چھپے بیٹھے رہتے ہیں اور جونہی کوئی جان دار ان کی زد میں آتا ہے' ہولناک آوازوں میں غراتے ہوئے یہ اوپر سے چھلانگ لگاتے ہیں اور شکار کا ٹیٹوا پہلے ہی ہلے میں دبوچ لیتے ہیں۔ ان خونخوار جنگلی بلوں کو مقامی باشندے اونزا کہہ کر پکارتے ہیں۔

جس پگڈنڈی پر میں رواں دواں تھا' وہ ہزار بارہ سو فٹ اونچے ٹیلے کے گرد گھومتی ہوئی گزرتی تھی۔ موڑ اس کثرت سے تھے کہ میرا سر چکرانے لگا۔ ادھر سورج آسمان پر خاصا بلند ہو چکا تھا اور جنگل میں پھیلا ہوا اندھیرا آہستہ آہستہ چھٹنا شروع ہو گیا تھا' پگڈنڈی نمی کے باعث دھند میں ڈوبی ہوئی تھی اور دس پندرہ فٹ سے زیادہ فاصلے کی چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔ میرے اردگرد ایک ہیبت ناک سناٹا طاری تھا جسے کبھی کبھی درخت پر بیٹھا ہوا کوئی پرندہ اپنی

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

آواز سے توڑ دیتا۔ یکا یک پگڈنڈی ایک عمودی ڈھلوان میں بدل گئی اور اگر میں سنبھل نہ جاتا تو کوئی دو سو فٹ گہرے ایک ایسے کھڈ میں جا گرتا جو مجھے بالکل دکھائی نہ دیا۔ اس کھڈ کے کنارے کنارے اونچی گھنی گھاس اگی ہوئی تھی۔ اس گھاس میں سے ایک زبردست بھیڑیا چھلاوے کی طرح برآمد ہوا اور جبڑا کھول کر غرانے لگا۔ میرا اور اس کا درمیانی فاصلہ مشکل سے دس فٹ ہوگا۔ ابھی میں بندوق ہاتھ میں تول ہی رہا تھا کہ عقب سے دوسرے بھیڑیے نے عین میرے سر پر چھلانگ لگائی۔ میں نے اندھا دھند کئی فائر جھونک دیئے' فائر کے دھماکوں سے پہاڑی جنگل گونج اٹھا۔ بھیڑیے آناً فاناً ہوا ہوگئے۔ میں نے اپنے حواس درست کرنے کے لیے کچھ دیر وہیں قیام کیا' پھر آگے بڑھا' اُجالا اب خاصا ہوگیا تھا اور دھند برابر چھٹ رہی تھی۔ ہوا کے نرم جھونکوں نے مجھے تھپکیاں دینی شروع کیں۔ رات بھر گھوڑے کی پیٹھ پر سواری کر کے ہڈیاں کڑکڑا گئی تھیں' بے اختیار آنکھیں بند ہونے لگیں لیکن موقع ایسا نازک تھا کہ اگر میں سو جاتا تو پھر حشر کے دن ہی آنکھیں کھلتیں۔ معلوم ہوگیا تھا جنگل بھیڑیوں سے بھرا ہوا ہے اور یہ بھیڑیے اس قدر نڈر ہیں کہ راہ چلتے مسافروں کو بھی دھمکانے سے نہیں چوکتے' دائیں بائیں کبھی کبھی ایسی آوازیں بھی آتیں جن سے شبہ ہوتا کہ وہ چپکے چپکے میرا پیچھا کر رہے ہیں لہٰذا انہیں ڈرانے کے لیے مجھے اکا دکا ہوائی فائر کرنا پڑتا۔ مجھے حیرت تھی کہ سانٹا مارٹا نامی قصبہ یہاں سے قریب ہے اور اس کے باوجود جنگل میں آدمی ہے نہ آدم زاد۔ اسی حیص بیص میں کوئی ایک میل آگے نکل آیا۔ اب میں ہموار علاقے سے گزر رہا تھا' پگڈنڈی یہاں خاصی چوڑی ہوگئی تھی اور درخت بھی اتنے گھنے نہ تھے' پگڈنڈی پر پہیوں کے نشان بھی دکھائی دے رہے تھے۔ اچانک سامنے سے ایک شان دار بگھی آتی نظر آئی' اس میں سیاہ رنگ کے دو گھوڑے جتے ہوئے تھے' آگے کوچوان بیٹھا تھا۔ یہ ایسی ہی بگھی تھی جیسی کسی دور میں شرفائے فرانس اپنی سواری کے لیے استعمال کرتے تھے۔ میں ایک جانب ہٹ کر کھڑا رہا۔ تیز رفتار بگھی قریب سے گزر گئی' میں گردن موڑ کر دیکھنے لگا۔ آہستہ آہستہ اس کی رفتار کم ہوئی پھر رُک گئی۔ کوچوان نے چھلانگ لگائی اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے بلایا۔ میں بھاگا ہوا ادھر گیا۔

بگھی کے اندر دو حسین و جمیل عورتیں بیٹھی تھیں' میں نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں سلام کیا۔ ان کے اعلیٰ' قیمتی اور خوب صورت لباس سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہ تھا کہ وہ امیر

گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ بگھی کے اندر میں نے دو عمدہ رائفلیں بھی پڑی ہوئی پائیں۔

''کدھر جا رہے ہو نوجوان؟'' ایک عورت نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے انگریزی میں پوچھا۔

''سانٹا مارٹا کی طرف'' میں نے شکستہ انگریزی میں جواب دیا' وہ حیرت سے ایک دوسرے کی طرف تکنے لگیں۔ ان کے لبوں پر مسکراہٹ اب بھی پھیلی ہوئی تھی۔ دوسری عورت نے کہا:

''تم ہسپانوی ہو یا اطالوی؟''

''میں ایک بدنصیب فرانسیسی ہوں مادام'' میں نے اپنی آواز میں حد درجہ بے چارگی اور حسرت پیدا کر کے کہا۔

''آہ..... میں سمجھ گئی'' اس نے فوراً سنجیدہ ہو کر کہا' فرانسیسی؟ میرا خیال اگر غلط نہیں تو تم شیطانی جزائر سے بھاگے ہوئے کوئی قیدی ہو ورنہ اس جگہ فرانسیسیوں کا کیا کام۔ بولو میں ٹھیک کہتی ہوں یا غلط؟'' یہ جملہ اس عورت نے شستہ فرانسیسی میں ادا کیا تھا۔ میں نے ندامت سے گردن جھکا لی۔ اس نے پھر کہا'' میرا خیال درست ہی نکلا۔ بہرحال میں دیکھتی ہوں تم نے خاصی اذیتیں اٹھائی ہیں۔ ان اذیتوں کی علامتیں تمہارے چہرے پر بکھری ہوئی ہیں اور اب تم سانٹا مارٹا جا رہے ہو۔ تمہیں کس نے بتایا کہ یہ راہ سانٹا مارٹا کو جاتی ہے؟''

''یہ بے حد خطرناک ہے' اگر تم ادھر سے گئے تو کسی نہ کسی حادثے سے ضرور دوچار ہو جاؤ گے۔ پیدل چلنے والوں کے لیے ادھر سے جانا ٹھیک نہیں آؤ گاڑی میں بیٹھو ہم تمہیں سانٹا مارٹا کے قریب اتار دیں گے۔''

میں نے سلام کیا اور گاڑی میں لد گیا' کوچوان دوبارہ اپنی نشست پر چڑھا اور چابک کی تڑاپ سنائی دی۔ گھوڑے برق رفتاری سے دوڑنے لگے' اب میں نے غور سے ان عورتوں کا جائزہ لیا' ایک کی عمر پچیس برس کی اور دوسری کی تیس سال سے زائد نہ تھی۔ میں نے اندازہ کیا کہ وہ انگریز نہیں ہیں۔ ایک ان میں یقیناً ہسپانوی تھی اور دوسری شاید آئرش..... لیکن ان سے قومیت دریافت کرنا بے ادبی کی بات تھی۔ اس لیے میں خاموش بیٹھا رہا۔ چند لمحے بعد بڑی نے گفتگو کا آغاز کیا اور پوچھا کہ میرا نام کیا ہے اور مجھے کس جرم میں شیطانی جزائر بھیجا گیا تھا اور اس علاقے تک میری رسائی کیونکر ہوئی؟ میں نے مختصر طور

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

پر اپنی رام کہانی کہہ سنائی۔ وہ دونوں بے حد متاثر ہوئیں اور حیرت سے تکتی رہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اتنی مصیبتیں اور اتنے دکھ سہنے کی ہمت کسی آدمی میں مشکل ہی سے پائی جاتی ہے۔

"نوجوان، تم کوئی کام کاج بھی جانتے ہو؟" چھوٹی نے دریافت کیا۔

"جی ہاں، بجلی کا کام سیکھا تھا ایک زمانے میں" میں نے بتایا۔

"بہت خوب" اس نے خوش ہو کر کہا۔ "میرا ایک دوست تمہیں کام مہیا کر سکتا ہے۔ اس کا تعلق کسی ایسی کمپنی سے ہے جو بجلی کا سامان بناتی ہے۔ تمہیں وہاں کام کرنے پر کوئی اعتراض تو نہ ہوگا؟"

"اس کے باعث میں زندگی بھر آپ کا اور آپ کے اس دوست کا شکر گزار رہوں گا مادام" میں نے عاجزی سے دانت نکال دیئے۔

خدا جانے وہ کہاں جا رہی تھیں۔ انہوں نے میری خاطر اپنا سفر ملتوی کر کے کوچوان کو حکم دیا کہ گھر واپس چلو۔ وہ سانتا مارٹا ہی میں رہتی تھیں۔ آدھ گھنٹے بعد ہم قصبے میں پہنچ گئے۔ نہایت صاف ستھرا اور جدید طرز کا قصبہ کیا چھوٹا سا شہر تھا۔ بازاروں میں بڑی رونق تھی۔ دکانیں ہر طرح کی چیزوں سے خوب سجی ہوئی تھیں۔ ایک خوب صورت مکان کے آگے پہنچ کر بگھی رکی۔ سفید وردی پہنے ہوئے ایک خادم نے دروازہ کھولا، مکان آرام دہ اور نیا تھا۔ اس میں کئی کمرے تھے۔ سب سے پہلے مجھے ڈائننگ روم میں لے جایا گیا۔ خادم نے کھانے پینے کی چیزیں نفاست سے میز پر سجا دیں۔ میں نے ڈٹ کر بہت دن بعد اتنا مزے دار کھانا کھایا۔ اس کے بعد مجھے ایک کمرہ دکھایا گیا جس میں بستر لگا تھا۔ کپڑے رکھنے کی الماری اور میز بھی تھی، میں نے دل میں کہا واہ بیٹا پیپلن یہ تمہاری قسمت...... چلو کچھ دن اچھے کٹ جائیں گے۔

✣ ✣ ✶ ✣ ✣

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

پیپلن کی واپسی

مجھے اس مکان میں پناہ لیے صرف تین دن ہوئے تھے اور میں اپنی اس کامیابی پر مطمئن ہونے والا تھا کہ ایک دوپہر آئرش خاتون میرے کمرے میں آئی اور کہنے لگی:

"نوجوان! مجھے افسوس ہے کہ ہم تمہیں زیادہ دیر اپنے مکان پر قیام کی اجازت نہیں دے سکیں گے۔ آج کسی مقامی اخبار نے نہ صرف تمہاری تصویر چھاپ دی ہے، بلکہ یہ بھی بتا دیا ہے کہ تم کوراکاؤ جیل سے ایک بڑے مجرم انتونیو کے ساتھ فرار ہو چکے ہو۔ اس سے پہلے تم نے ڈنکی آئی لینڈ میں ڈاکٹر نیل کے ایک ملازم کو بھی قتل کر دیا تھا۔ یہ باتیں تم نے ہم سے چھپائیں۔ بہرحال ہم چاہیں، تو ابھی پولیس کو طلب کر کے تمہیں گرفتار کروا دیں، لیکن ہم ایسا نہیں چاہتے۔ ہماری تم سے کوئی دشمنی نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ تم خود کہیں اور چلے جاؤ۔"

یہ تقریر سن کر پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ نہ جانے کیوں میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں ضبط کے باوجود ان آنسوؤں کو نہ روک سکا۔ اتنے میں دوسری عورت بھی آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں مقامی اخبار کا وہی شمارہ تھا جس میں میری تصویر اور کارناموں کی داستان خوب مرچ مسالہ لگا کر شائع کی گئی تھی۔ دونوں خواتین عجیب سی نظروں سے میری جانب دیکھتی رہیں۔ خود ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میرے ساتھ اب کیا سلوک کریں۔ آخر میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا: "معزز خواتین! میں آپ کی مہربانیوں کا شکر گزار ہوں اور یقین کریں زندگی کے آخری سانسوں تک انہیں بھلا نہیں سکوں گا۔ بے شک اس اخبار میں جو کچھ لکھا ہے صحیح ہے۔ میں اپنے تمام جرائم کا ذمہ دار ہوں اور ان سے انکار نہیں کروں گا، لیکن اتنی التجا آپ سے کرتا ہوں کہ مجھے پولیس کے حوالے نہ کریں۔ میں بہت جلد واپس اپنے ریڈ انڈین دوست زوریلو کے پاس چلا جاؤں گا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مہذب انسانوں کی بستیوں میں میرے لیے کوئی پناہ نہیں۔ جنگلوں میں رہنے والے وحشی ہی مجھے پناہ

PVL PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

دے سکیں گے۔ میں پھر بتانا چاہتا ہوں۔ میں مجرم نہیں تھا' آپ کے اس مہذب معاشرے نے مجھے زبردستی مجرم اور قاتل بنادیا اور اب میں ایک ایسا کھلونا ہوں جس کی عزت و آبرو سے کھیلنے کا حق ہر فرد کو حاصل ہے۔''

خدا جانے اس وقت جوش اور جذبے کے عالم میں کیا کچھ میری زبان سے نکلا۔ تاہم اتنا یاد ہے کہ ان نیک دل خواتین نے اس تقریر کا اچھا اثر لیا۔ وہ کچھ دیر تک میرے پاس بیٹھی تسلیاں دیتی رہیں اور کہا کہ انہیں میری مجبوریوں کا احساس ہے اور وہ مجھے مجرم نہیں' ایک اچھا انسان سمجھتی ہیں' لیکن ان کا تعلق چونکہ مقامی کانونٹ سے ہے جہاں وہ بچوں کو تعلیم دینے پر مقرر ہیں' اس لیے ان کی زندگی کے معمولات پر اس کا بہت برا اثر پڑ سکتا ہے اگر ان کے مکان میں سے پولیس کسی مجرم کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ وہ کانونٹ کی نگران اعلیٰ مدر سے میرا ذکر کریں۔ اگر مدر مجھے کانونٹ کے کسی گوشے میں پناہ دینے پر آمادہ ہو جائے' تو پھر پولیس وہاں داخل ہونے کی جرات نہ کر سکے گی۔

امید کی ایک نئی کرن میرے سامنے جگمگانے لگی۔ میں نے ان خواتین کے پاؤں پکڑ لیے اور جس قدر عاجزی کا اظہار کر سکتا تھا' کیا کہ وہ مدر سے میرا آج ہی' بلکہ ابھی ذکر کریں۔ میں سب کچھ اسے بتا کر پناہ کی درخواست کرنے کو تیار ہوں۔ انہوں نے اسی وقت مجھے ساتھ چلنے کا حکم دیا۔ گھوڑا گاڑی آئی اور میں ان خواتین کی معیت میں کانونٹ کی طرف روانہ ہوا جو وہاں سے پانچ چھ میل دور تھا۔ یہ ایک بہت بڑی عمارت تھی جس کے دونوں طرف خوش نما باغ لگایا گیا تھا۔ ان خواتین نے مجھے ہدایت کی کہ مدر جو کچھ پوچھے' اس کا جواب صحیح صحیح دینا۔ اسی میں تمہاری سلامتی ہے۔ ممکن ہے وہ تمہیں ملازم یا مزدور کی حیثیت سے کانونٹ میں رکھنے کو تیار ہو جائے۔ پھر تمہیں پولیس کا کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔

عمارت کے صدر دروازے پر دربان کھڑا تھا۔ اس نے ٹوپی اتار کر میری ہمراہی خواتین کو ادب سے سلام کیا' پھر سوالیہ نظروں سے میری جانب گھورنے لگا۔ میں نے نگاہیں چرا لیں اور اسے اتنا موقع نہ دیا کہ میری شکل صورت اچھی طرح ذہن نشین کرتا۔ اگلے ہی لمحے میں عاجز و مسکین بنا گردن جھکائے ایک وفادار کتے کی مانند ان خواتین کے پیچھے اس پگڈنڈی پر چلا جو مدر کے آفس کی طرف جاتی تھی۔ جوں جوں میں آگے بڑھ رہا تھا' دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں۔ نہ جانے یہ مدر کس قسم کی ہوگی' مجھ سے کیا پوچھے اور کیا سمجھے' پناہ دے نہ دے۔ میں

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

نے بہر حال طے کر لیا کہ جہاں تک ممکن ہوگا سچ بولوں گا اور انکسار و عاجزی کی انتہا کر دوں گا۔ اس کے بعد جو خدا کو منظور ہو۔

معلوم ہوا کہ کانونٹ کی مدر اس وقت موجود نہیں ..... شام کو تشریف لائیں گی تو ملاقات ہوگی۔ میری ہمراہی خواتین کے رسوخ سے اتنا ہوا کہ تیسری منزل پر ایک کمرہ مجھے دے دیا گیا تا کہ آرام کر لوں۔ اس کمرے میں آرام دہ بستر بھی تھا اور ہاتھ منہ دھونے کا انتظام بھی۔ میں سب کچھ ذہن سے کھرچ کر بستر پر جا لیٹا اور آنکھیں بند کر لیں۔ دیر تک سویا رہا۔ خواب میں لالی اور زوریماں کو دیکھا کہ رو رہی ہیں۔ آنکھ کھل گئی۔ شام سر پر آ گئی تھی۔ گوجیرہ قبائل میں گزرے ہوئے دن شدت سے یاد آنے لگے۔ پھر زوریلو کی مہمان نوازی نے ستایا۔ رخصت ہوتے وقت اس نے کس محبت سے مجھے سونے کے سکے دیے تھے اور کہا تھا کہ اگر جی چاہے' تو میں واپس آ جاؤں اور اس کے ساتھ رہوں۔ لامحالہ مجھے وہیں جانا ہوگا اگر یہاں پناہ نہ ملی۔

کانونٹ کے ایک ملازم نے کمرے میں آن کر پوچھا کہ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ..... میں نے اسے بتایا کہ شیو کرنا اور نہانا چاہتا ہوں اور کھانے کو کچھ مل سکے' تو قیمت ادا کرنے کی اہلیت بھی رکھتا ہوں۔ تھوڑی دیر میں اس بھلے مانس نے سب چیزیں لا دیں اور مسکراتا ہوا چلا گیا۔ میں نے پہلے تو ناشتہ کیا' پھر شیو بنائی' اس کے بعد ملحقہ غسل خانے میں جا کر خوب نہایا۔ کیا خبر یہ تیری زندگی کا آخری غسل ہو۔ نہا کر کپڑے پہن رہا تھا کہ دروازے پر کسی نے آہستہ سے دستک دی۔ یہ آئرش خاتون تھی۔ اس نے بتایا کہ مدر آ گئی ہیں اور مجھے اپنے آفس میں طلب کر رہی ہیں۔ ایک بار پھر مجھے سمجھایا گیا کہ خبردار جھوٹ نہ بولوں۔ مدر کا آفس سیدھا سادا تھا۔ ایک لمبی چوڑی میز کے پیچھے پچاس پچپن برس کی باوقار عورت ننوں کا سفید لباس پہنے بیٹھی تھی۔ اس کے بال آدھے سفید آدھے سیاہ تھے۔ آنکھیں گہری سیاہ جن پر سنہرے فریم کا قیمتی چشمہ چڑھا تھا۔ ٹھوڑی سخت اور ہونٹ پتلے جو اس کی طبیعت کے استقلال اور سخت مزاجی کا پتہ دیتے تھے۔ میری خواتین ادب و احترام سے کھڑی تھیں۔ مدر نے چشمہ اتار کر اوپر سے نیچے تک میرا جائزہ لیا جیسے نظروں ہی نظروں میں مجھے تول رہی ہو۔ مجھے اس سے آنکھ ملانے کی جرات نہ ہوئی۔ شاید ایسی حرکت بے ادبی اور گستاخی میں شمار ہوتی۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

''نوجوان' تم اسپینش زبان جانتے ہو؟'' مدر نے اچانک سوال کیا۔ اس کی آواز میں بھی دبدبہ اور وقار تھا۔

''بہت معمولی جانتا ہوں۔'' میں نے دھیمے لہجے میں مؤدب بن کر جواب دیا۔

''بہت خوب۔ یہ خواتین ترجمانی کے فرائض سرانجام دیں گی۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ تم فرانسیسی ہو؟''

''جی ہاں''

''کیا تم کوراکاؤ کی جیل سے فرار ہوئے تھے؟''

''بالکل سچ ہے مدر۔ میں ہی وہ بدنصیب ہوں۔'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''یہ کب کا ذکر ہے؟''

''کوئی ڈھائی ماہ ہوئے ہوں گے۔ ویسے مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کتنا عرصہ ہوا۔''

''اس درمیانی مدت میں تم کہاں رہے؟''

''ریڈ انڈین قبیلے گوجیرہ میں۔ اس کے بعد زوریلو قبیلے کا سردار.....''

''کیا کہا؟ تم انڈین لوگوں کے ساتھ رہے؟'' مدر نے میری بات کاٹ دی۔ ''یہ ناممکن ہے..... بالکل غلط ہے۔ میں جانتی ہوں کہ کوئی بھی شخص وہاں کے وحشی لوگوں کے درمیان اتنا عرصہ نہیں رہ سکتا۔ آج تک ہم نے اپنے کئی آدمی وہاں مذہب کی تبلیغ کے لیے بھیجے' ان میں سے ایک بھی زندہ بچ کر نہیں آیا۔ میں تمہاری یہ بات تسلیم کرنے سے انکار کرتی ہوں۔ سچ سچ بتاؤ اتنا عرصہ تم کہاں رہے؟''

اب بتایئے اس کا میرے پاس بھلا کیا علاج تھا..... میں بالکل سچ سچ بتا رہا ہوں اور وہ نہیں مانتی۔

''مدر! میں خدا کو حاضر ناظر جان کر عرض کرتا ہوں کہ کوراکاؤ جیل سے فرار کے بعد میں گوجیرہ قبیلے میں رہا۔ ایک بڑے مجرم انتونیو کے آدمیوں نے مجھے اس قبیلے کے سردار زاٹو کے ہاتھ غلام بنا کر بیچ ڈالا تھا۔ اس نے مجھے اس لیے خریدا کہ میں سمندر میں غوطہ لگا کر موتی نکالا کروں۔''

اس کے بعد میں نے وہ ساری داستان اسے سنائی کہ کس طرح ایک شب دشمن قبیلے زوریلو نے وہاں حملہ کیا' پھر مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ کچھ عرصے میں زوریلو کا مہمان رہا

اور وہ خود مجھے سانٹا مارٹا کی سرحد تک رخصت کرنے آیا۔ مدر حیرت سے منہ کھولے یہ ساری داستان سنتی رہی۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آتا' ایک جاتا۔ کبھی عینک آنکھوں پر لگا لیتی' کبھی اتار دیتی' جب چپ ہوا' تو بولی:

''اس میں کوئی شک نہیں کہ تم بہترین داستان گو ہو۔ اس خوبی سے تم نے حالات بیان کیے ہیں کہ ہر شخص یقین کرے گا' لیکن میں دریافت کرتی ہوں کہ اپنی اس داستان کی سچائی کا کوئی ثبوت بھی ہے تمہارے پاس؟''

''جی ہاں ثبوت بھی اتفاق سے موجود ہے۔'' میں نے جلدی سے کہا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ تھیلی نکالی جس میں زوریلو نے سونے کے سکے اور موتیوں کی ایک بڑی تعداد بھر کر میرے سپرد کی تھی۔ میں نے یہ تھیلی مدر کی میز پر رکھ دی اور کہا:

''اسے کھول کر دیکھ لیجئے۔ اس میں وہ موتی ہیں جو قبائلی سردار زوریلو نے مجھے عطا کیے تھے۔ کچھ موتی پہلے سے میرے پاس تھے اور یہ وہ حصہ ہے جو گوجیرہ قبیلے کے لیے سمندر سے موتی نکالنے کے بعد مجھے ملا تھا۔ سونے کے سکے اس کے علاوہ ہیں۔''

مدر نے تھیلی کھول کر میز پر الٹ دی۔ ایک چھنا کے سے سکے اور موتی میز پر بکھر گئے۔ حیرت سے تینوں خواتین کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ دیر تک ٹکٹکی باندھے ان موتیوں اور سونے کے سکوں کو تکتی رہیں۔ آخر مدر نے کچھ تذبذب آمیز لہجے میں کہا:

''یہ بھی تو ممکن ہے کہ تم نے یہ موتی اور سکے کہیں سے چرائے ہوں۔''

''جی نہیں۔ میں نے یہ کہیں سے نہیں چرائے۔ آپ کہیں' تو میں کتاب مقدس پر حلف لے سکتا ہوں۔''

اتنا کہتے ہی میری آنکھوں سے آنسو بہہ کر رخساروں پر آ گئے۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اور رونے لگا۔

''میں آپ سے اور کچھ طلب نہیں کروں گا مدر۔'' میں نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ''مصیبت اور مشقت کا پہاڑ کھودتے کھودتے میرے بازو شل ہو گئے ہیں اور میں بری طرح تھک چکا ہوں۔ میری درخواست ہے کہ چند روز اپنے پاس رہنے دیں۔ میں کسی کو تنگ نہ کروں گا نہ میرا کوئی مطالبہ ہے۔ جو کام محنت مزدوری کا مجھ سے لینا پسند کریں' اس کے لیے ہر وقت حاضر ہوں۔ ضمانت کے طور پر یہ موتی اور سونے کے سکے آپ کے سپرد کرتا ہوں۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

مجھے آپ پر پورا اعتماد ہے۔ جب میں یہاں سے رخصت ہونے لگوں' تو میری امانت واپس فرما دیجئے گا۔''

میری تقریر سے زیادہ آنسوؤں نے مدر پر گہرا اثر ڈالا۔ اس نے مجھے کمرے سے باہر جانے کا اشارہ کیا۔ میں باہر نکل آیا۔ شاید وہ آئرش اور اسپینش عورتوں سے میرے بارے میں کچھ مشورہ کرنا چاہتی ہوگی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ وہاں سناٹا تھا۔ آدمی نہ آدم زاد۔ ایک لمحے کے لیے خیال آیا اپنے آپ کو ان عورتوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دینا عقل سے بعید ہے۔ کیوں نہ اسی وقت یہاں نکل چلوں۔ ویسے بھی سورج غروب ہونے والا ہے۔ سیدھا جنگل کی طرف چل دوں گا۔ رات کسی درخت یا پہاڑی کھوہ میں کاٹ دوں گا۔ اس کے بعد زوریلو قبیلے تک پہنچ جانا کچھ مشکل نہ ہوگا۔ ممکن ہے جنگل میں اس قبیلے کا کوئی نہ کوئی آدمی مل جائے' اس کے ساتھ ہی گھوڑے پر سوار ہولوں گا۔ اسی سوچ میں گم تھا۔ دل کا فیصلہ کچھ تھا' دماغ کا کچھ۔ دونوں میں ہم آہنگی نہیں ہو پاتی تھی۔ اتنے میں دونوں خواتین کمرے سے باہر آئیں اور مجھے اندر لے گئیں۔ مدر نے میری جانب غور سے دیکھتے ہوئے فیصلہ کن آواز میں کہا:

''موسیو پیپلن! اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ مصیبت زدہ ہیں' لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی طے ہے کہ آپ ایسے اخلاقی جرائم کے مرتکب بھی ہو چکے ہیں جن کی زیادہ سے زیادہ سزا موت ہے۔ ہر چند یہ مشنری ادارہ ہے اور اس کا تعلق مذہب سے ہے اور اگر ہم آپ جیسے مجرموں کو گورنمنٹ کی لاعلمی میں پناہ دیں' تو خود جرم کا ارتکاب کریں گے' اس لیے ہمارے نزدیک یہ بہت کٹھن مسئلہ ہے۔ آپ ایک دو دن یہاں رہ سکتے ہیں' پھر جہاں سینگ سمائیں' چلے جایئے۔ ہم اتنی رعایت کر سکتے ہیں کہ پولیس کو اطلاع نہ دیں۔ آپ یہ تھیلی اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔''

میں نے اس کرم کے لیے مدر کا شکریہ ادا کیا اور تیسری منزل کے اسی کمرے میں آ گیا۔ ان حالات میں یہاں زبردستی رہنا کسی طرح بھی ٹھیک نہ تھا۔ کیسی عجیب بات ہے کہ خدا کی اس وسیع وعریض سرزمین میں ایک آدمی کے لیے کوئی جائے پناہ نہ تھی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ رات کی تاریکی چھاتے ہی یہاں سے نکل چلوں گا۔ ایسا نہ ہو کہ میری وجہ سے ان بے چاری عورتوں پر کوئی آفت نازل ہو۔ رات کا کھانا مجھے کمرے میں مل گیا۔ ابلے ہوئے آلو'

گوشت کی دو تین بوٹیاں' ایک پوری روٹی اور دودھ کا بھرا ہوا گلاس۔ میں نے کھانے سے فارغ ہو کر کھڑکی سے جھانکا۔ یہ اندازہ کرنا ضروری تھا کہ کس رخ سے فرار اختیار کرنا درست ہوگا۔ صدر دروازے کی طرف سے جانا ٹھیک نہ تھا۔ وہاں چوبیس گھنٹے ایک شخص دربانی کے فرائض سرانجام دیتا ہے۔ باغ کی چار دیواری کوئی آٹھ فٹ اونچی تھی۔ بہرحال یہ دیوار کہیں سے بھی باآسانی پھاندی جا سکتی تھی۔ طبیعت میں عجب طرح کی بے چینی اور اضطراب سا نمودار ہو رہا تھا اور چھٹی حس بار بار کسی خطرے کی نشاندہی کر رہی تھی۔ جی میں آیا کہ ابھی یہاں سے نکل جاؤں۔ اول وآخر جب جانا ہی ٹھہرا' تو تاخیر کیسی؟ یہ سوچ کر دروازے کی طرف بڑھا اور اسے کھولنا چاہا تو پتہ چلا کہ باہر سے بند ہے۔ آنِ واحد میں ہزار ہا نوع کے وسوسے اور اوہام سر پر سے گزر گئے۔ دماغ پگھلنے لگا اور اعصاب کا تناؤ یک دم حد سے زیادہ بڑھ گیا۔ گویا ان بھولی بھالی سیدھی سادی خواتین نے جنگل کے شیر کو پنجرے میں بند کر دیا تھا۔ طیش کے مارے میری حالت اتنی ابتر ہوگئی کہ اگر اس وقت کوئی سامنے آ جاتا' تو میں اسے قتل کرنے سے بھی دریغ نہ کرتا۔ میں نے زور زور سے دو تین لاتیں دروازے پر ماریں' پھر گھونسے بجائے اور حلق پھاڑ پھاڑ کر اپنے نادیدہ دشمنوں کو گالیاں دیں' مگر بے کار۔ کوئی نمودار نہ ہوا۔ کسی کو مجھ سے دلچسپی نہ تھی۔ میں نے کھڑکی کھولی۔ اگر یہاں سے چھلانگ لگاؤں' تو بیک وقت کتنی ہڈیاں چٹخیں گی؟ یہ اندازہ کرنے میں دیر لگی کہ سب سے پہلے کھوپڑی پاش پاش ہوگی' اس کے بعد بدن کی دوسری ہڈیوں کی باری آئے گی۔ میرا کمرہ تیسری منزل پر تھا اور زمین سے اس کی اونچائی پچیس فٹ سے کم نہ تھی۔

نڈھال ہو کر دوبارہ بستر پر جا گرا۔ اب ہر لمحہ مجھے پولیس کا انتظار تھا۔ رات بھیگتی رہی۔ باغ میں سے جھینگروں کا شور مسلسل سنائی دینے لگا۔ دور کہیں' کسی ویرانے میں الوگلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔ ہو ہو ہو ہو۔ پھر چند کتوں کے بھونکنے کی آوازیں۔ میں ایک بار پھر خوابوں کی دنیا میں پہنچ گیا۔ لالی اور زوریماں کی شکلیں۔ سمندر' کشتی' موتی..... آناً فاناً منظر بدل گیا۔ وحشی قبیلوں کی لڑائی..... لاشیں ہی لاشیں..... آگ..... خون..... وحشیانہ نعرے..... گھوڑے دوڑ رہے ہیں..... ایک وحشی نیزہ تان کر گھوڑا دوڑاتا میری طرف آتا ہے..... اف خدایا..... یہ تو انتونیو ہے۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

دروازے پر دستک ہوتی ہے ..... میں آنکھیں کھول دیتا ہوں۔ چھت سے لٹکا ہوا ہلکی پاور کا بلب روشن ہے۔ اب درواہ دھڑ دھڑ پیٹا جا رہا تھا۔ کوئی میرے کان میں کہتا: اٹھو بیٹا' مصیبت کی گھڑی شروع ہوگئی۔ اٹھ کر دروازہ کھولتا ہوں۔ ایک دم تین چار باوردی پولیس مین کمرے میں گھس آتے ہیں۔ ان کی وردیاں سفید اور چہرے سیاہ فام۔ ان سب کے ہاتھوں میں رائفلیں ..... عقب میں ایک لمبا تڑنگا آدمی دائیں ہاتھ میں ریوالور سنبھالے ہوئے ..... اس کی نالی میری کھوپڑی کی طرف اٹھی ہوئی ہے۔ اس کی وردی سے یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں کہ وہ پولیس کا بڑا افسر ہے۔ ایک سپاہی آگے بڑھ کر میرے ہاتھ میں ہتھکڑی ڈال دیتا ہے۔ یہ سارا مرحلہ ایک یا دو منٹ میں طے ہوگیا۔ میں اطمینان کا سانس لیتا ہوں۔ جب میں ہتھکڑی پہن لیتا ہوں' تو پولیس افسر تحکمانہ لہجے میں حکم دیتا ہے:

''خبردار' جنبش نہ کرنا: ورنہ میں فائر کر دوں گا۔''

''فکر نہ کیجئے جناب' میں ساکت و ساکن ہوں۔''

پوری عمارت میں بھونچال کی سی کیفیت ہے۔ کانونٹ میں آدھی رات کے وقت مسلح پولیس کا نمودار ہونا کوئی معمولی بات نہیں ..... ہر طرف پادری' ننیں' طلبہ و طالبات' ملازم اور نہ جانے کون کون بستروں سے اٹھ کر تیسری منزل کی جانب چلا آ رہا ہے۔ آئرش اور اسپینش خواتین بھی کمرے میں آ گئی ہیں اور میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں دیکھ کر رونے لگی ہیں۔ ایک عورت دیکھتے دیکھتے بے ہوش ہو کر دھڑام سے گر جاتی ہے۔

''اسے لے چلو۔'' پولیس افسر نے ماتحتوں کو حکم دیا۔ وہ مجھے دھکیلتے ہوئے کمرے سے باہر لے چلے۔ سیڑھیاں اتر کر نچلی منزل میں آئے۔ مجمع کائی کی طرح پھٹ گیا۔ پادریوں اور ننوں نے مجھے دیکھ کر طرح طرح کے نشان سینوں پر بنانا شروع کیے جیسے میں انسان نہیں' کوئی بھوت پریت تھا۔ میری نگاہیں مدر کو ڈھونڈ رہی ہیں' مگر وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دی۔ میں سوچ رہا ہوں کیا پولیس کو اسی نے بلایا ہے؟ خیر جو قسمت میں لکھا ہے' پورا ہوگا۔ کسی کا اس میں کیا دوش ہے۔ یہ طے ہے کہ موقع ملا' تو ایک بار مدر سے پوچھوں گا ضرور کہ اس نے اپنے وعدے کی خلاف ورزی کیوں کی۔ دروازے کے قریب ایک بڑی پولیس وین کھڑی تھی۔ انہوں نے مجھے اس میں سوار کرایا اور گاڑی فل اسپیڈ پر ایک جانب روانہ ہوئی۔ بازار ویران اور سڑکیں سنسان ..... اکا دکا ریستوان اور کیفے کھلے نظر آئے۔ کہیں سے گانے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

بجانے کی آوازیں بھی کان میں پڑیں۔ شہر سو رہا تھا' شہر جاگ رہا تھا۔ وین کا ڈرائیور سیاہ فام تھا اور سفید وردی میں اس کے چہرے کی سیاہی نکھر آئی تھی۔ پولیس والوں نے تمام سفر کے دوران میں مجھ سے کوئی بات نہ کی نہ انہوں نے میرے کپڑوں کی تلاشی لینے کی زحمت گوارا کی' لیکن میں خوب جانتا تھا کہ جس جگہ بھی مجھے لے جایا جا رہا ہے' ساری کسر وہاں نکل جائے گی۔ پوچھ گچھ بھی ہوگی' اچھی طرح تلاشی بھی لی جائے گی' گالی گلوچ اور مار کٹائی سے واسطہ بھی پڑے گا۔ ایک ڈھیٹ عادی چور اچکے کی مانند میں ان تمام باتوں کو یاد کر کے دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ چلو چند روز تفریح رہے گی۔ ظاہر ہے ہم جیسے افراد کے لیے روزمرہ کی ایسی باتیں تفریح ہی میں گنی جاتی ہیں۔

سانٹا مارٹا کی چھوٹی سی جیل قصبے کے بالکل مغرب میں عین آخری کنارے پر واقع تھی۔ گاڑی جیل کے بڑے پھاٹک میں داخل ہو کر کھلے صحن میں رکی۔ سپاہیوں نے مجھے نیچے اتارا اور سامنے ہی ایک کمرے میں لے گئے۔ یہاں پر لیمپ روشن تھا۔ ایک بوسیدہ سی میز اور چار پانچ کرسیاں پڑی تھیں۔ دیوار پر چھوٹے بڑے چارٹ لٹکے تھے۔ ایک پر شہر کا نقشہ تھا اور بقیہ پر غالباً پولیس اسٹیشن کی کارگزاری درج تھی۔ میز کے پیچھے ایک موٹا تازہ سیاہ فام ٹہل رہا تھا۔ پولیس والوں نے ایڑیاں بجا کر اسے سلیوٹ کیا۔ اس نے نگاہیں اٹھا کر مجھے دیکھا' پھر اسپینش زبان میں میرے نگران پولیس افسر سے پوچھا:

''اس شخص نے گرفتاری کے وقت غل غپاڑہ تو نہیں مچایا؟ میں دیکھتا ہوں کتنا تجربہ کار آدمی ہے۔ ضرور اس نے دنگا فساد کرنے کی کوشش کی ہوگی۔''

''نہیں جناب والا' اس کے برعکس یہ خاموشی اور شرافت سے پکڑا گیا ہے۔ اس نے معمولی سی مزاحمت بھی نہیں کی۔ خود ہمارا خیال تھا کہ یہ آسانی سے قابو میں نہ آئے گا' مگر یہ تو بکری کا بچہ نکلا۔ اب بھی تمام راستے مسکراتا آیا ہے۔''

''اچھا! اچھا!!'' بڑے افسر کے لہجے میں حیرت تھی۔ اس نے پھر مجھے گھور کر دیکھا۔ میں نے آگے بڑھ کر' اجازت لیے بغیر ایک کرسی گھسیٹی' سر سے ہیٹ اتارا اور آرام سے مسکرانے لگا۔ ایک لمحے کے لیے میری اس بدتمیزی پر افسر اعلیٰ کے ماتھے پر پریشانی کی سلوٹیں سی پڑیں' لیکن کچھ سوچ کر وہ ہنسا اور اپنا کالا بھدا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ میں نے بھی گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔

''اسپینش زبان بول سکتے ہو؟'' اس کی آواز گونج دار تھی۔ میں نے نفی میں گردن ہلائی۔ اس نے گھنٹی پر ہاتھ مارا۔ فوراً ایک سپاہی کمرے میں آیا اور ایڑیاں بجا کر اٹن شن کھڑا ہو گیا۔

''موچی کو بلاؤ۔'' افسر اعلیٰ نے حکم دیا۔ میں حیران رہ گیا کہ اس موقع پر بھلا اس کا کیا کام! ممکن ہے یہاں مجرم کو نئے جوتے بنوا کر دینے کا دستور ہو۔ ابھی میں اسی سوچ میں تھا کہ ایک پست قامت آدمی' مزدوروں کی سی نیلی وردی پہنے اور ہاتھ میں ہتھوڑا تھامے کمرے میں آیا۔ موچی ترجمان کے فرائض انجام دے گا۔ وہ تھوڑی بہت فرانسیسی جانتا تھا۔ اب میرے اور پولیس افسر کے درمیان جو گفتگو ہوئی' وہ سننے سے تعلق رکھتی ہے۔

''کیا تم وہی فرانسیسی مجرم ہو جو کوراکاؤ کی جیل سے بھاگے تھے؟''

''جناب میں خود نہیں بھاگا' بلکہ بھگایا گیا تھا؟''

''اچھا؟ یہ تو عجیب بات ہے۔ بھلا تمہیں کس نے بھگایا وہاں سے؟''

''انتونیو نے جناب''

انتونیو کا نام لینا تھا کہ پولیس چیف اپنی کرسی سے یوں اچھلا جیسے بچھو نے ڈنک مارا یا بجلی کا کرنٹ لگا ہو۔ اس نے میری طرف گھورتے ہوئے کہا: ''کیا کہتے ہو؟ تمہیں انتونیو نے وہاں سے بھگایا۔ تفصیل سے ساری کہانی سناؤ۔''

ایک بار پھر پرانا ریکارڈ بجایا گیا۔ جب میں سارا قصہ گوش گزار کر چکا اور بتایا کہ ڈھائی ماہ انڈین قبائل میں کاٹے ہیں' تو وہ اچھل پڑا اور چلایا:

''جھوٹ..... جھوٹ بولتے ہو..... میں کبھی یقین نہیں کر سکتا.....''

''مت یقین کیجئے۔'' میں نے اکتا کر کہا۔ ''میرے پاس آپ کو یقین دلانے کا کوئی ذریعہ نہیں' حالانکہ حقیقت یہی ہے۔''

''اس کی ہتھکڑیاں کھولو.....'' فوراً اس نے سپاہیوں کو حکم دیا۔ آناً فاناً میری کلائیاں بھاری آہنی ہتھکڑیوں کے بوجھ سے ہلکی ہو گئیں۔ ''جلدی سے اس کی جیکٹ اور قمیض اتارو۔'' سپاہیوں نے اسی لمحے دوسرے حکم کی بھی تعمیل کر دی۔ وہ اٹھا اور میرے برہنہ سینے اور پشت کا اچھی جائزہ لینے کے بعد دوبارہ کرسی پر جا بیٹھا' پھر اپنے سامنے پڑا ہوا ایک کاغذ تکنے لگا۔ غالباً اس میں میرا حلیہ لکھا ہو گا۔ اس نے مجھے بایاں ہاتھ دکھانے کا حکم دیا۔ میں نے ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیا۔ میرا بایاں انگوٹھا کٹا دیکھ کر سکون کا سانس لیا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

''خدا کا شکر ہے کہ تم وہی ہو' ورنہ مجھے دھوکا ہونے لگا تھا کہ میرے آدمی کسی اور کو پکڑ لائے ہیں۔''

''جناب' اس میں خدا کا شکر کرنے کی کون سی بات تھی؟ میں عرض تو کر رہا ہوں آپ نے صحیح آدمی گرفتار کیا ہے۔''

اس نے اپنے ماتحتوں کی طرف دیکھا اور پوچھا: ''اس شخص کی تلاشی لی جا چکی ہے؟'' میں نے دل میں کہا: مارے گئے اب وہ تھیلی میرے قبضے سے نکل کر ان کے پاس چلی جائے گی' لیکن سپاہیوں اور ان کے افسر نے فوراً مستعدی سے جواب دیا:

''تلاشی لی جا چکی ہے۔ اس کے قبضے سے کوئی قابل اعتراض چیز برآمد نہیں ہوئی۔''

اب میں سمجھا کہ سپاہیوں نے تلاشی کا جھوٹ موٹ اقرار کیوں کیا۔ انہیں یہ کام گرفتاری کا فرض انجام دیتے ہی کرنا چاہیے تھا۔ اگر وہ کہتے کہ تلاشی نہیں لی گئی' تو پولیس چیف نااہلی کے جرم میں سزا بھی دے سکتا تھا' لہٰذا سزا سے بچنے کا یہی ایک بہترین طریقہ تھا کہ تلاشی کا اقرار کر لیا جائے۔

''اب میرا کیا حشر ہو گا؟ جناب والا۔ اگر مناسب ہو' تو مجھے بتایا جائے۔''

وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا' پھر ہنس کر بولا: ''ہمارا کام صرف تمہیں گرفتار کر کے لانا تھا۔ فیصلہ کرنا بیرن کولا والوں کا کام ہے۔ ہم جلد از جلد تمہیں وہاں روانہ کریں گے۔ فی الحال ہم تمہیں ایسی جگہ بھیج رہے ہیں جہاں تمہارے ہی وطن کے ایک دو آدمی موجود ہیں۔ میرا خیال ہے تم ان کے درمیان مزے میں رہو گے۔''

''کیا وہ فرانسیسی ہیں؟'' میں نے اپنی خوشی چھپاتے ہوئے پوچھا۔

''ظاہر تو وہ یہی کرتے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''سمجھ میں نہیں آتا یہ فرانسیسی اتنے جرائم پیشہ کیوں ہوتے ہیں؟ جس کو دیکھو قاتل' چور' ڈاکو' اسمگلر اور نہ جانے کیا کیا دھندا کرتا ہے۔ جن فرانسیسیوں کے پاس تمہیں بھیجا جا رہا ہے' ان میں ایک لونڈا کوئی سترہ اٹھارہ برس کا ہو گا اور اس کے بارے میں مجھے بتایا گیا ہے کہ اس نے کئی قتل کیے ہیں۔''

چند لمحے بعد مجھے جیل خانے کے شمالی حصے میں لے جایا گیا۔ بیرکوں میں قیدی خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے۔ مسلح گارڈ اپنی اپنی ڈیوٹی پر حاضر دکھائی دیے۔ سب نے غور سے مجھے دیکھا۔ ایک لمبی بیرک کے قریب پہنچ کر میرے ساتھی سپاہیوں نے بیرک کے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

نگہبان سے سرگوشیوں میں کچھ کہا۔ اس نے قفل کھولا اور مجھے اندر دھکیل کر دروازہ بند کر دیا۔ ایک دو منٹ تک میں دروازے میں کھڑا رہا۔ فرش پر صرف دو آدمی لیٹے خراٹے لے رہے تھے۔ کونے میں ایک اسٹول پر تیل سے جلنے والی لالٹین دھری تھی۔ میں نے قریب جا کر ان دونوں پر نظر ڈالی' پھر ایک کی پسلیوں میں ہلکی سی ٹھوکر لگائی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا اور دیکھے بھالے بغیر ماں بہن کی گالیوں کا پشتارہ کھول دیا۔ دوسرا بھی کروٹ بدل کر بیدار ہو گیا۔ میری آنکھوں میں آنسو تھے۔ شاید رونا ہی میرے حق میں بہتر ثابت ہو رہا تھا۔ ماترو نے مجھے پہچانا اور اچھل کر چمٹ گیا۔ وہ بچوں کی طرح میرے گلے سے لپٹا ہچکیاں لے رہا تھا۔ جان کلاز کا بھی یہی حال تھا۔

''کیسے ہو یارو؟'' میں نے آہستہ سے کہا'' مجھے پہچانتے ہو نا؟'' ہنری پیپلن۔''

''پیپلن' تمہیں کون بھول سکتا ہے؟ بخدا! کوئی وقت ایسا نہ تھا جو تمہاری یاد میں نہ گزرتا ہو۔ یقین نہ آئے' تو ماترو سے پوچھ لو۔''

آہ! وہ لمحے اب بھی' اتنے برس بعد یاد آتے ہیں' تو سینے پر سانپ لوٹ جاتا ہے۔ کیا وقت تھا اور کیسے نازک حالات! جب میں کوراکاؤ سے انتونیو کے ساتھ بھاگا تھا' تو جبھی سمجھ لیا تھا کہ ان جان نثاروں کی صورتیں دوبارہ دیکھنے کا موقع نہ ملے گا اور کچھ ایسا ہی حال ان کا بھی تھا' لیکن اب احساس ہوا کہ قدرت کے کھیل نرالے ہیں اور اس کے آگے کوئی کام بھی ناممکن نہیں۔ غیر متوقع طور پر خدا نے بچھڑے ہوؤں کو آپس میں ملا دیا تھا۔ کوراکاؤ سے جب میں انتونیو کے ساتھ فرار ہوا' تو ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ سیاہ فاموں نے میرے بھاگ جانے کی خبر سنی' تو انہوں نے جیل پر ہلہ بول دیا۔ گورنر خود دوڑا دوڑا آیا اور قیدیوں کی جان کے خطرے کے پیش نظر جیل حکام کو ہدایت کی کہ انہیں فوراً محفوظ جگہ منتقل کر دیا جائے۔ اس افراتفری میں جان کلاز اور ماترو کو بھی فرار ہونے کا موقع مل گیا۔ جیل میں انتونیو کے گروہ کے کئی اور آدمی بھی بند تھے۔ ان کے ساتھ ہی ماترو اور جان کلاز بھی مختلف مقامات پر چھپتے پھرے' بالآخر سانتا مارٹا میں آ گئے۔ ان کا خیال تھا کہ سمندر کے راستے وینزویلا چلے جائیں گے' مگر پولیس نے ایک روز انہیں آوارہ گردی کے الزام میں دھر لیا۔ پوچھ گچھ ہوئی' تو سب راز کھل گیا۔ اب انہیں کچھ کارروائی کئے بغیر بیرن کولا روانہ کیا جا رہا تھا کہ میں بھی جا پہنچا۔ معلوم ہوا بیرن کولا خاصا بڑا قصبہ ہے اور وہاں کی جیل بہت وسیع ہے۔ اس وقت بھی اس جیل میں کوئی ایک ہزار کے لگ بھگ مجرم اپنی اپنی سزائے قید کاٹ رہے ہیں۔

رات کا بقیہ حصہ ہم نے اسی گپ شپ میں گزار دیا۔ جان کلاز کا کہنا تھا کہ بیرن کولا جیل میں پہنچ کر ہی فرار ہونے کے امکانات پر غور کیا جائے گا۔ وہاں سے بھاگنا ضروری ہے' ورنہ یہ لوگ ہمیں حکومت فرانس کے حوالے کر دیں گے' اس جیل میں نگرانی کے انتظامات زیادہ بہتر نہیں اور اگر ہم چاہیں تو پولیس افسروں اور نگرانوں کو رشوت دے کر یہاں سے بھی نکل سکتے ہیں' لیکن دشواری یہ ہے کہ ہم ایک تو اسپینش زبان نہیں جانتے اور دوسرے' راستوں سے ناواقف ہیں' اس لیے فوراً لوگوں کی نظروں میں آ کر دوبارہ کسی مصیبت میں پھنس سکتے ہیں۔ ہاں' یہیں کا کوئی آدمی ہمارے ساتھ چلنے کے لیے آمادہ ہو' تو پھر کوئی خطرہ نہیں نگرانی کا حال یہ ہے کہ رات بھر میں صرف تین مسلح گارڈ پہرہ دیتے ہیں۔

''کیا ہر وقت تم لوگ اسی بیرک میں بند رہتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں' صبح دو گھنٹے تک ہمیں صحن میں گھومنے پھرنے کی اجازت ہے' پھر سہ پہر سے لے کر سورج غروب ہونے تک ہم باہر بیٹھ سکتے ہیں: البتہ دوسرے قیدیوں سے بات چیت یا راابطے کی سختی سے ممانعت ہے۔ ویسے بھی ہمیں کومبین مجرموں سے الگ تھلگ رکھا گیا ہے اور خود ہمارا بھی جی نہیں چاہتا کہ ان سے کوئی تعلق پیدا کر کے اپنی مصیبت میں اضافہ کریں۔''

''کومبین قیدیوں میں کس قسم کے افراد ہیں؟''

''ہر طرح کے ہیں۔ زیادہ اٹھائی گیرے اور اچکے ہیں۔ چند پیشہ ور قاتل بھی ہیں جن کے بارے میں عجیب عجیب کہانیاں ان مسلح پہرے داروں کی زبانی سننے میں آتی ہیں۔ کسی نے درجن قتل کیے ہیں' تو کسی نے دو درجن۔ ایسے خطرناک مجرموں کو زمین دوز تہہ خانوں میں رکھا گیا ہے۔ کہتے ہیں وہ ایسی بھیانک جگہ ہے کہ تین ماہ سے زیادہ کوئی شخص وہاں زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس وقت بھی تہہ خانوں میں کوئی پندرہ بیس آدمی بند ہیں۔''

سورج نکلنے سے چند منٹ پہلے جیل کا الارم سنائی دیا۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ قیدی بیدار ہو کر ضروریات سے فارغ ہو جائیں۔ تھوڑی دیر بعد ایک آدمی آیا اور ہمیں بنی بنائی چائے' ابلا ہوا دودھ اور روٹی ناشتے کے لیے دے گیا۔ ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ سپاہی پھر آیا اور کہنے لگا کہ پیپلن کو ہیڈ وارڈن طلب کرتا ہے۔ میں اس کے ساتھ گیا۔ ہیڈ وارڈن وہی شخص تھا جسے میں پولیس چیف سمجھے ہوئے تھا اور گذشتہ رات اس کی حرکتوں

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

سے خاصا لطف اٹھایا تھا۔ اس مرتبہ اس نے بے حد تپاک سے ہاتھ ملایا اور کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے میری جانب معنی خیز نظروں سے دیکھ کر ہنسنے لگا۔ کالے بھٹ چہرے کے ساتھ چمکتے ہوئے سفید دانت ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے توے پر کوڑیاں پھیلا دی گئی ہوں۔ یکا یک کچھ یاد کر کے وہ اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ واپس آیا' تو وہی نیلی وردی پہنے ہوئے موچی اس کے ساتھ تھا۔ ظاہر ہے ترجمان کے بغیر وارڈن صاحب مجھ سے گفتگو نہیں کر سکتے تھے۔ کرسی پر بیٹھ کر اس نے انہی بے ہودہ سوالوں کی بوچھاڑ کر دی جن کے جواب دیتے دیتے میں تنگ آ چکا تھا۔

''تم نے کل بتایا تھا کہ کوراکاؤ جیل سے تمہیں انتونیو نے بھگایا۔ چلو مان لیا' لیکن تم کہتے ہو کہ ڈھائی ماہ تک گوجیرہ اور پھر زوریلو قبائل میں رہے۔ یہ بات میری کھوپڑی میں نہیں آئی۔ سچ سچ بتا دو اس عرصے کہاں رہے اور کس نے تمہیں پناہ دی؟''

''جناب میں نے جو کچھ عرض کیا' وہ حرف بحرف درست ہے۔ اب یہ بات آپ کی کھوپڑی میں نہ آئے' تو میں کیا کروں۔''

''اوہ..... پھر وہی بکواس۔'' اس نے جھنجلا کر کہا۔ ''تمہیں خبر ہے کہ یہ انڈین کتنے وحشی ہیں؟ کوئی شخص ان کے ساتھ ایک دن بھی نہیں کاٹ سکتا۔ صرف اس سال انہوں نے ہمارے تقریباً پچیس ساحلی محافظوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔''

یہ سن کر میں نے قہقہہ لگایا اور کہا: ''جی نہیں' ساحلی محافظوں کو انڈین قبائل نے ہلاک نہیں کیا' یہ کارنامہ اسمگلروں کا ہے۔ آپ کو کسی نے غلط اطلاع دی ہے۔ میں خود اتنے دن انڈین لوگوں کے ساتھ رہا۔ اگر وہ ایسی حرکت کرتے' تو یہ بات مجھ سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی۔''

اس کی آنکھیں حیرت سے ابل پڑیں۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے اثبات میں گردن ہلائی۔

''ہو سکتا ہے تمہارا بیان درست ہو' لیکن یہ بتاؤ کہ تم ان قبائل میں رہ کر کیا کرتے رہے؟''

''میں نے موتیوں اور سونے کے سکوں کی بھری ہوئی تھیلی نکال کر اس کے آگے پھینک دی۔

''یہ وہ معاوضہ اور عطیہ ہے جو مجھے گوجیرہ اور زوریلو قبائل نے کام کرنے کے بعد دیا۔ تمہارے آدمیوں نے کل میری تلاشی نہیں لی' ورنہ یہ تھیلی برآمد ہو جاتی۔ انہوں نے جھوٹ بولا کہ تلاشی لی جا چکی ہے۔''

سونے کے سکے اور بیش قیمت موتی دیکھ کر وارڈن کی رال ٹپکنے لگی۔ نہایت حریصانہ نظروں سے اس نے ایک ایک موتی اور سکہ پرکھا' پھر کہنے لگا: ''یہ بھی تو ممکن ہے کہ یہ سکے اور موتی تم نے کہیں سے چرا لیے ہوں۔'' نہایت غلیظ گالی میری زبان پر آتے آتے رہ گئی۔ غصہ ضبط کر کے میں نے پھر بے پروائی سے قہقہہ لگایا اور کہا:

''کیا اس دوران میں کسی نے اپنے موتیوں اور سونے کے ان سکوں کے چوری ہو جانے کی رپورٹ کی ہے؟''

''ابھی تک ایسی رپورٹ تو نہیں کی گئی' مگر کیا خبر آج کل میں کوئی شخص روتا پیٹتا ہمارے پاس چلا ہی آئے کہ یہ دولت اس کی ہے' لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ اپنی تفتیش مکمل ہونے تک اسے اپنے قبضے میں رکھیں۔ اگر تم اس کے جائز مالک ثابت ہوئے' تو فکر نہ کرو' یہ تھیلی تمہیں لوٹا دیں گے۔''

میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر خباثت کی لہریں رقص کر رہی ہیں۔ موقع ایسا نہ تھا کہ میں یہاں کوئی ہنگامہ کرتا' لیکن تجربے نے بتایا تھا کہ ایسے بے ایمان افسر جہاں بھی ہوں' جس مقام پر بھی ہوں' حد درجے بزدل ثابت ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ اگر گندے لب و لہجے میں بات کی جائے' تو فوراً ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ میں نے ترپ کا پتہ پھینکا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میں ایسی گستاخی پر اتر آؤں گا۔

''آفیسر! میں خود یہ تھیلی لے کر تمہارے پاس آنے والا تھا' کیونکہ میں کل ہی دیکھ چکا تھا کہ تم کس قدر کمینے اور اچھی طبیعت کے آدمی ہو۔ بے شک میں قاتل اور ڈاکو ہوں' لیکن میں نے کولمبیا کی سرزمین میں ایسا کوئی جرم نہیں کیا جس کی بناء پر تم مجھے ڈرانے دھمکانے یا میرا مال ہتھیانے کی کوشش کرو۔ میں نے جو کچھ کیا ہے' وہ اپنے وطن' فرانس کی سرزمین پر کیا ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو میں اس قانون سے واقف نہیں ہوں کہ کسی بھی ملک کے شہری کو' خواہ اس کی حیثیت کیسی ہی گری ہوئی ہو' کسی غیر سرزمین پر مار ڈالنا یا قید کر دینا بین الاقوامی طور پر کتنا بڑا جرم ہے۔ میں تمہارے منہ پر تھوکتا ہوں اور یہ چند حقیر موتی اور زرد دھات کے بے کار ٹکڑے اگر تمہاری زندگی سنوار سکتے ہیں' تو تمہیں عطا کرتا ہوں۔''

اتنا کہتے ہی میں نے پوری قوت سے اس کے چہرے پر تھوک دیا۔ میری اس تقریر اور تھوک دینے کی حرکت سے وارڈن کی کیا حالت ہوئی' اسے کن الفاظ میں بیان کروں؟ اس کا چہرہ پہلے ہی اتنا سیاہ تھا کہ بدلتا ہوا رنگ نظر ہی نہیں آیا' لیکن میں نے اتنا ضرور دیکھا کہ اس سیاہی میں سفیدی نمودار ہوگئی جیسے ایک دم اس کے چہرے سے خون غائب ہوگیا ہو۔ اپنی کرسی پر ہکا بکا بے حس و حرکت بیٹھا' جبڑا کھولے' آنکھیں پھاڑے میری طرف گھورتا ہوا۔ میرا خیال ہے چند جملوں کا مفہوم تو وہ خود بخود سمجھ گیا تھا اور باقی تقریر کا مفہوم اسے موچی نے سمجھا دیا ہوگا۔ خود موچی کی حالت دیکھنے کے لائق تھی۔ اس طرح میری جانب تک رہا تھا جیسے میں کوئی بدروح ہوں یا جنگلی درندہ جو ابھی ابھی ان پر حملہ کرے گا اور خون پی جائے گا۔ موچی کے ہاتھ پاؤں وارڈن کی یہ حالت دیکھ کر لرز رہے تھے۔ وہ اسی وقت منہ پھیر کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی وارڈن کو جیسے ہوش آ گیا۔ اس نے میز پر رکھا ہوا شیشے کا بھاری لیمپ اٹھا کر میرے سر پر دے مارا۔ میں اس اچانک حملے کے لیے تیار نہ تھا۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ آنکھوں کے آگے تارے سے اڑنے لگے۔ پھر خون کی ایک دھار پیشانی سے نکل کر چہرہ تر کرتی ہوئی ہاتھوں پر گری۔ اپنا خون یوں بہتے دیکھ کر میں ہوش وحواس کھو بیٹھا۔ اتنا یاد ہے کہ چند منٹ کے اندر اندر اس کمرے کی ہر شے تلپٹ ہو چکی تھی۔ میز' کرسیاں' کاغذ' فائلیں سب ٹوٹی پھوٹی پڑی تھیں۔ ہیڈ وارڈن کا چہرہ لہولہان تھا۔ اس کی وردی پھٹی ہوئی اور ناک سے نکسیر جاری تھی۔ مجھے حیرت ہے کہ وہ زندہ کیسے رہا۔ میں نے اس کا موٹا سا لکڑی کا رول اس کے جبڑے پر اس زور سے مارا تھا کہ یقیناً اس کے دو تین چمکیلے سفید سفید دانت جھڑ گئے ہوں گے۔ ایک گہرا زخم اس کی بائیں بھوں پر لگا تھا۔ پھر تین چار قوی ہیکل سیاہ فام سپاہیوں نے مجھے لاتوں اور گھونسوں پر دھر لیا۔ میں ان کے درمیان ایک فٹ بال کی طرح اچھل رہا تھا۔ وحشی بھینسوں اور گینڈوں کی مانند مجھ پر پل پڑے اور مار مار کر میرا بھرکس نکال دیا۔ ایسی شاندار ٹھکائی بہت مدت بعد نصیب ہوئی تھی۔ بہت جلد میرا حلیہ ایسا ہوگیا جیسے جاپان کا نقشہ۔ ایک سپاہی کا وہ آخری گھونسا تھا جو میری ناک کے بانسے پر لگا اور میں چرخی کی طرح گھوم کر دھڑام سے فرش پر ڈھیر ہوگیا۔ چند لمحوں تک یہ احساس بھی ہوا ہوگیا۔ اب اندھیرا ہی اندھیرا تھا' بے پایاں اندھیرا..... جس میں وقت کے گزرنے کا بھی پتہ نہیں چلتا۔ دن اور رات یکساں ہو جاتے ہیں۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ہوش آیا' تو یہ اندھیرا مجھے نگلے ہوئے تھا۔ جسم کا کوئی جوڑ ایسا نہ تھا جو بلند آواز میں فریاد نہ کر رہا ہو۔ بڑی مشکل سے بدن کے مختلف حصوں پر ہاتھ پھیر کر ٹوٹی ہوئی ہڈیوں اور چٹخی ہوئی پسلیوں کو گننے کی کوشش کی' مگر یہ کوشش ناکام رہی۔ پتہ چلا کہ دونوں بازوؤں کی کہنیاں بھی اپنی جگہ سے ہلی ہوئی ہیں۔ سر بری طرح چکرا رہا تھا اور ہر لمحہ یوں محسوس ہوتا تھا کہ میں بے پناہ بلندی سے نیچے گر رہا ہوں۔ بے اختیار حلق سے ایسی چیخیں نکلنے لگیں جیسے بلیاں آپس میں لڑ رہی ہوں۔ جواب میں کچھ فاصلے پر دبی دبی ہنسی اور قہقہوں کی آوازیں کان میں آئیں۔ شاید جیل کے وہ سپاہی تھے جنہوں نے میری مرمت کے فرائض ادا کرنے میں بھرپور حصہ لیا تھا' لیکن بہت جلد حقیقت واضح ہوگئی۔ مجھے اسی جیل کے اندر بھیانک تاریک تہہ خانوں میں سے کسی ایک میں پھینک دیا گیا تھا جس کا ذکر جان کلاز نے کیا تھا۔ یہ مکروہ آوازیں ان مجرموں کی تھیں جو یہاں بند کیے گئے تھے اور انہی سنگ دلوں اور بے رحموں کے قہقہے تھے جو تھوڑے بن کر میرے ذہن پر دیر تک برستے رہے۔

خاصی دیر بعد آنکھیں اندھیرے میں کچھ کچھ ٹٹولنے اور دیکھنے کے قابل ہوئیں۔ معلوم ہوا میں لوہے کے ایک پنجرے میں پڑا ہوں جس کی لمبائی چوڑائی اور اونچائی اتنی ہی ہے جتنی چڑیا گھر میں قید کسی درندے کے پنجرے کی ہوتی ہے۔ ہاتھوں سے چھو کر سلاخوں کی موٹائی اور مضبوطی کا بھی اندازہ ہوا۔ ہر سلاخ کوئی ایک انچ کے گھیر میں تھی۔ تھوڑی دیر بعد احساس ہوا کہ فرش بھی گیلا گیلا ہے۔ دائیں بائیں دیکھا' تو انکشاف ہوا کہ بے شمار حشرات الارض بھی وہاں رینگ رہے ہیں۔ ایسے کیڑے مکوڑے جو ٹھہرے ہوئے گندے پانی میں اکثر پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان میں لال بیگ بڑی تعداد میں تھے جو نہ جانے کب سے میرے برہنہ بدن پر چل رہے تھے۔ پھر ایک گوشے میں کموڈ بھی پڑا نظر آیا۔ گویا مجھے اسی پنجرے میں حوائج ضروریہ سے بھی فارغ ہونا تھا۔ دوسری جانب ٹین کے ایک کنستر میں پانی بھرا تھا۔ اس کے قریب ہی المونیم کا مگ دھرا تھا۔ یہ پانی شاید پینے کے مصرف میں آتا ہوگا۔ میں نے اٹھ کر ایک گھونٹ پیا۔ جی متلا گیا۔ پتہ چلا کہ نہ جانے کب سے اس کنستر میں پانی بھرا ہوا ہے۔ اس میں سے بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ اب اٹھ کر گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ نظروں کے عین سامنے کوئی دس فٹ کے فاصلے پر پانچ چھ فٹ کی بلندی پر ننھا سا انگارہ سلگتا دکھائی دیا۔ یہ انگارہ تاریکی میں تھا۔ کبھی تیز سرخ ہو کر دہکنے لگتا' دوسرے ہی لمحے مدھم پڑ جاتا۔ میں کئی

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

سیکنڈ تک سمجھ نہ پایا کہ آخر کیا چیز ہے؟ کسی جانور کی آنکھ ہے یا کچھ اور..... پھر نتھنوں میں کڑوے تمباکو کی بو در آئی۔ قریب ہی کوئی نادیدہ ہستی سگریٹ یا سگار پی رہی تھی۔ انکشاف ہوا کہ آگ کا وہ پراسرار ننھا دہکتا ہوا سرخ انگارہ سلگتے ہوئے سگریٹ کا سرا ہے جو سامنے والے پنجرے میں بند ایک سیاہ فام قیدی کے ہونٹوں میں دبا ہوا تھا۔ اس اندھیرے میں اس حبشی کا ننگ دھڑنگ جسم بھلا کیسے نظر آتا؟ پھر وہیں سے ہنسنے کی آواز آئی اور میں نے سفید سفید دانت چمکتے دیکھے۔ وہ میری حالت دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔

''کتے کے بچے! تم کس لیے دانت نکال رہے ہو؟'' میں نے جھلا کر اسے گالی دی۔ اس مرتبہ گونج دار قہقہے بلند ہوئے۔ یہ گالی کچھ اور قیدیوں نے بھی اپنے اپنے پنجروں میں سن لی تھی۔ پھر کسی نے ٹوٹی پھوٹی فرانسیسی اور اسپینش زبان میں کہا:

''جی بھر کے دل کی بھڑاس نکال لو پیارے! یہاں ناراض ہونے والا کوئی نہیں۔ چند دن میں خود مزاج ٹھکانے آ جائیں گے۔ ابھی نئے نئے ہو، بدن میں خون گرم ہے۔ جب ٹھنڈے پڑ جاؤ گے، تب ہماری زبان کے جوہر بھی دیکھنا۔ آہاہاہا.....'' اس آواز کے ساتھ ہی قہقہوں کا مسلسل شور اور بے ہنگم سیٹیوں کی آواز تہہ خانے میں گونجنے لگی۔ میں نے سوچا چپ ہو جانا ٹھیک نہ ہوگا، اس میں اپنی ہیٹی ہے۔ خوب ہی مغلظات بکیں۔ خاصا وقت اسی تفریح میں گزر گیا۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ عارضی طور پر میں ٹیسیں بھول گیا۔

جب گالم گلوچ اور قہقہوں کا یہ طوفان تھما، تو چاروں طرف سے مجھ پر سوالوں کی بوچھاڑ شروع ہوئی۔ کون ہو؟ کہاں سے نازل ہوئے ہو؟ کس جرم میں پکڑے گئے؟ کتنی سزا بھگتو گے؟ یہیں مرنے کا ارادہ ہے یا باہر نکلو گے؟ کوئی یار دوست یہاں ہے؟ کوئی ضمانت بھی دینے والا ہے؟ کچھ خبر ہے کہ یہاں کے قواعد کیا ہیں؟ وغیرہ وغیرہ..... میں نے جہاں تک ممکن ہو سکا سب سوالوں کا جواب دینا چاہا۔ درمیان میں کسی نے قطع کلامی کی، فوراً ہی دوسری جانب سے کسی نے کرخت آواز میں قطع کلام کرنے والے کو موٹی سی گالی دے کر خاموش رہنے کا حکم دیا۔ پھر مجھ سے ارشاد ہوا کہ ہاں، بیان جاری رہے۔ جس شخص نے یہ حکم دیا تھا، معلوم ہوا کہ وہ یہاں کا سردار ہے یعنی سب قیدیوں کو اس کے حکم پر طوعاً و کرہاً عمل کرنا پڑتا ہے۔ اس نے مجھے بھی اپنے رعب میں لینے کی کوشش کی، لیکن میں نے چلا کر اس کی طرف بھی تین چار گالیاں لڑھکا دیں۔ موصوف کی طبیعت صاف ہو گئی۔ سوچتے ہوں گے کہ یہ ہم

سے بھی پانچ جوتے آگے ہے۔ بدمعاشوں کی دنیا کے قواعد و آداب یہی ہیں۔ یہاں جو ذرا ہلکا پڑا، گیا اپنی جان سے جس نے جی داری کا مظاہرہ کیا، جم گیا ہمیشہ کے لیے۔ اپنا تعارف کرانے کا یہ طریقہ اس دنیا میں بے حد کارآمد سمجھا جاتا ہے اور حریفوں پر اس کا اچھا اثر پڑتا ہے۔ پھر کوئی تو تڑاخ کرنے کی کوشش نہیں کرتا اور ہر فرد اپنے آپ میں رہنا ہی بہتر جانتا ہے۔

میں نے سلاخوں کے ساتھ لگ کر جہاں تک نظر جاتی تھی، دیکھا کہ سبھی اپنے اپنے پنجروں سے لگے مجھے دیکھنے کا شوق پورا کر رہے ہیں۔ ایک آواز سنائی دی: ''آدمی جان دار ہے۔'' دوسرے نے تائید کی۔ تیسرے نے یوں تبصرہ کیا: ''ضرور کسی کو قتل کر کے آیا ہے۔'' چوتھے نے ہانک لگائی: ''ابے کچھ تو منہ سے پھوٹ یا چپ شاہ ہی بنا رہے گا۔'' میں نے عرض کیا کہ ہیڈ وارڈن کی ٹھکائی کرنے کی پاداش میں یہاں روانہ کیا گیا ہوں، اس سے پیشتر اوپر کی بارک کا قیدی تھا۔ فرانس سے ڈیول آئی لینڈ کو بھیجا گیا تھا۔ وہاں بھی دو تین پہریداروں کو واصل جہنم کر چکا ہوں۔ اب پندرہ سو میل کا سفر طے کر کے یہاں آیا تھا کہ کسی طرف کو نکل جاؤں گا، لیکن دھرا گیا دل خانہ خراب کے بدلے۔ کچھ عرصہ وحشی انڈین قبائل میں رہنے کا شرف بھی حاصل ہے۔ کوراکاؤ جیل توڑ کر بدنام زمانہ مجرم انتونیو کے ساتھ فرار ہوا تھا۔ اگر اس بیان سے آپ حضرات کی تسلی ہو گئی ہو، تو خاموش ہو جاؤں، ورنہ بکواس جاری رکھوں۔''

زیادہ تقریر کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔ سب دم بخود رہ گئے۔ پھر دبے دبے الفاظ میں ان کارناموں کو سراہنے لگے۔ میرے سامنے پنجرے میں بند حبشی نے اچانک زور سے نعرہ لگایا۔ وہ اس بات پر خوش تھا کہ میں نے اس بدمعاش وارڈن کی مرمت کی ہے۔ اب میں اس حبشی کو کیا بتاتا کہ خود میرا کیا حال ہے اور جو ٹھکائی وارڈن کے آدمیوں نے میری کی ہے، اس کے اثرات میرے بدن پر کیسے کیسے گل بوٹے چھوڑ گئے ہیں۔ ناک سوجی ہوئی، چہرہ خون آلود، بدن پر ان گنت خراشیں، اندرونی چوٹیں ان کے علاوہ۔

''اب تم لوگ بھی بھونکو کہ یہاں کب سے پڑے سڑ رہے ہو؟'' میں نے چلا کر کہا۔

''مجھے تو پورے دو مہینے ہو گئے۔'' سامنے والے سیاہ فام نے جواب دیا۔ ''بقیہ لوگوں کا بھی یہی حال ہے۔ ویسے بھی اس تہہ خانے میں کوئی شخص تین ماہ سے زیادہ زندہ نہیں رہا

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

کرتا۔ کوشش کرو میرے بھائی کہ یہاں سے نکل جاؤ۔ یہ قید خانہ نہیں' جہنم ہے جہنم .....یقین نہ آئے' تو کسی اور سے پوچھ لو۔''

''یہ سچ کہتا ہے موسیو۔'' دائیں جانب سے آواز آئی۔ ''صرف ایک شخص ایسا تھا جو یہاں آٹھ ماہ تک قید رہا اور زندہ بچ نکلنے میں کامیاب ہوا' لیکن آخر میں اس کا حال بھی یہ ہو گیا تھا کہ اپنے پیروں پر کھڑا ہونے سے قاصر۔

سپاہی اسے کندھوں پر اٹھا کر لے گئے تھے۔ بہر حال وہ یہاں سے جاتے ہی کچھ عرصے بعد مر گیا۔''

''کیا تم سبھی سزا یافتہ ہو یا ابھی عدالتوں میں مقدمے چل رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''مقدمے چل چکے ہیں موسیو' اور اب ہم عمر قید کی سزا کاٹ رہے ہیں' جو زیادہ سے زیادہ بیس سال ہوتی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہاں گلوٹین نہیں جس سے قاتلوں کے سر کاٹے جاتے ہیں' نہ پھانسی ہے نہ موت کی کوٹھڑی اور نہ یہاں جاپانی جلاد ہیں جو تلوار کے ایک ہی وار سے مجرم کی گردن کھٹ سے اڑا دیتے ہیں' لیکن یہ بیس سال کی عمر قید اگر ایسے تہہ خانوں اور پنجروں میں کاٹنی پڑے' تو زیادہ سے زیادہ تین ماہ کی مدت میں قیدی ہمیشہ کے لیے قید حیات سے آزاد ہو جاتا ہے۔''

''آخر وجہ کیا ہے؟ سچ سچ بتاؤ۔ مانا کہ یہ تہہ خانہ ہے۔ یہاں تازہ ہوا نہیں آتی' لیکن پھر بھی آدمی کو زیادہ عرصے تک زندہ رہنا چاہیے۔ کیا یہ لوگ تمہیں بھوکا رکھتے ہیں؟''

''ارے نہیں بھائی' بھوک پیاس کچھ نہیں' یہاں گوشت خور چوہے کثرت سے ہیں جو رات کو نمودار ہوتے ہیں اور جو قیدی غفلت سے فرش پر پڑا مل جائے' اسے نوچ نوچ کر چٹ کر جاتے ہیں۔ خبردار' تم فرش پر کبھی نہ سونا پچھلی دیوار میں لکڑی کا تختہ ٹھکا ہوا ہے' ہمیشہ اس پر آرام کرنا۔ دوسری بات یہ کہ اگر کوئی چوہا تمہیں کاٹے' تو اسے مارنا مت' ورنہ وہ مشتعل ہو جائے گا اور تمہیں بہت تنگ کرے گا۔ بس اسے جوتے یا کپڑے کے ذریعے ہشکار دینا یا ڈرا کر بھگا دینا۔''

''تم لوگ مجھے خوف زدہ کرنے کی خواہ مخواہ کوشش کر رہے ہو۔'' میں نے چڑ کر کہا۔ ''وہ چوہا ہے یا آدم خور شیر؟''

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

اس بات پر سب نے قہقہہ لگایا۔ میں نے سامنے والے حبشی سے پوچھا کہ اس نے کیا جرم کیا تھا۔ جواب ملا' میں نے تین قتل کیے ہیں۔ اس کے پڑوسی نے بتایا کہ میں نے ایک پولیس مین کو گولی مار کر ہلاک کیا تھا' ایک اور نے اپنا کارنامہ یہ بتایا کہ وہ بنک لوٹنے گیا تھا۔ وہاں چوکیدار نے مزاحمت کی' مجبوراً اسے دوسری دنیا کو روانہ کرنا پڑا۔ غرض سبھی نے ایسی ہی داستانیں سنائیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ پورے کولمبیا میں لوگ قاتل ہیں یا مقتول..... حالانکہ جان کلاز نے مجھے اس کے برعکس خبر دی تھی۔ اس کا بیان تھا کہ ان میں اکثریت معمولی جرائم پیشہ افراد کی ہے۔ ایک دو ضرور بڑے مجرم یا قاتل ہیں۔ سمجھ میں یوں آیا کہ ان کولمبین لوگوں میں بڑ ہانکنے کی عادت بھی ہے۔ ماریں گے چوہا' لیکن کہیں گے شیر مارا ہے۔

جب تعارف کا یہ ہنگامہ ختم ہوا' تو میں نے اپنے حالات پر غور و خوض شروع کیا۔ یہاں کا ماحول سینٹ مارٹن کے کیمپوں سے کچھ کم بدتر نہ تھا۔ بے شک دنیا گول ہے۔ جہاں سے چلا تھا' وہیں آن پہنچا۔ گویا پندرہ سو میل کا سفر محض اسی تہہ خانے میں بند ہونے کے لیے کیا تھا' جہاں روشنی ہے نہ ہوا' اور نہ زندگی کی کوئی معمولی دل چسپی۔ ساتھی بھی ملے' تو ایسے جن سے کسی قسم کی بھلائی یا مدد کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ ادھر وارڈن بھی جانی دشمن بن گیا ہے۔ خدا جانے اب اس کا کیا حال ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کی ناک کا بانسہ ٹوٹ گیا ہے۔ اور اب وہ ہسپتال کے کسی بستر پر پڑا ہائے ہائے کر رہا ہوگا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ میرے خلاف کیا رپورٹ تیار کی جاتی ہے۔ فرض کرو میں یہاں مر بھی گیا' تو کیا ہوگا؟ کچھ بھی نہیں۔ کسی کو میری جان کی کیا پروا ہو سکتی ہے۔ اگر زندہ بچا' تو ایک نہ ایک دن یہ کمینے کولمبین مجھے فرانس کے حوالے کر دیں گے۔ اس کے بعد کچھ سوچنا بے کار تھا۔ بہر حال اپنے وطن کی سرزمین پر گلوٹین کے نیچے سر دے کر مرنا مجھے گوارا تھا بجائے اس کے کہ غیر ملک میں' اجنبیوں کے ہاتھوں مارا جاؤں۔ پھر جان کلاز اور ماترو کا خیال آیا۔ اب تک انہوں نے سن لیا ہوگا کہ مجھے تہہ خانے میں پہنچا دیا گیا ہے۔ بے چارے منہ ڈھانپے رو رہے ہوں گے۔ قدرت نے ملایا اور پھر جدا کر دیا۔

انہی خیالات کے گرداب میں غوطے کھا رہا تھا کہ دفعتاً اپنے پیروں پر نمی کا سا احساس ہوا۔ میں نے پاؤں ہلائے' خدا کی پناہ! یہ پانی کہاں سے آ رہا تھا۔ چند لمحوں کے اندر اندر پانی ٹخنوں سے بھی اوپر آ گیا۔ میں چلایا جواب میں سامنے والے وحشی نے بھی چیخ کر خبردار کیا

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کہ سلاخوں پر چڑھ کر پناہ لو یا لکڑی کے تختے پر جالیٹو۔ سمندر میں مد آ رہا ہے اور اس کا پانی لازماً آتا ہے اور دو ڈھائی گھنٹے تک یہی کیفیت رہتی ہے' پھر پانی اترنے لگتا ہے۔ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں کئی مرتبہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اب میں اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ اس ہولناک تاریک قید خانے میں قیدی تین ماہ سے زیادہ زندہ کیوں نہیں رہتے۔ سمندر کا نمکین پانی بہت جلد ان کے جسموں کو گلا دیتا ہے اور ایسے ایسے امراض پیدا ہو جاتے ہیں کہ قیدی اگر زندہ بھی رہے' تو مردوں سے بدتر اس کی حالت ہوتی ہے۔

پانی اب میرے گھٹنوں کو چھو رہا تھا۔ میں نے سلاخوں پر پناہ لی۔ دونوں پیر اوپر کی ایک گرل میں پھنسا لیے اور ہمت کر کے دھڑ زمین سے اٹھا لیا۔ یکا یک کسی جانور نے میری بائیں پنڈلی میں زور سے کاٹا۔ میں نے درد سے بے تاب ہو کر زور سے لات ماری۔ کوئی جاندار شے پانی میں غڑاپ سے گری' پھر اچھل کر باہر آئی۔ میں نے گردن گھما کر غور سے دیکھا۔ دو ننھی ننھی زرد آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔ دہشت سے خون خشک ہونے لگا۔ یہ ایک موٹا تازہ چوہا تھا۔ بلی سے کچھ ہی چھوٹا۔ اس نے منہ کھول کر چھوٹے چھوٹے نوکیلے دانت مجھے دکھائے اور پھر مجھے ڈسنے کے لیے اچھلا۔ میں نے لات اس کے منہ پر ماری۔ وہ چیختا ہوا پرے ہٹ گیا۔ میں نے سنا کہ دوسرے پنجروں میں بھی کچھ ایسی ہی اچھل کود جاری تھی۔ سمندری پانی کے ساتھ ہی نہ صرف یہ مردم خور چوہے آتے' بلکہ اور کئی بلائیں بھی ان کے ہمراہ نازل ہوتی تھیں۔ ایسی بلائیں جو انسانی گوشت اور لہو کی پیاسی ہوتیں۔ ان میں ننھے ننھے دکھائی نہ دینے والے ان گنت ایسے کیڑے تھے جو قیدی کے برہنہ بدن پر جونکوں کی مانند چمٹ جاتے اور خون چوسنے لگتے۔ بڑے بڑے مینڈک اور عجیب قسم کی چھپکلیاں بھی نمودار ہوتیں اور جوں جوں پانی اترنے لگتا' ان سب جانوروں میں شکار پر جھپٹنا جھپٹی ہونے لگتی۔ چوہے مینڈکوں پر لپکتے اور مینڈک بری طرح ٹراتے' چھپکلیاں آناً فاناً لکڑی کے تختے پر چڑھ آتیں یا کموڈ میں داخل ہو جاتیں۔ پینے کے پانی کا کنستر بھی ان حشرات الارض سے محفوظ نہ رہتا۔ بعد میں ان گنت لال بیگ' چھوٹے مینڈک اور چھپکلیاں اس کے اندر سے نکلتیں۔ یہ ایسی مصیبت تھی جس سے نجات پانا ممکن نہ تھا۔ قیدی کئی کئی گھنٹے اپنے جسم کا بچاؤ کرنے کے لیے سلاخوں پر ٹنگے رہتے۔

پہلے ہی روز مجھے بھی دو مرتبہ سلاخوں اور تختے پر پناہ لینا پڑی۔ آخری مرتبہ سخت نیند آ رہی تھی کہ پانی چڑھ آیا اور اس مرتبہ چوہے زیادہ تعداد میں آئے۔ ان کے جسموں سے

بدبو کے ایسے بھبکے اٹھتے تھے کہ دماغ چکرانے لگتا۔ دو دو گھنٹے تک پانی میں پھرتے اور چوں چوں کے شور سے سارا تہہ خانہ گونج اٹھتا۔ قیدیوں کے غل غپاڑہ اور گالی گفتار ساری رات اور دن بھر جاری رہتی۔ پانی اترنے کے بعد دو دو انچ موٹی ناگوار کیچڑ کی تہہ فرش پر جم جاتی جسے صاف کر کے پنجرے سے باہر پھینکنا بھی قیدی کے فرائض میں داخل تھا۔ مد کی یہ حالت چاندنی راتوں میں بہت بڑھ جاتی تھی۔ اگرچہ ہم بدنصیب قیدی چاند کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ پھر مجھے یاد آیا کہ چاند کا تعلق حیرت انگیز طور پر میری زندگی کے ساتھ کس قدر گہرا رہا ہے۔ وہ چاندنی رات ہی تھی جب ہم دریائے میرونی میں سفر کے لیے نکلے تھے اور بیگنی کے کیمپ سے فرار ہونے میں کامیابی ہوئی تھی اور اس شب بھی دریا میں مد کی کتنی زبردست کیفیت تھی اور یہ اسی مد کا نتیجہ تھا کہ ہم دشمنوں کے ہتھے نہیں چڑھ سکے۔ پھر وہ بھی چاندنی رات تھی اور سمندر میں شوریدہ سر دیو پیکر لہریں اٹھ رہی تھیں جب ہم ٹرینڈاڈ سے کوراکاؤ کی جانب روانہ ہوئے تھے۔ سمندر کا وہ ہولناک سفر بھی ناقابل فراموش تھا۔ اسی سفر میں ہمارا دوست فرینڈیز شارک مچھلیوں کی غذا بنا تھا۔

اندازے کے مطابق تین شب و روز گزر گئے تھے اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں روز ازل سے یہیں بند ہوں۔ اس دوران میں دو مرتبہ قیدیوں کو کھانا ملا اور پینے کا پانی بدلا گیا۔ پھر دو سپاہی رائفلیں سنبھالے اور اپنی ناکوں پر سفید رومال باندھے نمودار ہوئے۔ ان کے ساتھ گھٹیا درجے کے چار آدمی تھے جنہوں نے ہر قیدی کے کموڈ کی صفائی کی۔ اس میں سے جو غلاظت نکلی' وہ انہوں نے ایک بڑے ڈرم میں الٹ دی اور صفائی کے بہانے مزید گندگی پھیلا کر چلے گئے۔ ظاہر ہے گندی' زہریلی فضاء میں زیادہ دیر زندہ رہنے کے امکانات بالکل معدوم تھے۔ چوتھے روز کھانا بانٹنے والے آدمی سپاہیوں کے پہرے میں آئے اور انہوں نے بہت ہوشیاری سے ایک چھوٹا سا پیکٹ کھولا۔ اس میں سگریٹ کی دو ڈبیاں اور ایک ماچس برآمد ہوئی۔ ایک چھوٹا سا پرزہ کاغذ بھی نکلا۔ میں نے ماچس کی تیلی جلا کر کاغذ پر نگاہ ڈالی۔ یہ جان کلاز کی تحریر تھی:

''پیپلن' حوصلہ نہ ہارنا۔ ہم بہت جلد اس دوزخ سے نکل کر بیرن کو لا بھیجے جانے والے ہیں۔ تمہارے بارے میں بھی یہی فیصلہ کیا گیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس خطرناک آدمی کو فوراً یہاں سے روانہ کر دیا جائے۔ جس وارڈن کی تم نے ٹھکائی کی تھی' وہ ہسپتال میں ہے اور دوسرے حکام کو علم ہو گیا ہے کہ اس نے تم سے موتیوں اور سونے کے سکوں کی تھیلی چھیننے کی

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کوشش کی تھی۔ تمہاری یہ دولت غالباً بیرن کولا جاتے وقت واپس کر دی جائے گی۔ اگر تم کوئی پیغام دینا چاہو یا کسی چیز کی ضرورت ہو تو یہ پیکٹ لانے والوں سے کہہ دینا۔ ہم نے انہیں خاصا معاوضہ دے کر اس کام کے لیے رضامند کیا ہے۔ فقط: تمہارے جاں نثار دوست۔''

یہ پیغام دیکھ کر میں آب دیدہ ہو گیا۔ اپنی تمام تر بدنصیبیوں کو سامنے رکھتے ہوئے جب یہ خیال آتا کہ خدا نے ایسے دوست بھی دیے ہیں' تو بے اختیار اظہار تشکر میں گردن جھک جاتی تھی۔ میں نے ایک ڈبیا سگریٹ ساتھیوں میں تقسیم کر دی۔ ایک سگریٹ تو سلگا کر سامنے والے کی طرف پھینکا' دوسرا اپنے دائیں پڑوسی کو دیا' تیسرا بائیں ہاتھ والے کو۔ پھر انہوں نے یہ سگریٹ آگے بڑھا دیے۔ سبھی میری اس سخاوت پر حیران تھے۔ ان کے ذہن میں کسی طرح یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ کوئی قیدی ان حالات میں' جبکہ سگریٹ ایک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں ہوتا' یوں اپنی دولت مفت میں بانٹ دے محض اس حقیر شے کی وجہ سے میں نے اپنے لیے وہ عزت و احترام لمحے بھر میں حاصل کر لیا جو مدتوں اپنی بدمعاشی اور بہادری کے قصے سنا کر بھی حاصل نہ ہوتا۔ اگلے روز پھر مجھے اپنے ساتھیوں کی جانب سے ایک پیکٹ ملا۔ اس میں سے مزید سگریٹ برآمد ہوئے۔ ان کے علاوہ کاغذ اور پنسل بھی.....

ایک چھوٹا سا رقعہ جان کلاز کے ہاتھ کا لکھا ہوا:

''پیپلن پیارے' ہم نے سنا ہے کہ تم ڈٹے ہوئے ہو' زندہ باد..... اوپر والے سب لوگ' قیدی اور سپاہی سبھی' تمہاری جی داری سے خوش ہیں۔ بہادر آدمی کی ہر جگہ قدر ہوتی ہے۔ جب وہ تمہاری تعریف کرتے ہیں' تو فخر سے ہمارے سینے تن جاتے ہیں۔ جو لوگ تہہ خانوں میں قیدیوں کے لیے کھانا لے جاتے ہیں اور صفائی وغیرہ کے کام پر مقرر ہیں' وہ سب قیدی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم پیپلن کو ذرا تکلیف نہ ہونے دیں گے۔ تم بھی ان کا شکریہ ادا کر دینا۔ حقیقت میں یہ لوگ ہمارے ساتھ تعاون کر کے اپنے لیے بہت بڑا خطرہ مول لے رہے ہیں۔ گزشتہ روز ایک نوجوان عورت جیل میں آئی تھی۔ غالباً اس کا تعلق اسی کانونٹ سے ہے جہاں سے پولیس نے تمہیں گرفتار کیا تھا۔ اس نے نائب وارڈن کی بڑی خوشامد کی کہ کسی طرح تم سے ملاقات کا موقع مل جائے' لیکن اس نے ''رسک'' لینے سے صاف انکار کر دیا: تاہم اس عورت کو پتہ چل گیا ہے کہ تمہیں ''موت کے پنجرے'' میں رکھا گیا ہے۔ وہ سخت احتجاج کر رہی تھی اور کہہ گئی ہے کہ اس معاملے کو اعلیٰ حکام تک پہنچائے گی۔ یہ غیبی مدد ہے پیپلن۔ شاید وہ عورت آج پھر آئے۔ ہم نے بھی اس سے ملنے کی اجازت مانگی

تھی' لیکن وارڈن سخت بزدل آدمی ہے۔ اس نے ہرگز اجازت نہیں دی..... کسی چیز کی ضرورت ہو' تو لکھ کر بھیج دو۔ ہم تمہاری ضرورت پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔''

میں سوچنے لگا کہ وہ عورت کون ہو سکتی ہے؟ آئرش یا اسپینش؟ یہ بات بھی نہیں کھلی تھی کہ مخبری کا فریضہ کس نے انجام دیا تھا۔ پولیس آدھی رات کو یونہی نہیں آ سکتی تھی اور پھر کانونٹ جیسی عمارت میں؟ ضرور کسی نے پولیس کو اطلاع دی تھی کہ ایک مفرور مجرم کانونٹ میں پناہ لیے ہوئے ہے۔ اس خیال ہی سے خون کھولنے لگتا تھا کہ میرا نادیدہ دشمن کون ہے؟ بار بار انتقام کی آگ کلیجے میں سلگتی اور ٹھنڈی ہونے میں نہ آتی۔ اگر پتہ چل جائے' تو وہ حشر کروں کہ زندگی بھر یاد رکھے..... لیکن وقت گزرنے کے ساتھ سوچتا کہ جن افراد سے تمہیں انتقام لینا ہے' وہ یہاں نہیں' پیرس میں ہیں۔

شروع شروع میں جان کلاز اور ماترو کے پیغام باقاعدگی سے ملتے رہے' پھر اچانک ان کا سلسلہ رک گیا۔ جو لوگ پیغام لاتے اور لے جاتے تھے' وہی غائب ہو چکے تھے۔ میں نے قیاس کیا کہ جیل حکام کو علم ہو گیا ہو گا۔ خدا جانے کلاز اور ماترو پر کیا بیتی۔ ممکن ہے ظالموں نے انہیں اس جیل سے کہیں اور منتقل کر دیا ہو یا بیرن کولا کے قید خانے میں بھیج دیا ہو۔ اسی پریشانی میں کئی دن اور کٹ گئے۔ اب رہائی کی امیدیں معدوم نظر آنے لگیں۔ کانونٹ کی جس خاتون کے آنے کا ذکر جان کلاز نے اپنے پیغام میں کیا تھا' وہ شاید دوبارہ آئی ہو' لیکن مجھے اس کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں دی گئی۔ ایک دن تختے پر چت لیٹا بیتے دنوں کی یادیں تازہ کر رہا تھا کہ پنجرے کے باہر روشنی کی کرنیں پھوٹیں۔ پھر بھاری قدموں کی آوازیں آئیں۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ہیڈ وارڈن' پنجرے کے باہر کھڑا خونخوار نظروں سے مجھے گھور رہا ہے۔ دائیں بائیں دو مسلح گارڈ تھے۔ خود وارڈن کی پیٹی میں ریوالور لٹکا ہوا تھا۔ ایک گارڈ نے کنجیوں کے گچھے میں سے ایک کنجی منتخب کی' قفل کھول کر مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ میں تختے سے اترنے کی کوشش میں اوندھے منہ فرش پر گرا اور بے اختیار حلق سے چیخ نکل گئی۔ سر گھومنے لگا۔ دوسرے گارڈ نے مجھے اٹھایا' پھر سہارا دے کر ایک طرف لے جانے لگے۔ اچھی طرح یاد ہے کہ اس منحوس تہہ خانے کی پچیس سیڑھیاں تھیں جو مجھے اس بیچارگی کے عالم میں چڑھنی پڑیں۔ تہہ خانے کے دوسرے قیدیوں نے میری آزادی پر بہت غل مچایا۔ یہ خوشی اور مسرت کا غل غپاڑہ تھا۔ میں نے وارڈن سے پوچھا: ''کہاں لے جانے کا ارادہ ہے؟'' اس نے بے حیائی سے دانت نکال کر کہا: ''جہنم کی

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

طرف۔'' میں نے یہ سنتے ہی پھر اس کے چہرے پر تھوک دیا۔ ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا' لیکن کچھ نہ کہا۔ جیب سے رومال نکال کر چہرہ صاف کیا اور آگے بڑھ گیا۔ اس بدتمیزی و گستاخی پر گارڈ نے رائفل کا بٹ میرے سر پر مارنے کا ارادہ کیا لیکن دوسرے گارڈ نے اسے روک دیا' ورنہ ایک بار پھر میری کھوپڑی چیخ گئی ہوتی۔

جیل کے صحن میں اندھیرا تھا۔ دو تین برقی بلب کہر میں روشنی پھیلانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ میں نے چندھی چندھی آنکھوں سے گردوپیش کا جائزہ لیا۔ آدھی رات کا وقت ہوگا۔ ہر طرف سناٹا تھا' قیدی اپنی اپنی بیرکوں میں خراٹے لے رہے تھے۔ جیل کے پھاٹک پر نگاہ گئی۔ باہر وہی پولیس وین کھڑی تھی جس میں یہ لوگ مجھے کانونٹ سے بٹھا کر لائے تھے۔ اب دو اور مسلح گارڈ آن پہنچے۔ وردی پوش سیاہ فام ڈرائیور نے وین کا پچھلا مقفل دروازہ کھولا اور گارڈوں نے مجھے اٹھا کر اندر پھینک دیا۔ کسی انسانی جسم سے میرا سر ٹکرایا' اسی وقت وین کا دروازہ زور سے بند ہوا۔ گارڈ اگلی نشست پر بیٹھے تھے۔ ڈرائیور نے انجن اسٹارٹ کیا۔ وین کے اندر چھت پر لگا ہوا سرخ بلب روشن ہوگیا۔ میں نے دیکھا کہ سامنے کی نشست پر جان کلاز اور ماترو ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنے بیٹھے ہیں۔ یہ ایک غیر متوقع ملاقات تھی۔ ہم آپس میں مل کر آنسو بہانے لگے۔ یہ خوشی کے آنسو تھے۔ معلوم ہوا ہماری اگلی منزل بیرن کولا کا بڑا قید خانہ ہے۔

✣ ✣ ✱ ✣ ✣

ہمیں بیرن کولا پہنچا دیا گیا تھا۔ آہ! ایسی جگہ سے بچنے کے لیے ہم نے مصیبتوں کے پہاڑ اٹھائے تھے' لیکن اس طویل و عریض قید خانے میں نہ معلوم وہ کونسی کشش تھی کہ ہم اس سے جتنا دور بھاگے' یہ اسی قدر قریب آتا چلا گیا۔ یہ قید خانہ تھا یا کوئی عفریت' بلند و بالا دیواریں' چار سو قیدی اور ایک سو مسلح وارڈر۔ باہر کی خبر اندر نہ آنے پاتی اور اندر کی چیخ باہر انسانی کانوں تک نہ پہنچ سکتی تھی۔

جیل کے اعلیٰ حکام اور کولمبیا کے گورنر ڈان گریگوریو نے ہمارا ''استقبال'' کیا۔ جیل کے اندر چار احاطے تھے۔ دو ایک طرف اور دو دوسری طرف۔ ان کے درمیان ایک گرجا واقع تھا جو حد فاصل کا کام بھی دیتا' عبادت گاہ کا بھی اور ملاقات کا انتظام بھی یہیں ہوتا۔ ہمیں سب سے ''خطرناک'' حصے میں بند کیا گیا۔ ہماری کوٹھڑی یارڈ کے عین درمیان تھی۔ یہ کوٹھڑی نہیں' ایک پنجرہ تھا۔ کنکریٹ کی چھت' مضبوط آہنی سلاخوں کے سہارے کھڑی تھی۔

دوسرے قیدی عام کوٹھڑی میں بند تھے' مگر ان کی دیواروں میں اس غرض سے سوراخ بنے ہوئے تھے کہ بندروں کی طرح محبوس ہم لوگوں کا تماشا کرتے رہیں۔ ہماری ایک ایک حرکت سب کے سامنے تھی اور اگر ہم سلاخ کے قریب بھی پھٹکتے تو محافظوں کی شعلہ بار آنکھیں ہمیں شرارت سے باز رہنے پر مجبور کر دیتیں۔

دو دن کے بعد ہمیں گرجے لے جایا گیا۔ وہاں گورنر' چند پولیس کے سپاہی اور آٹھ اخباری فوٹو گرافر موجود تھے۔

''کیا تم فرنچ گیانا سے فرار ہوئے تھے؟''

''ہم نے اس سے انکار کب کیا ہے؟''

''تم نے ایسا کونسا جرم کیا ہے کہ سب سے کڑی سزا کے مستحق گردانے گئے۔

''اصل معاملہ یہ نہیں ہے' بلکہ یہ ہے کہ ہم نے کولمبیا کی سرزمین پر کوئی جرم نہیں کیا اور تمہاری حکومت نہ صرف ہماری آزادی کے حق سے انکار کر رہی ہے' بلکہ وہ فرانسیسی پولیس کے انسانی شکاریوں کا ہاتھ بھی بٹا رہی ہے۔''

''ٹھیک ہے' ہم تمہیں واپس بھجوانے کی کوشش کریں گے۔''

جب ہم واپس پنجرے میں آئے' تو ماترو نے کہا' تم نے گورنر سے کیوں تلخ لہجہ استعمال کیا۔ خدا کے لیے احساس کرو کہ ہم جہنم کے بدترین حصے میں پابجولاں پڑے ہیں۔ ایسی باتیں نہ کرو کہ وہ اشتعال میں آ کر کبھی ہمیں یہاں سے نکلنے ہی نہ دیں۔''

''سنو!'' میں نے ماترو کو ڈانٹ پلاتے ہوئے کہا: ''ہر شخص اپنے بارے میں بہتر جانتا ہے' جہاں تک میرا تعلق ہے' میں ان کی اس جیل سے ضرور بھاگ نکلوں گا۔ مجھے میری ماں نے آہنی سلاخوں کے پیچھے چوہے کی طرح مرنے کے لیے جنم نہ دیا تھا۔ موت آئی بھی' تو آزادی کی راہ پر آئے گی۔''

یہ سن کر اسے بولنے کا حوصلہ نہ ہوا۔

جمعرات کو مجھے پھر ملاقاتی کمرے میں طلب کیا گیا۔ تہیہ کر کے گیا تھا کہ اگر کسی نے الٹی سیدھی بات کی تو اس کی خوب خبر لوں گا' چاہے بعد میں میری سزا اس سے بھی سخت کر دیں۔ ظاہر ہے مجھے گولی مارنے سے تو رہے' کیونکہ فرانسیسی حکومت کو وہ لکھ کر دے چکے تھے کہ ان کے قیدی کولمبیا میں زیر حراست ہیں۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

میں نے دیکھا' گرجے میں میرا انتظار ایک خوش پوش شخص کر رہا ہے۔ میں نے تیکھی نظریں اس پر ڈالیں۔ وہ ڈیگا سے ملتا جلتا تھا۔

''کیا تم پیپلن ہو؟''

''ہاں''

''میں تمہارا ایک ہمدرد ہوں۔ میرا نام جوزف ہے اور ڈیگا کا سگا بھائی ہوں۔ اخباروں میں تمہاری گرفتاری اور پھر اس جیل میں نظر بندی کا حال پڑھا' تو تم سے ملنے چلا آیا۔''

ڈیگا کے نام پر میرے دل میں جذبات کا ایک طوفان اٹھا اور میں نے نرمی سے جواب دیا! ''شکریہ۔''

میں نے اسے تفصیل سے بتایا کہ ہسپتال سے رخصت ہونے کے دن تک ڈیگا پر کیا بیتی۔ یہ سن کر تھوڑی دیر تک وہ خلاؤں میں گھورتا رہا' پھر اچانک اس کا لہجہ بدل گیا اور وہ کاروباری انداز میں بات کرنے لگا۔ میں سن تو رہا تھا' لیکن اندر ہی اندر کھول رہا تھا کہ ڈیگا کا بھائی کس قدر مختلف انسان نکلا' مفاد پرست' حریص اور بلیک میلر۔ بہرحال جوزف نامی یہ جو شخص بھی تھا' مجھ سے کہنے لگا: ''بیرن کولا میں درجن بھر فرانسیسی باشندے ہیں۔ وہ اپنی عورتوں کے ساتھ قسمت آزمائی کے لیے یہاں آئے ہیں۔ یہ سب کی سب پیشہ ور عورتیں ہیں۔''

میں اپنے فرانسیسی ہونے پر نادم تھا' مجرم میں ضرور تھا' مگر اخلاق باختگی اور بے حیائی کو ایک نظر نہ دیکھ سکتا تھا۔ اس سے آگے جوزف نے جو کچھ کہا وہ اور بھی تحیر خیز ہے۔ اس نے کہا: ''ان عورتوں کے کاروبار کو اب سخت خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔'' میں چونک سا گیا' لیکن اس نے میرے چہرے کے تاثرات سے اغماض برتتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی: ''انہیں بیرن کولا کی جیل میں تمہاری نظر بندی سے خدشہ ہے کہ کہیں ان کا کاروبار مندانہ پڑ جائے۔ اگر تم میں سے کوئی ایک بھی جیل سے بھاگ نکلا' تو ظاہر ہے کہ مقامی پولیس (اور شاید بعد میں تجربہ کار فرانسیسی پولیس) اس کی تلاش کے لیے شہر میں فرانسیسی آبادی ہی کی تلاشی لے گی۔ وہ ان طوائفوں کے بالاخانوں میں جا گھسیں گے اور ہر راز ان کے سامنے کھل جائے گا۔ جعلی نام' متروک پاسپورٹ' بدنام' جواری' سب کے سب دھرے جائیں گے۔ یہ صورت حال کسی طرح بھی خوش آئند نہیں اور اس کا تصور ہی ان کے سکون کو برباد کر رہا ہے۔''

اب میں سمجھا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ میں اس شخص کی جرات اور دلیری پر متعجب تھا۔

''جیل کے اندر تمہیں جس چیز کی ضرورت پڑے' ہم چشم زدن میں مہیا کر دیں گے' مگر خدا کے لیے کبھی یہاں سے فرار ہونے کے متعلق نہ سوچنا۔''

ملاقات ختم ہوئی' مجھے پنجرے میں بھیج دیا گیا۔

''دوستو' کیا یاد رکھو گے' میں تمہارے لیے ایک خبر لایا ہوں۔''

''کیا خبر ہے؟'' سب نے ایک ساتھ چیخ کر کہا۔

''دیکھو اب اس میں کوئی شک نہیں رہا کہ ہمیں فرانس کے حوالے کیا جا رہا ہے۔ ایک خاص کشتی فرنچ گیانا سے ہمیں لینے آ رہی ہے۔ ہماری یہاں موجودگی بعض لوگوں کے کاروبار میں گڑبڑ پیدا کر رہی ہے۔ شہر میں کچھ طوائفیں..... فرانسیسی طوائفیں ہمارے فرار سے سخت خائف ہیں۔''

وہ سب قہقہہ مار کر ہنس دیے۔ وہ میری بات کو مذاق سمجھتے تھے۔

ہمارے یارڈ میں کوئی ایک سو کمبین قیدی تھے۔ ظاہر ہے وہ احمق نہ تھے کہ یونہی شوقیہ جیل کی ہوا کھانے چلے آئے ہوں۔ ان میں چور' اچکے' قاتل' نقب زن' بدنام اسمگلر بھی تھے اور مزے کی بات یہ کہ ہر رنگ اور نسل کے بھی۔ سیاہ فام افریقی' گندم گوں بھارتی اور سفید فام یورپی۔ میں نے ان کے رجحانات کا مطالعہ کیا۔ اکثر میری طرح فرار کے منصوبے بناتے رہتے تھے۔ یہاں یا تو وہ کوئی سزا کاٹ رہے تھے یا سزا پانے کے انتظار میں گل سڑ رہے تھے۔

جیل کی چار دیواری پر رات کے وقت طاقت ور بلب روشن رہتے۔ ہر کونے میں ٹاور پر ایک ایک سنتری چوکس کھڑا ہوتا اور گرجے کے دروازے کے قریب یارڈ میں ایک اور سنتری متعین تھا جو غیر مسلح ہوتا۔ قیدیوں کے کھانے کے لیے وافر چیزیں تھیں اور وہ ان کے بدلے میں باہر سے آنے والے چھابڑی فروشوں سے کافی' فروٹ جوس' سنگترے اور انناس حاصل کر لیتے۔ آئے دن کوئی چھابڑی والا کسی قیدی کی چالاکی کا نشانہ بن جاتا' اس سے پہلے کہ اس غریب کو کچھ علم ہوتا' اس کے منہ پر کس کر رومال باندھ دیا جاتا اور پھر اس کے چیخنے چلانے سے پہلے اس کی گردن میں چاقو پیوست ہو چکا ہوتا' ادھر اس کی شہ رگ سے خون کا فوارہ ابلتا' ادھر اس کی چھابڑی لٹ چکی ہوتی۔

ایک روز دو کمبین چور میرے پاس ایک تجویز لے کر آئے۔ میں نے بڑے غور سے ان کی بات سنی۔ انہوں نے کہا کہ شہر میں بعض پولیس والے ایسے بھی ہیں جو خود چوری میں

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ملوث ہیں۔ جس علاقے میں ان کی ڈیوٹی لگتی ہے' وہ اپنے ساتھیوں کو اشارہ کر دیتے ہیں اور کسی کے گھر کا صفایا کر دیا جاتا ہے۔

میرے ملاقاتیوں نے بتایا کہ اس گروہ سے ان کی گاڑھی چھنتی ہے۔ اور اگر کسی روز ان پولیس والوں میں سے کسی ایک کی ڈیوٹی گرجے کے دروازے پر پہرہ دینے کے لیے لگی' تو میں اچانک پستول سے ڈرا دھمکا کر اسے دبوچ لوں۔ سپاہی تھوڑی سے مزاحمت کے بعد ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دے گا۔ پھر بیرک میں موجود سنتریوں کو خوفزدہ کرنے میں زیادہ دیر نہ لگے گی۔ ایک بار باہر گلی میں پہنچ گئے' تو ٹریفک میں غائب ہو جانا آسان ہے۔

مجھے یہ اسکیم پسند نہ آئی۔ فرض کیجیے اگر بیرک میں کسی سپاہی نے ہنگامہ کھڑا کر دیا' تو میں کم از کم اسے برداشت نہ کر سکوں گا اور یوں مفت میں وہ غریب جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔

اس سے یہ تو ظاہر ہو گیا کہ صرف میں ہی فرار کے منصوبے نہ بنا رہا تھا' مگر میرے اور دوسرے لوگوں میں فرق ضرور تھا' کیونکہ چند دن بعد میرے دوست کہنے لگے کہ جو کشتی ہمیں لینے کے لیے فرنچ گیانا سے آ رہی ہے' وہ ضرور اب بندرگاہ میں پہنچنے والی ہو گی' ان لوگوں کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ذہنی طور پر ہتھیار ڈالے بیٹھے ہیں..... انہوں نے ان سزاؤں کے بارے میں بھی قیاس کے گھوڑے دوڑانے شروع کر دیے جو فرنچ گیانا میں واپس جا کر ان کو مل سکتی تھیں۔

میں ایسی بزدلی اور کم ہمتی کی باتیں کیسے برداشت کر سکتا تھا: ''میرے سامنے اس قسم کے مستقبل کے اندازے مت قائم کرو۔ یوں لگتا ہے تمہاری ہڈیوں کا گودا پگھل چکا ہے..... اگر تمہاری ہمت جواب دے گئی ہے' تو صاف صاف بتا دو' کیونکہ میں جب فرار کی بات کرتا ہوں' تو میرے منصوبے میں تم سب شریک ہوتے ہو۔ یہ نہ ہو کہ وقت آنے پر کوئی پھسل جائے اور باقی سب کا بیڑا غرق کر دے۔ ایک بات اور کان کھول کر سن لو جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میرے لیے معاملہ آسان ہے۔ جونہی مجھے خبر ملی کہ کشتی' بندرگاہ میں پہنچ گئی ہے اور میں اس وقت تک فرار نہ ہو سکا' تو فرانس جانے سے بچنے کے لیے میرے پاس ایک آسان ترکیب ہے۔ کسی ایک کومبین سپاہی کو موت کے گھاٹ اتار دوں گا' پھر مجھے اس الزام میں یہیں رکھا جائے گا۔

میری اس ڈانٹ کا خاطر خواہ اثر ہوا اور کومبین قیدیوں کو ایک اور ترکیب سوجھ گئی۔ ہر

اتوار گرجے میں عبادت کا اہتمام ہوتا تھا اور ملاقاتی اس میں شرکت کرتے' عبادت کے بعد وہ لوگ ٹھہر جاتے جن کے ملاقاتی آئے ہوتے۔ مجھے کہا گیا کہ میں آئندہ اتوار گرجے میں جا کر وہاں کی صورت حال کا جائزہ لوں تاکہ اس سے اگلے اتوار ہم کسی ایکشن کی تفصیلات طے کر کے اسے روبہ عمل لا سکیں۔

بڑی سوچ بچار کے بعد یہ طے پایا کہ سازش میں شریک چاروں افراد عبادت میں شریک ہونے کے لیے جائیں گے۔ گرجا مثلث شکل کا ہے۔ دونوں جانب ایک ایک دروازہ ہر یارڈ کی طرف کھلتا ہے اور مرکزی دروازہ گارڈ روم میں۔ یہاں صرف سلاخیں راستہ روک سکتی تھیں' سلاخوں کے پیچھے وارڈر رہائش پذیر تھے۔ ان کے کوارٹروں سے ایک دروازہ باہر گلی میں کھلتا تھا۔ چونکہ عبادت کے وقت گرجا بھرا ہوا ہوتا' اس لیے گارڈ روم کا سلاخوں والا دروازہ کھول دیا جاتا اور وارڈر وہاں نگرانی کے لیے کھڑے ہو جاتے۔ ہمارا منصوبہ یہ تھا کہ باہر سے ملاقاتی آتے' ان کے ساتھ کچھ عورتیں ہوتیں جو کمال ہوشیاری سے اسلحہ چھپا کر اندر لے آتیں۔ 35 اور 45 کے صرف دو پستول کافی رہتے۔ سازش کے سرغنے کو یہ اسلحہ دے کر عورتیں فوراً واپس چلی جاتیں۔ عین اس وقت جب وعظ کی گھنٹی بجتی' ہم سب اکٹھے حملہ کر دیتے۔ مجھے گورنر کی گردن پر چاقو رکھ کر فرانسیسی میں اسے یہ حکم دینا تھا: ''ہمیں یہاں سے نکلنے کی اجازت دو' ورنہ تمہاری شہ رگ کاٹ دی جائے گی۔''

یہی ڈرامہ ایک اور آدمی کو پادری کے ساتھ دہرانا تھا۔ تین اور آدمی مختلف زاویوں سے اپنی رائفلیں' سلاخ دار دروازے میں قطار اندر قطار کھڑے وارڈروں کی طرف پھیر دیں گے۔ جو وارڈر ہتھیار نہ ڈالے گا' اسے آناً فاناً گولی سے اڑا دیا جائے گا' پھر ہمارے غیر مسلح ساتھی سب سے پہلے باہر نکلیں گے۔ اس اثناء میں وارڈروں کو گرجے کے اندر آنے کا حکم دیا جائے گا۔ گارڈ روم بالکل خالی ہو گا۔ اب ہم گرجے سے نکل کر گارڈ روم میں آئیں گے' سلاخ دار دروازہ بند کر کے پھر لکڑی کا بڑا دروازہ بند کر دیا جائے گا۔ پچاس گز کے فاصلے پر ایک لاری کھڑی ہو گی جو اس وقت چلے گی جب سازش کا سرغنہ بھی اس میں سوار ہو چکا ہو گا۔

بظاہر یہ منصوبہ بڑا خوش نما تھا اور فول پروف بھی۔ گرجے کے معائنے کے بعد میں نے اس کی منظوری دے دی' لیکن اس سازش کی قیادت سے انکار کر دیا۔

اگرچہ میں اوپر کہہ چکا ہوں کہ جوزف ڈیگا کی باتوں نے مجھے سخت مایوس کیا تھا' مگر بعد

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

میں میرے تمام شبہات زائل ہوگئے۔ وہ درحقیقت مدد کے لیے آیا تھا اور اس کی آئندہ روش نے اس کی تصدیق بھی کردی۔

ہماری اس سازش کی کامیابی کے لیے بھی اس نے اپنی خدمات پیش کردیں۔ وہ اتوار کو حسب معمول گرجے میں آنے کے بجائے ایک کار کو ٹیکسی کا روپ دیکر جیل کے باہر ہمارا منتظر رہے گا تاکہ ہمیں لاری میں سوار نہ ہونا پڑے۔ کومبین قیدیوں کو تو اپنے ملک ہی کے اندر روپوش ہونا تھا' مگر ہمارا معاملہ اور تھا۔ ہمیں اس ملک سے دور نکلنا تھا تاکہ پھر کسی کے ہتھے نہ چڑھ جائیں۔ اس کار کے ذریعے وہ ہمیں ایک مخصوص مقام پر پہنچادے گا' پھر ہم ہوں گے اور ہماری قسمت!!

اب پورا ہفتہ گزارنا دوبھر ہوگیا' اور اتوار کب آئے گا اور کب ہمیں دست وبازو آزمانے کا موقعہ ملے گا۔ جمعرات کو جوزف کی ایک ''عورت'' مجھے ملنے آئی۔ اس نے بتایا کہ ٹیکسی زرد رنگ کی ہوگی اور ہمیں اس کی تلاش میں ناکام نہیں رہنا چاہیے پھر اس نے مجھے گرم جوشی سے خدا حافظ کہا۔ میں سمجھتا ہوں فاحشہ ہونے کے باوجود اس کے اندر فرانسیسی سپرٹ موجزن تھی اور وہ اپنے ایک ہم وطن کو دیار غیر میں قید سے رہائی دلانے کے لیے ہر بازی لگانے کو تیار تھی۔

✣ ✣ ✱ ✣ ✣

''آؤ! آؤ! خداوند خدا کا مقدس کلام سننے کے لیے آؤ۔'' پادری کہہ رہا تھا۔

جان کلاز کے لیے اپنے آپ پر قابو پانا مشکل ہورہا تھا' ماترو کی آنکھوں میں چمک تھی۔ میں نے بڑے سکون سے اپنی جگہ سنبھالی۔ گورنر ژان گریگوریو ایک موٹی عورت کے پہلو میں کرسی پر براجمان تھا۔ میں' دیوار کے سہارے کھڑا تھا' کلاز میرے دائیں طرف اور دو آدمی بائیں جانب پوزیشن سنبھالے ہوئے تھے۔ ہم نے ایسے کپڑے پہن رکھے تھے کہ جیل سے باہر دوسرے لوگوں میں پہچانے نہ جاسکیں۔ میں نے اپنا چاقو داہنے بازو کی آستین میں نیچے چھپایا ہوا تھا۔ گھنٹی بجانے والے لڑکے کی دوسری ضرب ہمارے ایکشن کا سگنل تھا۔ اس وقت سب لوگ یوں جھکے ہوتے ہیں جیسے نیچے کچھ تلاش کررہے ہوں۔ سازش میں شریک ہر شخص جانتا تھا کہ اسے کیا کام کرنا ہے۔

پہلی گھنٹی..... میں نے لمبا سانس کھینچا..... دوسری گھنٹی..... میں اچھل کر گریگوریو کی گردن پر سوار ہوگیا۔ چاقو زن سے نکال کر اس کی شہ رگ پر رکھ دیا۔ اس اثناء میں پادری بھی

اسی طرح نرغے میں لیا جاچکا تھا۔ اس نے چیخ کر کہا: ''مجھ پر رحم کرو اور میری جان مت لو۔'' باقی تینوں ساتھیوں نے وارڈروں کو ہتھیار ڈالنے کا حکم دیا۔ ہر کام' منصوبے کے مطابق انجام پارہا تھا۔ کامیابی کی منزل قریب تھی۔ آزادفضاؤں کی بھینی خوشبو کا احساس سرور انگیز تھا۔ میں نے گورنر کو کالر سے پکڑ کر سیدھا کیا۔ ''میرے پیچھے آؤ' ڈرو مت' تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچاؤں گا۔''

پادری کو بھی اسی جگہ پہنچادیا گیا تھا جہاں ہم نے انہیں رسیوں سے باندھ کر ڈال دینا تھا۔ فرنانڈو نے جوش مسرت سے کہا: ''فرانسیسیو' آؤ باہر نکلیں۔''

کامیابی کے نشے میں چور میں سب لوگوں کو گلی میں باہر نکال رہا تھا۔ اچانک کسی طرف سے دو رائفلیں چلیں۔ فرنانڈو گھائل ہوکر گر پڑا۔ ایک اور آدمی بھی زخمی ہوگیا۔ میں اب بھی لوگوں کو باہر کی طرف دھکیل رہا تھا' مگر وارڈر سنبھل چکے تھے اور انہوں نے دوبارہ رائفلیں پکڑ کر ہمارا راستہ روک دیا۔ خوش قسمتی سے کچھ عورتیں ہمارے سامنے تھیں' اس لیے وہ فائر نہ کرسکے' ورنہ موسیو ہنری پیپلن کو اپنی کتھا سنانے کا موقع نہ ملتا۔ اس دوران میں ہمارا تیسرا آدمی بھی مارا گیا۔ اس نے فائر کی کوشش کی تھی اور بس یہی تیر مار سکا کہ ایک عورت زخمی ہوگئی۔ ڈان گریگوریو کا چہرہ موت کی طرح زرد تھا' ہاتھ پر رعشہ طاری تھا۔ اس نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا: ''چاقو مجھے دے دو۔'' میں نے خاموشی سے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ اب بھلا اس کی ضرورت بھی کیا رہ گئی تھی۔ صرف تیس سیکنڈ کے اندر معاملہ بگڑ چکا تھا۔

✣ ✣ ✱ ✣ ✣

میں نے سوچا' اس نظام میں سے میں ضرور کوئی خلا تلاش کرنے میں کامیاب ہوجاؤں گا۔ میں نے یہ بھی معلوم کرلیا کہ ٹاور کے ساتھ رسی سے ایک ٹین لٹکتا رہتا ہے۔ جب کبھی سنتری کو کسی چیز کی ضرورت پڑتی ہے وہ کینٹین والے کو آواز دیتا ہے اور کوئی بیرا اس کی مطلوبہ چیز ٹین میں ڈال دیتا ہے۔ سنتری رسی کو اوپر کھینچ لیتا ہے۔ مزید براں میں نے یہ بھی اندازہ لگایا کہ ہمارے یارڈ کے قریب جو ٹاور واقع ہے' اس پر یارڈ کی چھت سے کود کر چڑھا جاسکتا ہے۔ یارڈ کی چھت پر چڑھنا آسان تھا' کیونکہ کبھی کبھار قیدی دن کے وقت چھتوں کی لپائی کے لیے اوپر کام پر مامور کیے جاتے تھے' مگر سنتری کو قابو کیسے کیا جائے؟

ہمیں جوزف کے ذریعے فرانسیسی کافی ملتی رہتی تھی' اس کا اپنا ایک مزہ ہے اور جیل کے اندر کوئی قیدی' وارڈر یا سنتری ایسا نہ تھا جس نے اس کا ذائقہ نہ چکھا ہو۔ سنتریوں کی تو

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

عادت ہوگئی تھی کہ وہ تھکن سے نڈھال ہوکر ہر چار گھنٹے بعد ''فرنچ کافی'' کا نعرہ لگاتے۔ ہم کافی تیار کرکے وارڈر کو دیتے اور وہ سنتری کے ٹین میں ڈال دیتا۔ دفعتاً ایک چمک پردہ دماغ پر ابھری۔ کیوں نہ کافی میں کوئی نشہ پلا کر سنتری کو بے ہوش کرکے اپنا الوسیدھا کیا جائے۔ تجویز قابل عمل تھی اور میں نے جوزف سے کسی نشہ آور دوا کی فرمائش کر ڈالی۔ وہ اگلی ملاقات پر ایک سربمہر بوتل لے آیا۔ اس نے بتایا کہ کافی کے ایک کپ میں اس دوا کے صرف چند چمچے مناسب رہیں گے۔

بیٹھے بٹھائے ایک اور اسکیم تیار ہو چکی تھی ''زیرو آور'' کا انتظار بے تابی سے ہونے لگا۔ میرے فرانسیسی ساتھیوں نے تو میرے ساتھ فرار ہونے سے معذوری کا اظہار کر دیا' لیکن ایک کولمبین قیدی نے سینہ تان کر ساتھ چلنے کی حامی بھر لی' مجھے اس کا اصل فائدہ یہ تھا کہ دو مختلف رنگ کے ساتھی ہوں' تو فوراً دونوں پر کسی کی تشکیک بھری نظر نہیں پڑتی اور اس طرح کم از کم ایک تو گرفتاری سے بچ جاتا ہے۔

زیرو آور سے پانچ منٹ قبل میں نے بڑے پرسکون انداز میں سنتری کو آواز دی۔

''دوست'' کافی پیو گے؟''

''فرنچ کافی!'' اس مردار نے جواب میں یہ الفاظ دہرائے۔

''بس ایک منٹ ٹھہرو'' یہ کہہ کر میں کینٹین کی طرف گیا۔ وہاں سے دو پیالیوں کے لیے گرم پانی لیا۔ پھر اس میں کافی گھول دی اور جب ٹین میں اسے انڈیلنے لگا' تو نشہ آور دوا کی پوری شیشی اس میں ملا دی۔

''حرامی! سور! آج تجھے بہت مزا آئے گا' زمین و آسمان نظروں کے سامنے گردش نہ کرنے لگے تو میرا نام بھی پیپلن نہیں؟''

پانچ منٹ گزر گئے۔ دس' پندرہ' بیس' میرے دل کی دھڑکن اس وقت کوئی گننے والا ہوتا' زندگی میں ایسی گھبراہٹ کبھی طاری نہ ہوئی تھی۔ سنتری ابھی تک ہوش میں تھا۔ بس گاہے گاہے انگڑائی لے لیتا۔ پھر چوکس ہوکر چاروں طرف گھورنے لگتا۔ کیا جوزف نے میرے ساتھ دھوکا کیا؟ میں نے دل ہی دل میں اسے سو سو صلواتیں سنائیں' آخر اسے ہمدردی کے روپ میں دشمنی کمانے کی کیا ضرورت تھی؟

ایک ایک لمحہ قیمتی تھا' ٹانئے صدیوں پر پھیل گئے۔ پوری شیشی غٹا غٹ چڑھانے کے باوجود سنتری ذرا بھی نہ لڑکھڑایا تھا اور کچھ دیر بعد ایک بجے گا' تو نیا سنتری اس کی جگہ لے لے گا۔

ہماری نظریں اس پر مرکوز تھیں' ''وہ دیکھو اس کی چال میں لغزش سی آئی!'' وقت پھر رک گیا' امید کے ٹوٹے ہوئے تار کھٹ سے جڑ گئے۔ وہ نیچے بیٹھ گیا تھا۔ اس کی رائفل دونوں گھٹنوں کے درمیان تھی۔ سر کندھوں کی طرف ڈھلک گیا۔ میرے دوستوں نے بیک زبان اشارہ کیا: ''چلو شروع کرو۔''

میں نے کولمبین سے کہا کہ وہ یارڈ کی چھت پر رسی پھینکے۔ اس کے آگے درانتی نما خنجر باندھا ہوا تھا جو چھت میں دھنس جاتا اور ہم رسی کے سہارے چھت پر چڑھ کر آگے ٹاور پر کود جاتے اور پھر باہر.....

خیالات کا تانا بانا ایک چھناکے سے ٹوٹ گیا۔ کولمبین رسی پھینکنے میں ماہر تھا اور ابھی اس کے بل کھول ہی رہا تھا کہ سنتری پھر کھڑا ہو گیا۔ رائفل اس نے پھینک دی تھی اور یوں بازو پھیلایا جیسے گھڑی پر وقت دیکھ رہا ہو۔ میرا کولمبین ساتھی بروقت رک گیا۔

ڈیوٹی بدلنے میں صرف اٹھارہ منٹ باقی تھے۔ اب میں نے پہلی بار پورے خلوص سے دعا مانگی: ''خدایا! صرف ایک بار مدد کر' میں التجا کرتا ہوں کہ مجھے تنہا نہ چھوڑ۔'' لیکن یہ سب کچھ بے سود تھا' کیونکہ میں عیسائیوں کے خدا کو پکار رہا تھا اور خود ایک دہریہ تھا' کسی بھی برتر ہستی کے وجود کا منکر۔ اب چودہ طبق روشن ہوئے اور میں نے سوچا کہ زندگی میں ایسے کٹھن مرحلے بھی آتے ہیں جب تمام دنیوی سہارے ناکام ثابت ہوتے ہیں اور انسان کسی مافوق الفطرت سہارے کی تلاش کرتا ہے۔

جان کلازنے میرے قریب آتے ہوئے کہا: ''یہ تو ناقابل یقین ڈرامہ ہے۔ یہ حرامی ابھی تک بے ہوش ہوکر گرا کیوں نہیں؟ کیا ہم کوئی ڈراؤنا خواب تو نہیں دیکھ رہے ہیں۔

سنتری' رائفل اٹھانے کے لیے جھکا اور ساتھ ہی وہ دھم سے ٹاور کے فرش پر گر پڑا۔ دھڑکتے دلوں کو ایک بار پھر سکون نصیب ہوا۔ کولمبین پلک جھپکتے میں حرکت میں آ گیا۔ اس نے رسی چھت کی طرف پھینکی۔ پہلی بار درانتی نما اوزار چھت میں نہ گھس سکا۔ دوسری کوشش کامیاب ثابت ہوئی۔ اس نے زور لگا کر اس کو آزمایا کہ کس قدر بوجھ سہار سکتی ہے۔

میں نے رسی کے سہارے پہلا قدم دیوار پر رکھا ہی تھا کہ جان کلازنے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ''خبردار نیا سنتری آنے والا ہے۔'' میں نے اس کی کوئی پروانہ کی' کیونکہ اب بھی باہر نکلنے کا وقت موجود تھا' مگر نیا سنتری گارڈ روم سے نکل کر ٹاور کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میرے ساتھیوں نے ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے مجھے اپنے گھیرے میں لے لیا تاکہ

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

دور سے سنتری کو کچھ اندازہ نہ ہو کہ کیا ہو رہا ہے' مگر اس دوران میں سنتری کی نظر چھت سے لٹکتے ہوئے رسے پر پڑ چکی تھی۔ اس نے دوڑ کر الارم بجا دیا۔ اس نے یہ سوچا تھا کہ شاید کوئی شخص بھاگ نکلا ہے۔ معاً سارا نقشہ بدل کر رہ گیا۔ شکاری کتوں کی طرح چاروں طرف سے سنتری اور وارڈر ہماری طرف لپکے۔ میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر ایک جھٹکے سے رسی کو نیچے کھینچا اور درانتی نما اوزار لے کر کھڑا ہو گیا۔ ایک وارڈر نے مجھے غصے سے دیکھ کر کہا:

''غلیظ کیڑے! تجھے شرم نہیں آتی' بھاگتا ہے' پکڑا جاتا ہے' پھر بھاگتا ہے..... حرامی!''

میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ اپنی درانتی گھما کر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں چبھو دی۔ وہ تکلیف کی شدت سے بلبلا اٹھا جیسے جنگلی سور پھندے میں پھنس کر ڈکراتا ہے۔ پھر اس کی گردن دبوچ لی اور پیچھے کی طرف گھما کر اس کی ایڑیوں سے ملا دی۔ زور کا کڑاکا سنائی دیا اور اس کی پشت کی ہڈی جگہ جگہ سے ٹوٹ گئی۔

یہ دیکھ کر تین سنتریوں نے رائفلوں کی سنگینیں میرے سر کے ساتھ لگا دیں۔ نیلگوں فضاء میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگی..... میں کسی آبشار کے نیچے کھڑا تھا..... کپڑے تربتر ہو رہے تھے..... مگر نہانے کے باوجود جسم دہک کیوں رہا ہے..... فضا کا رنگ بدل گیا..... سرخ آندھی..... اور پھر خون کی بو..... مجھے کچھ پتہ نہ تھا' کہ کیا ہو رہا ہے۔

جب میری آنکھ کھلی تو سر پٹیوں سے بندھا ہوا پایا۔ میں نہ تو پنجرے میں بند تھا' نہ بلیک ہول میں' بلکہ یہ کوئی نئی جگہ تھی۔ میں نے اپنے گرد ٹٹولنے کی کوشش کی' مگر ہاتھ چند انچ سے آگے بھی نہ بڑھے۔ میرے خدا! یہ تو تابوت ہے' کیا مجھے مردہ سمجھ کر قبر میں دفن کر دیا گیا ہے؟ میں جاگتا ہوں یا خواب دیکھ رہا ہوں؟ گھپ اندھیرا' نہ آہٹ' نہ ہوا کا جھونکا.....

''پیپلن پیارے'' میں نے اپنے آپ سے کہا: ''یہ واقعی قبر ہے بچو! اب فرشتوں کو حساب کتاب دینے کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

ایک کھڑاک سا ہوا جیسے بھاری گرز زور سے فرش پر ٹکرایا ہو۔ ''حساب لینے والے آ رہے ہیں۔'' .....ایک ضرب تابوت پر پڑی۔ میرے کانوں کے پردے تھرتھرا اٹھے۔ ڈھکنا کھلا اور میری نظریں اس ہیولے پر چند ثانیوں کے لیے بھی نہ جم سکیں جو سامنے کھڑا تھا' چہرے پر سیاہ نقاب' سر پر خوفناک سینگ' پورے جسم پر خنجریں باندھے ہوئے جیسے تھوہر کے پودے پر کانٹے اگے ہوں' ایسے شخص کو آدمی مکہ بھی لگانا چاہے' تو خود اپنا ہی نقصان!

اس نے گرج کر مجھے اٹھنے کا حکم دیا۔ میں نے دل میں کہا: ''بہت دیکھے ہیں تیرے جیسے

سورما''

''میرے آگے آگے چلو۔''

''کیوں؟ کہاں لے جانے کا ارادہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ابھی پتہ چل جائے گا۔''

وہ ہانکتا ہوا مجھے گرجے میں لے آیا۔ معلوم ہوا کہ کولمبیا کے قانون کے مطابق مجھے اپنے جرم کی سزا یہ ملی ہے کہ میرا قیمہ کر دیا جائے اور یہ شخص مجھے سب کے سامنے لٹا کر مجھ سے ٹکرانا شروع کر دے گا۔ یہاں تک کہ تیز دھار خنجروں سے میری تکا بوٹی ہو جائے۔

میرے قتل کی جو بھی تقریب منعقد تھی' اس کا نظارہ کرنے کے لیے سب قیدیوں کو شرکت کی دعوت دی گئی..... سب کے درمیان ایک کرسی پر گورنر براجمان تھا' مگر خلاف معمول اس کے چہرے پر غم کی پرچھائیں تھیں۔ اس نے نقاب پوش کو حرکت میں آنے کا حکم دیا' مگر اس سے پہلے کہ وہ قصائی کا بچہ میرے نزدیک بھی پھٹکتا' گورنر اپنی کرسی سے اچھلا اور میرے سامنے ڈھال بن کر کھڑا ہو گیا۔ نقاب پوش جلاد صفت شخص اپنے زور میں آگے بڑھتا رہا اور بیک وقت چار پانچ خنجر گورنر کے پہلو میں اتر گئے۔ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ یہ بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی کہ اس جیل کا سارا حفاظتی عملہ فرانس کا تنخواہ یافتہ تھا اور یہاں کے مقامی لوگ انہیں اپنے شمار نہ کرتے تھے' اسی بنا پر کولمبین قیدی اس نقاب پوش پر ٹوٹ پڑے۔ وہ شور اٹھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔ اگرچہ کچھ قیدی بھی زخمی ہو گئے' مگر بالآخر نقاب پوش پر قابو پا لیا گیا اور رسیوں سے جکڑ کر اسے ایک کونے میں پھینک دیا گیا۔

اس ہنگامے میں معلوم نہیں کس کس کو کہاں کہاں زخم لگا' مگر میں واحد شخص تھا جو ذرا سی خراش سے بھی محفوظ رہا' حالانکہ اس وقت تک میرا قتلہ ہو جانا چاہیے تھا۔

میرے ساتھیوں نے مجھے موت کے جبڑوں سے زندہ سلامت بچ نکلنے پر مبارک باد دی۔ اگرچہ ہمیں گورنر کے زخمی ہونے کا افسوس تھا' لیکن اب ہم اپنی جگہ مطمئن تھے کہ کم از کم ایک بااختیار ہستی کا دل تو ہماری طرف مائل ہے۔

جس شخص کو میں نے دوا پلا کر بے ہوش کیا تھا' وہ تین دن اور چار راتیں بے سدھ پڑا رہا۔ ہوش میں آنے کے بعد اس نے خاص طور پر میرا نام لے کر شکایت کی تھی کہ اسے نشہ آور دوا پلانے کا ذمہ دار میں ہوں۔ اسی کی شکایت پر مجھے پہلے تابوت میں بند کر کے کسی تنگ

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

وتاریک کوٹھڑی میں ڈالا گیا' پھر ایک سنتری کے قتل کے جرم میں خود میری موت کا فیصلہ ہوا' مگر تقدیر ایسے فیصلوں پر کئی بار ہنس چکی تھی' میرا بال بھی بیکا نہ ہوا۔

ہم جیل کی کال کوٹھڑی میں ایک بار پھر گلنے سڑنے لگے۔ ہمیں خدشہ تھا کہ زیادہ دیر تک یہاں رہے' تو فرنچ گیانا سے آنے والی کشتی سے نہ بچ سکیں گے' بلکہ اس سے بھی پہلے یہاں کوئی سنتری انتقام کی آگ بجھانے کے لیے ہمیں گولی کا نشانہ بنا دے۔ میں نے دیس دیس کی جیلوں کی ہوا کھائی ہے' مگر جس قدر بدمزاج' اکھڑ اور خود پسند بیرن کولا میں دیکھے ویسے کہیں اور نظر نہیں آئے۔ انہیں کولمبیا کے گورنر کی کوئی پروا نہ تھی اور میرا خیال ہے وہ اپنے حقیقی ماں باپ کی بھی کوئی قدر نہ کرتے تھے۔

اس خیال سے ہم نے یہاں سے جلد از جلد نکلنا مناسب سمجھا' مگر نکلتے تو کیونکر؟ جوزف ڈیگا نے مشورہ دیا کہ اب کے جیل کے اندر سے کوشش کرنے کے بجائے وہ رات کے وقت باہر سے نقب لگا کر ہمیں آزاد کرائیں گے' مگر مجھے اس کے خیال سے اتفاق نہ تھا' کیونکہ رات کو چار دیواری بقعہ نور کا منظر پیش کرتی تھی۔ اس پر اسے ایک اور خیال سوجھا: ''کیوں نہ بجلی کی رو بند کر دی جائے۔'' اس نے ایک ایسا الیکٹریشن تلاش کر لیا جس نے جیل کے باہر لگے ہوئے ٹرانسفارمر سے بجلی بند کرنے کی ہامی بھر لی۔

میرے ذمے یہ کام تھا کہ گرجے کے سامنے اور گلی میں متعین سنتری کو خرید لوں۔ بادی النظر میں یہ کام آسان تھا' مگر عملی شکل میں کئی پیچیدگیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ سب سے پہلے میں نے گورنر ڈان گریگوریو کو اس امر پر آمادہ کیا کہ وہ میری رقم سے دس ہزار پیسو دے دے۔ اس نے پوچھا: ''اس کا کیا کرو گے؟'' میں نے جھوٹ سے کام لیتے ہوئے کہا: ''جوزف کے ہاتھ اپنی بیوی کے لیے بھیجنا چاہتا ہوں۔ نہ جانے میری طویل غیر حاضری میں وہ بے چاری کس کس در کی خاک چھانتی پھرتی ہوگی!''

گورنر کا دل بھر آیا' مگر مکمل طور پر رام کرنے کے لیے سب سے پہلے دو ہزار پیسو اسے دینے پڑے تاکہ وہ اپنی بیوی کے لیے کوئی تحفہ خرید سکے۔ آخر میں اپنی بیوی کی بھلائی کے لیے سوچ سکتا تھا' تو اسے بھی لازماً اپنی بیوی کا خیال آنا ہی تھا۔ اس کے بعد جب سنتریوں کے کمانڈر سے میری بات ہوئی' تو اس نے بھی بھاری نذرانہ وصول کیا۔ یہی نہیں' بلکہ اس نے متعلقہ دونوں سنتریوں کو خود کہنے سے بھی انکار کر دیا۔ تین ہزار کی رقم کمانڈر کی جیب میں چلی گئی۔ باقی رقم میں نے دونوں سنتریوں کو آدھی آدھی دینے کا وعدہ کیا' مگر انہیں ملے گی تب

جب ہم باہر نکل چکے ہوں گے۔ اس منصوبے کی ابتدائی تیاریوں میں ایک ماہ لگ گیا۔ ایک ایک دن پہاڑ لگ رہا تھا' مگر بغیر تیاری کے چڑھ نکلنا بھی تو موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔

ہمیں گرجے کے قریب متعین سنتری سے اب کوئی خوف نہ تھا۔ چنانچہ ایک آرے کی مدد سے اپنے پنجرے کی سلاخیں خود کاٹتا تھیں۔ دوسروں تک اس کی آواز جانے سے روکنے کے لیے ہمارا ایک ساتھی پاگل بن گیا اور اس نے کئی دن پہلے ہی سے اس جنون میں پیپے بجانے شروع کر دیے۔ قیدیوں اور جیل کے عملے نے ہزار ہا احتجاج کیا' مگر وہ اپنی ہٹ سے باز نہ آیا۔ پھر ہمیں پہلے کی طرح رسے کی مدد سے چھت پر چڑھ کر ٹاور پر آگے کودنا تھا۔ پھر گلی میں چھلانگ لگانے کے بعد جوزف ہمیں باحفاظت کسی منزل تک پہنچا دیتا۔ گلی میں متعین سنتری نے صرف دو آدمیوں کے فرار کی اجازت دی تھی۔ ''اس نے کہا تھا کہ وقفے وقفے سے دونوں آدمی فرار ہوں کہ بیک وقت دونوں کے اکٹھے بھاگنے سے اسے کچھ اندازہ نہیں ہوگا کہ کتنے آدمی نکل رہے ہیں۔ ناچار ماترو اور جان کلاز کے درمیان قرعہ ڈالا گیا اور کلاز جیت گیا۔ اندھیری راتیں شروع ہو چکی تھیں' مقررہ رات ٹھیک وقت پر جیل کی بتیاں گل ہو گئیں۔ ہم نے سلاخیں کاٹنا شروع کر دیں۔ دس منٹ کے اندر ہم اپنے پنجرے سے باہر کھڑے تھے۔ ایک کولمبین قیدی نے چھت پر رسہ پھینکا' میں اس کی مدد سے اوپر چڑھا اور پھر اچھل کر چار دیواری پر پہنچ گیا۔ وہاں مجھے جان کلاز کا انتظار کرنا تھا' ہر طرف گھپ اندھیرا تھا' اچانک مجھے محسوس ہوا کہ ایک ہاتھ میری طرف بڑھ رہا ہے' پھر کراہنے کی آواز آئی' خطرے کی بو سونگھتے ہوئے میں نے تھوڑا سا آگے کو جھک کر ہاتھ تھام لیا' یوں لگتا تھا کہ جان کلاز خاردار تاروں میں الجھ گیا ہے' میں نے اسے جس قدر اپنی طرف کھینچا' وہ بے چارہ اسی شدت سے کلبلانے لگا' کانٹے اس کے جسم کو لہولہان کر رہے تھے' ہم دونوں نے سیاہ لباس پہن رکھا تھا' مگر سنتریوں کے علم میں لائے بغیر کولمبین قیدی کو بھی ساتھ ہی نکالا تھا' اس لیے وہ بالکل الف ننگا ہمارے پیچھے چلا آیا۔ خاصی تگ و دو کے بعد کلاز کو دیوار پر کھینچنے میں کامیابی ہو سکی۔

کوشش کے باوجود ہم شور کو روک نہ سکے۔ دوسرے ٹاوروں سے سنتریوں نے فائر کھول دیا' مگر انہیں نشانہ تو دکھائی نہ دے رہا تھا' اس لیے ہمیں ڈرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اگرچہ سڑک کی جانب بھی اندھیرا تھا' مگر تارکول کی سیاہ لکیر اس اندھیرے میں نمایاں تھی۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ہم جس مقام سے کودنے والے تھے وہاں سے دیوار کی بلندی تیس فٹ تھی حالانکہ اگر کوئی صحیح مشورہ دینے والا ہوتا' تو ایک جگہ پندرہ فٹ بلند دیوار سے بھی ہم کود سکتے تھے۔ بہرحال جونہی ہم نے چھلانگ لگائی' نتیجہ ظاہر ہوگیا۔ جان کلاز کی داہنی ٹانگ پھر ٹوٹ گئی تھی' میں بھی اپنے پاؤں پر نہ کھڑا ہوسکا کیونکہ دونوں ٹخنے چور چور ہو چکے تھے۔ کولمبین قیدی کا ایک گھٹنا ٹوٹ کر باہر جا پڑا۔

✣ ✣ ✱ ✣ ✣

سینٹ جوزف میں مجھے دوسال قید تنہائی کی سزا ملی تھی۔ عادی مجرم بھی اس جیل کو آدم خور کا نام دیتے تھے' مگر میں اس کا یہ نام غلط ثابت کر دکھانا چاہتا تھا۔ میں نے ایک بازی ضرور ہاری تھی' لیکن میرے سینے میں شکست خوردہ دل نہ تھا..... دوسال کی سزا کوئی سخت سزا نہ تھی' لیکن میں نے پہلے ہی لمحے یہ تہیہ کرلیا کہ یہاں سے فرار ہو کے رہوں گا۔ میں نے اپنے عزم کا اظہار کلاز سے کیا..... ''پیارے دوست!'' وہ بولا۔ کاش! میرے اندر بھی تمہارے ایسا ولولہ اور جوش ہوتا۔ ایک سال سے تم برابر فرار کی کوششیں کر رہے ہو' ناکامیوں کے باوجود تمہارا حوصلہ نہیں ٹوٹا۔''..... اگلے روز ہم چھبیس آدمی سوٹن وزنی کشتی' تانن' میں لاد دیے گئے۔ دو دو قیدی ایک دوسرے سے بندھے ہوئے تھے اور پیروں میں بیڑیاں تھیں۔ ہر چار قیدیوں پر ایک مسلح سنتری مسلط تھا۔ کشتی پر مکمل سکوت' بلکہ دہشت کی فضاء طاری تھی ..... خستہ سی کشتی پر ضرورت سے زیادہ بوجھ لاد دیا گیا تھا۔ میں جانتا تھا وہ معمولی سی طوفانی لہروں کا مقابلہ بھی نہ کر سکے گی۔ میں نے مذاق کے موڈ میں اپنے قریب کھڑے ہوئے سنتری سے کہا! ''تم نے ہمیں زنجیروں سے جکڑ ڈالا ہے' کشتی ڈوب گئی تو ہم اپنی جانیں بھی نہ بچا سکیں گے''..... ''تم ڈوب جاؤ یا بچے رہو' ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔'' سنتری لاپروائی سے بولا: ''ہم حکم کے غلام ہیں۔'' ایک اور سنتری قریب آتے ہوئے بولا: ''ہماری حالت تم سب سے بہتر ہے۔ یہ بھاری بھرکم بوٹ' وردی اور پیٹی' کیا یہ کچھ کم بوجھ ہے؟ رائفل تو خیر پھینک بھی سکتے ہیں' گدھے جتنا یہ بار ہمیں کب بچنے دے گا۔''

''جو کچھ بھی ہو' یہ کشتی ایک تیرتا ہوا مقبرہ ہے۔'' میں نے فقرہ چست کیا۔ بات سے بات نکلی اور سب لوگ اس بحث میں شریک ہوگئے۔ اس گفتگو سے ہمارے تنے ہوئے اعصاب قدرے آرام محسوس کرنے لگے۔

اس اثناء میں کشتی کا کپتان آ گیا۔ اس نے آتے ہی پوچھا: ''پیپلن تمہارا ہی نام ہے؟ تمہی نے دریائے برونی کا سفر بڑی کامیابی سے طے کیا تھا؟''

''ہاں موسیو!'' میں نے جواب دیا۔

''ایک ملاح ہونے کی حیثیت سے میں تمہیں مبارک باد دیتا ہوں' ان سمندروں اور دریاؤں میں کشتی رانی کے لیے دل گردے اور ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے۔'' اس نے مجھے نفیس سگریٹ تحفے میں پیش کیے۔

''شکریہ کیپٹن' میں بھی تمہیں موت کا یہ پنجرہ سمندر میں بحفاظت لیے پھرنے پر مبارک باد دیتا ہوں۔''

ایک طویل تھکا دینے والے اور خوفناک سفر کے بعد کشتی شیطانی جزائر کا چکر کاٹتی ہوئی جزیرہ سالٹ کی بندرگاہ پر جا لگی۔ اس جزیرے کے قرب و جوار میں دو اور جزیرے..... رائل اور سینٹ جوزف..... واقع ہیں۔ ان جزیروں میں صرف قیدی ہی رہتے ہیں۔ قید خانے کیا جنگلی درندوں کے پنجرے ہیں۔ میری منزل سینٹ جوزف تھی۔

جزیرہ سالٹ پر ڈیگا سے ملاقات ہوئی۔ وہ اب ان جیلوں میں ہرکارے کا کام کرتا تھا اور اتفاق دیکھیے گلگانی بھی یہیں تھا اور بندرگاہ میں کلرک کے طور پر متعین۔ یہاں بہت سے قیدی اتار لیے گئے۔ مجھے آگے بھیج دیا گیا۔ ڈیگا اور گلگانی نے میری ہمت بڑھائی ''پاپی! فکر نہ کرو' کوئی شخص تمہارا بال بیکا نہیں کرسکتا' تمہیں سگریٹ اور پھل باقاعدہ ملتے رہا کریں گے۔''

تھوڑی دیر بعد ہم سینٹ جوزف کے جہنم خانے میں داخل ہو رہے تھے۔ چار آہنی دروازوں سے گزر کر ہم انیس قیدی ایک ایسے دفتر میں پہنچے جو اس جزیرے کا گورنر ہاؤس تھا۔ ایک بھاری بھرکم شخص نے میز کے پیچھے سے سر اٹھاتے ہوئے کہا ''قیدیو! تم جانتے ہو یہ جگہ خطرناک ترین مجرموں کے لیے ہے۔ یہاں صرف ایک ضابطہ نافذ ہے جس پر سختی سے عمل کرایا جاتا ہے۔ اپنی زبان بند رکھو' مکمل خاموشی' خون کرنا خطرناک بات ہے اگر پکڑے گئے' تو سزا میں اور اضافہ ہوجائے گا۔ جب تک بیماری حد سے نہ بڑھ جائے' بیماری کا بہانہ مت ڈھونڈو' ورنہ تم عذاب کو دعوت دو گے۔ بس یہی کچھ مجھے کہنا تھا..... ہاں ایک بات یاد رکھو سگریٹ نوشی بالکل ممنوع ہے۔'' پھر وہ وارڈروں سے مخاطب ہوا: ''ان کی تلاشی لو اور الگ الگ پنجروں میں بند کردو۔ چیری' کلاز اور ماترو ایک ہی بلاک میں نہ رکھے جائیں۔''

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

دس منٹ بعد میں اے بلاک کے نمبر 234 پنجرے میں جنگلی جانور کی طرح بند پڑا تھا۔ کلازبی بلاک میں تھا اور ماتروسی بلاک میں۔ ہم نے ایک دوسرے کو خاموش نگاہوں سے خدا حافظ کہا۔ ہم اچھی طرح جانتے تھے ان لوگوں کو بس بہانے کی ضرورت ہے اور یہ ہمارا قصہ چکا دیں گے۔

میں اپنے پنجرے پر نظر ڈالتا ہوں۔ میں کبھی سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ فرانس جیسا ملک جو انسانی حقوق کا بزعم خویش علمبردار ہے' ایسے انسانیت سوز قید خانے تعمیر کر سکتا ہے۔ ڈیڑھ سو پنجرے آگے پیچھے ایک قطار میں چلے گئے ہیں۔ پنجرے میں نہ کوئی کھڑکی اور نہ روشندان بس سامنے کی دیوار میں چند انچ چوڑا سوراخ ہے جس پر مضبوط آہنی ڈھکنا دروازے کا کام دیتا ہے۔ اس ڈھکنے میں سے ایک بار قیدی کو اندر دھکیل دیں' تو پھر وہ روشنی' تازہ ہوا' ستاروں بھرے آسمان غرض دنیا و مافیہا کے تمام مناظر سے محروم ہو جاتا ہے۔ زمان و مکان اور صبح و شام کی تمیز ختم ہو جاتی ہے۔ باہر ڈھکنے کے اوپر جلی حروف میں لکھا ہے: ''حکام کی تحریری اجازت کے بغیر ڈھکنا کھولنا منع ہے!''

مجھے اندر دھکیلتے ہوئے وارڈروں نے ایک دوسرے کی طرف طنزیہ نگاہوں سے دیکھا اور پھر ایک بولا:

''موسیو پیپلن! آپ کو یہاں دو سال گزارنے ہیں' پاگل نہ ہو جایئے گا۔ اس جیل کا نام ''آدم خور'' ہے' اس کے حقیقی معنے جلد ہی آپ پر آشکارا ہو جائیں گے۔ وہ ٹھیک کہہ رہے تھے' اف! مجھے یہاں سات سو تینتیس دن یا سترہ ہزار پانچ سو بیس گھنٹے کاٹنے پڑیں گے۔

میری آنکھیں تاریکی میں دیکھنے کی عادی ہوئیں' تو چھت میں وزنی آہنی گارڈز لٹکتے ہوئے نظر آئے جو کبھی نیچے آ جاتے اور کبھی اور اوپر اٹھ جاتے۔ مجھے یاد آیا چڑیا گھر میں شیروں اور چیتوں کو رام کرنے کے لیے شروع میں اسی طرح خوفزدہ رکھا جاتا ہے۔ کبھی کبھار یہ گارڈز اس قدر نیچے آ جاتے کہ فرش کے ساتھ چپک کر جان بچانا پڑتی۔

میں نے بڑی بڑی جیلیں دیکھی ہیں' کال کوٹھڑی میں بھی رہا' ہر جگہ مظلوم قیدی کو امید ہوتی ہے کہ اس کی دلدوز چیخیں ان کوٹھڑیوں اور قید خانوں کی دیواریں چیر کر انسانی کانوں کے پردے سے جا ٹکرائیں گی۔ یہاں یہ توقع بھی جاتی رہی۔ فریاد ان دیواروں کو چیر کر نکلتی بھی' تو سمندر کی متلاطم لہروں سے سر پٹخ کر رہ جاتی۔

تین دن گزر چلے تھے۔ میں حیران تھا کہ میرے دوستوں کا وعدہ کہاں گیا! سگریٹ اور

پھل کہاں غائب ہو گئے۔ کہیں وہ مذاق تو نہیں کر رہے تھے؟ آخر خاکروب کے ذریعے میرا ان دوستوں سے رابطہ قائم ہو گیا اور مجھے ضرورت کی ہر چیز ملنے لگی۔ سگریٹ اور خشک ناریل وافر مقدار میں ملے۔ پیٹ میں کچھ گیا' تو جان میں جان آئی ایک صبح پہلی بار جیل کی پر سکوت فضاء میں دھماکہ سا ہوا۔ خاکروب جو کوڑا اٹھانے والی بالٹی میں میرے لیے ناریل لا رہا تھا' رنگے ہاتھ پکڑ لیا گیا' بس پھر کیا تھا۔ زمین و آسمان اس بے چارے کی چیخوں سے لرز اٹھے' وارڈر اس پر پل پڑے۔ وہ وار پر وار سہہ رہا تھا۔ پھر اچانک میرے پنجرے کا ڈھکنا کھلا۔ ایک وارڈر نے سر اندر کرتے ہوئے کہا: ''تم اپنی شیطنت سے باز نہیں آتے۔'' میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' اپنا خفیہ چاقو نکالا اور ایک ہی وار سے اس کی گردن کاٹ دی۔ خون کے فوارے اگلتا ہوا سر میرے قدموں میں تھا اور نیم تاریک ماحول میں یہ منظر انتہائی وحشت ناک تھا۔

اس شخص کا یہ حشر دیکھ کر کسی اور وارڈر کو پنجرے کے قریب پھٹکنے کی جرات نہ ہوئی۔ ماحول پر دہشت طاری تھی۔ بالآخر ایک شخص نے چھوٹا سا میگافون منہ کے آگے رکھتے ہوئے کہا: ''نمبر 234' میں اس جزیرے کا ڈپٹی گورنر ہوں۔ میں وعدہ کرتا ہوں آرام سے باہر نکل آؤ' تو تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچایا جائے گا۔ معمول کی انکوائری ہو گی اور اگر تم قصوروار ثابت ہوئے' تو ضابطے کے مطابق سزا دی جائے گی۔''

''اوکے'' میں باہر نکل آیا اور ڈپٹی گورنر اور چھ وارڈروں کے نرغے میں دفتر کی طرف چل دیا۔ جونہی ہم پنجروں کے بلاک سے نکل کر کھلے برآمدے میں پہنچے' میری آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ ہفتوں سے میری آنکھیں تاریکی کی عادی ہو گئی تھیں' اب پہلی بار دھوپ میں آیا' تو کچھ دیر کے لیے میری آنکھیں کھل ہی نہ سکیں۔

ہم دفتر میں داخل ہوئے۔ گورنر اپنی کرسی پر براجمان تھا۔ ڈپٹی گورنر اس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ فرش پر خون میں لت پت ایک شخص پڑا تھا۔ اس کا حلیہ بری طرح بگڑ چکا تھا' دیوار پر گھڑیال گیارہ بجا رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا غریب خاکروب چار گھنٹوں سے عذاب سہ رہا ہے۔

''چیری' تمہیں کتنے عرصے سے پھل اور سگریٹ مل رہے ہیں؟''

''اس شخص نے تمہیں بتا ہی دیا ہو گا۔''

''میں سوال تم سے کر رہا ہوں۔''

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

''جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے نسیان کا مرض لاحق ہے۔ مجھے یہ یاد نہیں کہ کل کیا ہوا تھا؟''

''بیوقوف بنانے کی کوشش مت کرو!''

''مجھے افسوس ہے کہ میری فائل میں اس مرض کا اندراج نہیں کیا گیا۔ دراصل سر پر شدید ضرب لگنے سے میں اپنی یادداشت کھو چکا ہوں۔''

''کیا تمہیں پتہ ہے کہ تم چریری ہو؟'' گورنر نے بڑھتی ہوئی حیرت سے پوچھا۔

''ہاں'' میں نے بڑے میکانکی لہجے میں جواب دیا: ''میرا نام چریری ہے میں 1906ء میں آرڈیشی میں پیدا ہوا اور مجھے پیرس میں عمر قید کی سزا ہوئی۔'' گورنر کی آنکھیں طشتری کی مانند پھیل گئیں۔ میں نے اسے بوکھلا دیا تھا۔

''کیا تمہیں آج صبح کافی اور روٹی ملی تھی؟''

''ہاں''

''کل تمہیں کونسی سبزی ملی؟''

''مجھے یاد نہیں''

''تمہارا مطلب ہے کہ تم یادداشت سے محروم ہو چکے ہو؟''

''واقعات بالکل یاد نہیں رہتے۔ صرف چہرے حافظے میں نقش ہو جاتے ہیں۔ مثلاً مجھے یہ یاد ہے کہ بس جزیرے پر تم نے ہمارا استقبال کیا تھا' مگر کب؟ معلوم نہیں!''

''تمہیں علم ہے کہ اب کتنی سزا کاٹنی ہے؟''

''جب تک مر نہیں جاتا' میرا خیال ہے یہ سزا ختم نہ ہوگی۔''

''میرا مطلب ہے قید تنہائی کتنی کاٹنی ہے؟''

''قید تنہائی؟ مجھے یہ سزا کیوں دی گئی ہے؟''

''پیپلن! بس حد ہوگئی۔ مجھے اشتعال مت دلاؤ' کیا تمہیں یہ علم نہیں فرار کے جرم میں تمہیں دو سال کی قید تنہائی کی سزا ملی ہے؟''

اور پھر میں نے جو جواب دیا وہ اسے پاگل کر دینے کے لیے کافی تھا۔

''گورنر' میں ایک ذمہ دار آدمی ہوں اور اپنے اعمال کا جواب دہ۔ ذرا اس کرسی سے اٹھ کر میرے پنجرے تک چلو' تم خود دیکھ کر اندازہ لگا لو گے کہ میں یہاں سے کیسے فرار ہوا تھا!''

گورنر نے تنگ آ کر کہا: ''تمہیں نسیان کی بیماری کب سے لاحق ہے؟''

''مجھے کچھ یاد نہیں سوائے اپنے نام اور چند ایک دوسری باتوں کے۔ رہا یہ سوال کہ مجھے کھانے پینے کی چیزیں کب سے مل رہی ہیں' تو میرا جواب ہے شاید پہلی بار یا شاید سالہا سال سے مل رہی ہیں۔ بس میرے پاس یہی جواب ہے' تم نے جو کچھ کرنا ہے' کرتے رہو۔''

گورنر نے طیش بھرے لہجے میں کہا: ''اس شخص کو میری آنکھوں سے دور کر دو اور جب تک اس کی قید ختم نہیں ہو جاتی' اس کی روزانہ کی خوراک بند!''

میں واپس اپنے پنجرے میں آ چکا تھا۔ فرش اسی طرح خون آلود تھا۔ نہ معلوم ان لوگوں نے اس قتل کی سزا مجھے کیوں نہ دی؟ کیا گورنر میری باتوں سے بالکل بوکھلا گیا تھا؟

اسی شام دوسرا خاکروب آیا' تو اس کے ذریعے مجھے گلگانی اور ڈیگا کا یہ پیغام ملا:

''جس خاکروب کی صبح پٹائی ہوئی ہے' اس کا ہمارے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ اس نے خود ہی تمہیں چیزیں پہنچانا چاہیں کیونکہ وہ فرانس میں تمہارا کوئی جاننے پہچاننے والا ہے۔ ہماری ترسیل برابر جاری رہے گی۔ فکر مت کرو پاپی!''

اور میں حالات کی ستم ظریفی پر ہنس دیا۔ گورنر مطمئن تھا کہ اس نے خاکروب کی ٹھکائی کر کے اور میری معمول کی خوراک بند کر کے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ مجھے خدشہ تھا کہ ڈیگا اور گلگانی بھی پکڑے جائیں' لیکن میرا اندیشہ بے بنیاد تھا۔ ان کی جڑیں خاصی گہری تھیں۔

بے رنگ شب و روز گزرتے رہے اور 26 جون 1936ء کو دو سال قید تنہائی کاٹنے کے بعد ہم سینٹ جوزف سے رہا ہو گئے۔ ''آدم خور'' شکست کھا چکا تھا۔ ہمیں جزیرہ سالٹ کے ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ نقاہت' کمزوری اور پیچش سے برا حال ہوا جاتا تھا۔ کلاز کی حالت اچانک بگڑ گئی اور وہ میری آنکھوں کے سامنے دم توڑ گیا۔ جزیرے پر قبرستان نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ مُردے سمندر میں پھینک دیئے جاتے اور وہ شارکوں کا لقمہ بن جاتے۔

اپنے عزیز ترین ساتھی کی المناک موت کے بعد ہسپتال کے در و دیوار سے مجھے وحشت سی ہونے لگی۔ اس کے ولولے کس قدر جواں تھے۔ میری ہر پکار پر اس نے لبیک کہی اور کسی خوف کو خاطر میں لائے بغیر اس نے ہر فرار کی کوشش میں میرا ساتھ دیا۔ جس مقصد کے لیے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

اس نے جان دی تھی' اسے پورا کرنے کا میں نے دل میں تہیہ کرلیا۔ مرنے والے کی روح کو اسی طرح سکون مل سکتا تھا۔ فرار..... فرار' ہر وقت یہی خیال دل و دماغ پر طاری رہنے لگا۔

✣ ✣ ✱ ✣ ✣

میں جزیرہ سالٹ کے قید خانے میں بند تھا' لیکن میری نقل و حرکت پر کوئی پابندی نہ تھی۔ جزیرے کے گورنر میجر بارو نے مجھے گھومنے پھرنے کی اجازت دے رکھی تھی میرا خیال ہے یا تو وہ انتہائی رحمدل تھا یا پھر اسے یہ اطمینان تھا کہ جزیرے سے کوئی شخص آج تک فرار نہیں ہوسکا۔ وقت گزارنے کے لیے میں نے مچھلی کے شکار کا مشغلہ اپنا لیا اور کبھی کبھار اپنا شکار گورنر کی بیگم کی نذر بھی کر دیتا۔ وہ بھی اپنے خاوند کی طرح بڑی نرم دل خاتون تھی۔ ایک دن اچانک ان لوگوں کو فرانس طلب کرلیا گیا اور نیا گورنر آ گیا۔ گورنر ہاؤس میں میری آمد و رفت بند ہوگئی۔

ایک روز میں ڈھیر ساری مچھلیاں پکڑنے کے بعد گورنر ہاؤس کے پاس سے گزر رہا تھا کہ اندر سے کسی ملازم کی آواز آئی۔ ''مادام یہ رہا وہ شخص جو مادام بارو کو تازہ مچھلیاں فراہم کرتا تھا'' اور پھر کسی نے شیریں آواز میں کہا: ''تو یہ ہے پیپلن!'' پھر اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''مجھے مادام بارو نے تمہاری پکڑی ہوئی لذیذ مچھلی کھلائی تھی۔ تھوڑی دیر اندر آنے کی زحمت نہ کرو گے!''

ڈرائینگ روم میں کسی حجاب سے کام لیے بغیر اس نے تازہ مکھن' دبل روٹی اور شراب میرے سامنے رکھ دی۔ جب میں پیٹ بھر چکا' تو وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی: ''پیپلن مادام بارو نے مجھے بتایا تھا کہ پورے جزیرے پر وہی واحد خاتون تھی جسے تم مچھلیاں دیا کرتے تھے' کیا یہ نوازش میرے ساتھ بھی کرسکو گے؟''

میں حیران تھا وہ اس قدر تکلفات میں کیوں پڑی ہے؟ ایک قیدی کو کرخت لہجے میں حکم کیوں نہیں دیتی؟ بہرحال میں نے احتیاط کا دامن نہ چھوڑتے ہوئے جواب دیا: ''بات یہ ہے کہ مادام بارو بیمار تھی اور اسے مچھلی کی سخت ضرورت تھی۔ جہاں تک تمہارا تعلق ہے' تم خاصی صحت مند نظر آ رہی ہو!!''

''میں جھوٹ نہیں بول سکتی پیپلن۔ میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں' لیکن اس سے پہلے میں کسی بندرگاہ پر نہیں رہی۔ مچھلی مجھے بے حد مرغوب ہے!''

قصہ مختصر میں اسے مچھلی فراہم کرنے پر آمادہ ہوگیا۔ میں سگریٹ کے کش لگا رہا تھا کہ

گورنر اندر داخل ہوا' میں کھڑا ہوگیا' مگر مادام نے کہا ''بیٹھے رہو'' پھر شوہر سے بولی ''اسی قیدی کے بارے میں مادام بارو نے ہمیں بتایا تھا۔ یہ مجھے مچھلی لا کر دیا کرے گا۔ اس کے سوا اور کوئی شخص محل میں نہ آئے گا۔''

گورنر نے پوچھا: ''کیا نام ہے تمہارا؟''

''میرا نام پیپلن ہے۔''

گورنر اچھل پڑا۔ ''ہا! ہا! میں نے تمہارا ذکر پہلے بھی سنا ہے۔ تم وہی ہو جو سینٹ لارن کے ہسپتال سے وارڈروں کو زخمی کر کے بھاگ نکلے تھے' ان میں ایک وارڈر جسے تم موت و حیات کی کش مکش میں مبتلا کر کے چھوڑ آئے تھے' ہمارا بھتیجا تھا۔''

اس پر مادام نے زندگی سے بھرپور قہقہہ لگایا۔ ''اچھا تم وہ شخص ہو جس نے گاسٹن کی جان لی تھی۔ بہرحال اس بنا پر تمہارے ساتھ ہمارا رویہ نہیں بدلے گا۔'' یہ حقیقت مجھ پر بعد میں کھلی کہ مادام نے ایک قہقہے میں میری جان بخشی کیوں کر دی۔ دراصل گورنر کا بھتیجا گاسٹن مادام کی نظروں میں بہت کھٹکتا تھا اور اس کی موت پر اسے جو خوشی ہوئی وہ قدرتی تھی۔

گورنر ابھی تک کھڑا تھا۔ وہ مجھ سے کہنے لگا۔ ''ان جزیروں پر مقابلتاً زیادہ قتل ہوتے ہیں' اس کی کیا وجہ ہے؟''

''بات یہ ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''یہاں سے قیدی بھاگ تو سکتے نہیں' آزادی کے دروازے بند ہیں' اس لئے ان کا مزاج بگڑ جاتا ہے۔ اعصاب تن جاتے ہیں اور وہ غصہ اتارنے کے لیے کوئی نہ کوئی ہدف ڈھونڈ لیتے ہیں۔''

اس نے مادام کی طرف منہ پھیرتے ہوئے کہا۔ جولیٹ' یہ شخص تو بہت ذہین ہے!'' پھر مجھ سے کہنے لگا ''تم کتنی دیر مچھلیاں پکڑتے ہو؟''

''میں اپنی مشقت صبح چھ بجے ختم کر لیتا ہوں اور پھر مچھلیاں پکڑنے کے سوا کوئی کام نہیں ہوتا۔''

''گویا تم سارا دن شکار کرتے رہتے ہو؟'' مادام جولیٹ نے پوچھا۔

''نہیں مجھے دوپہر کے وقت لازماً واپس آنا پڑتا ہے۔ پھر تین سے چھ بجے تک دوبارہ جانے کی اجازت مل جاتی ہے۔ یہ سخت تکلیف دہ صورت حال ہے۔ کیونکہ بعض اوقات مدوجزر میں تغیر آ جانے سے میں اچھا شکار نہیں کرسکتا۔''

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

مادام نے گورنر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''کیا تم اسے خصوصی پاس نہیں دے سکتے تاکہ صبح چھ بجے سے شام چھ بجے تک جی بھر کے شکار کر سکے؟''

''ٹھیک ہے۔'' گورنر نے جواب دیا۔

میں خوش وخرم واپس آیا۔ دوپہر کے تین گھنٹے مزید جیل سے باہر گزارنے کی اجازت ملنے کا مطلب یہ تھا کہ قدرت میری مدد کر رہی ہے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب تمام وارڈر' سنتری اور پہرے دار آرام کر رہے ہوتے ہیں اور سیکورٹی کے سارے انتظامات ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ میں اس وقت سے فائدہ اٹھا کر فرار کا کوئی راستہ نکال سکتا تھا۔

جولیٹ کو باقاعدہ مچھلیاں ملنے لگیں' لیکن اس نے اسی پر اکتفانہ کی' بلکہ آہستہ آہستہ میرے لیے دردسر بن گئی۔ وہ وقت بے وقت مجھے گھر میں بلا بھیجتی' زبردستی انواع واقسام کے کھانے کھلاتی اور خود سامنے بیٹھ کر تکے جاتی۔

مجھے اس کی آمرانہ روش سے چڑ ہوگئی۔ میں نے جیل میں ماترو کو کہانی سنائی۔ اس نے ناصحانہ انداز میں کہا: ''یہ چڑیل تمہارے لیے مسئلہ بن رہی ہے۔ وہاں کم سے کم جایا کرو اور وہ بھی اس وقت جب گورنر کی گھر میں موجودگی کا یقین ہو' ورنہ کوئی نہ کوئی مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔''

اس دوران میں نے فرار کے امکانات کا جائزہ لیا۔ گورنر ہاؤس سے ملحق قبرستان کا پہریدار کاربوزی میرا گہرا دوست بن چکا تھا اور اس نے ہر ممکن مدد کا وعدہ کیا۔ میں نے قبرستان کے ایک گھنے درخت کے نیچے پکے ہوئے ناریل اسٹور کرنے شروع کر دیئے تاکہ سفر میں خوراک کا کام دے سکیں۔ اب دوسری بڑی ضرورت کشتی تھی جس کے بغیر سمندر میں ایک فٹ بھی سفر کرنا محال تھا۔ اتفاق کی بات ہے ایک فرانسیسی لڑکا مجھے ایسا مل گیا جو میرے شہر میں پلا بڑھا اور اب کسی سرکاری ملازم کے قتل کے جرم میں سزا کاٹ رہا تھا۔ پیشے کے لحاظ سے وہ بڑھئی تھا۔ اور اسے جیل میں مشقت بھی ملی' تو لکڑیاں کاٹ کر فرنیچر وغیرہ تیار کرنے کی۔ پہلی ملاقات ہی میں اس نے میرا ساتھ نبھانے کا وعدہ کر لیا۔ مکمل کشتی تو سب کی نظر کے سامنے تیار کرنا ممکن نہ تھی اس لیے اس نے چھوٹے چھوٹے تختے چیرے جو دوسرے فرنیچر کے نیچے چھپا دیئے گئے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ ان تختوں کو جوڑ کر مکمل کشتی کہاں بنائی جائے؟

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

سارا معاملہ لٹکتا نظر آ رہا تھا' آزادی کے خواب شرمندہ تعبیر ہوتے دکھائی نہ دیتے تھے۔ آخر چند ماہ بعد جزیرے پر ایک نئی بلڈنگ بنانے کی سکیم تیار ہوئی۔ میں نے معماروں سے بات کی کہ وہ دیگر سامان کے ساتھ میری کشتی کے تختے بھی جیل سے باہر نکال دیں۔ قدرے ہچکچاہٹ کے بعد انہوں نے ہامی بھر لی۔ میں نے کاربوزی سے رابطہ قائم کیا اور اسے بتایا: میں نے فرار کے لیے ایک کشتی بنانے کا آدھا کام مکمل کر لیا ہے' تختے چیرے جا چکے ہیں اور اب انہیں صرف جوڑنا ہے' کیا تم کوئی ایسی جگہ بتا سکتے ہو' جہاں یہ تختے جیل سے نکال کر وقتی طور پر چھپائے جا سکیں؟''

اس نے جواب دیا: ''باغ میں ڈھیر سارے تختے چھپانا انتہائی خطرناک معاملہ ہوگا۔ وارڈروں کو سبزی ترکاری چوری کرنے کی عادت ہے۔ وہ اندھیرے سویرے یہاں آتے رہتے ہیں' اگر کسی کو تختوں کی موجودگی کا شک پڑ گیا' تو پھر میری خیر نہیں۔'' قدرے توقف کے بعد اس نے کہا: ''ایک طریقہ ذہن میں آتا ہے۔ دیوار کے ساتھ چھوٹا سا گڑھا کھودا جائے۔ اس پر ایک بڑا پتھر پڑا ہو۔ بس پتھر اٹھائیں اور تختے نیچے پھینک دیں اور پھر پتھر اپنی جگہ پر واپس رکھ دیں۔'' یہ ترکیب میرے دل کو لگی۔ معماروں نے آہستہ آہستہ لکڑی کے تختے یہاں پہنچانا شروع کر دیئے۔ نئی بلڈنگ کا راستہ اسی باغ سے ہو کر گزرتا تھا' اس لیے انہیں کسی دقت کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ دیگر ساز وسامان کے ساتھ روزانہ ایک تختہ باہر لانا دشوار نہ تھا۔

سارا کام بڑی ہوشیاری سے ہو رہا تھا۔ میں نے اپنے اندر ایک نئی روح دوڑتی محسوس کی۔ مجھے اپنے ارادوں سے گلگانی اور ڈیگا کو بھی آگاہ کرنا تھا۔ اس سلسلے میں میری خاموشی ان کے لیے ہلاکت کا باعث بن سکتی تھی۔ ایک روز میں نے ان دونوں کو اکٹھے بلا کر اپنی اسکیم سمجھائی: ''کیا تم میرے ساتھ بھاگنا پسند کرو گے؟''

انہوں نے نفی میں جواب دیا: ''اللہ کا نام لے کر تم نکل جاؤ' ہم اپنا راستہ خود نکال لیں گے اور اگر تمہاری وجہ سے ہمارے اوپر کوئی زد پڑی' تو اسے بھی ہنسی خوشی برداشت کر لیں گے۔''

اس سے بڑھ کر میری حوصلہ افزائی اور کیا ہو سکتی تھی!

فرار کے منصوبے پر عمل شروع کرنے سے میرے اندر نئی توانائی آ گئی تھی۔ میں نے زیادہ سے زیادہ کھانا شروع کر دیا۔ مچھلی کے شکار نے میرے جسم کو چاق وچوبند رکھا۔ اس

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

میں زیادہ ورزش ہاتھوں کی ہوتی ہے' ٹانگوں کی ورزش کے لیے میں اونچی اونچی پہاڑیوں پر چلتا پھرتا یا پھر سمندر میں زیادہ گہرے پانی میں اتر جاتا جہاں لہریں میری ٹانگوں کو ڈگمگا دیتیں اور میں زور لگا کر سیدھا کھڑا رہنے کی کوشش کرتا۔ اس طرح پنڈلیوں کے اعصاب مضبوط ہوتے چلے گئے۔

مادام کی نوازشیں قائم تھیں۔ لکڑی کے تختے باہر آ چکے تھے۔ صرف دو تختے آنے باقی تھے اور یہ چھ چھ فٹ لمبے تھے..... مشکل یہ تھی کہ اس گڑھے میں بھی نہ چھپائے جا سکتے تھے جو اس مقصد کے لیے کاربوزی نے تیار کیا تھا۔

انہی دنوں قبرستان میں ایک نئی قبر کا اضافہ ہوا۔ اس میں کسی وارڈر کی بیوی دفن کی گئی تھی۔ لحد کے اوپر مرجھائے ہوئے پھولوں کی چادر سوگوار انداز میں پڑی تھی۔ مجھے ایک دم اس قبر کو استعمال کرنے کا خیال آیا۔ ایک تو یہ تازہ قبر تھی اور اس کی کھدائی سے کسی کو فوراً شک نہ ہو سکتا تھا۔ دوسرے اس کے اندر اتنی جگہ تھی جہاں تختوں کو آپس میں جوڑا جا سکتا تھا' ضرورت پڑنے پر قبر اندر سے فراخ بھی کی جا سکتی تھی۔ ایک اور فائدہ یہ ہوا کہ عورت کی وفات کے چند روز بعد ہی اس کا خاوند دل برداشتہ ہو کر جزیرے کو خیرباد کہہ گیا اور فرانس چلا گیا۔ اس طرح یہ خدشہ دور ہو گیا کہ کوئی شخص خاص طور پر اس قبر کا دیدار کرنے کے لیے آ سکتا ہے' پھر بھی احتیاط کے تمام تقاضے ملحوظ رکھنے کے لیے میں نے کاربوزی سے مل کر یہ طے کیا کہ وہ اپنی جگہ سے بالکل نہیں ہلے جلے گا تاکہ اسے بھی کوئی منصوبے میں شریک تصور نہ کرے۔ بس وہ اتنی مدد کرے کہ اپنے پاس دو رومال رکھے گا۔ ایک سفید دوسرا سرخ۔ جب تک خطرہ نہیں ہوتا وہ ہاتھ میں سفید رومال لیے بیٹھا رہے گا' بصورت دیگر وہ سرخ رومال سے خطرے کا سگنل دے دے گا۔

قبر میں سوراخ کرنے اور اسے اندر سے فراخ کرنے کا خطرناک کام میں نے ایک سہ پہر کو شروع کیا اور شام تک ختم کر لیا۔ سوراخ پر ناریل کے پتوں کی چٹائی رکھ کر اوپر مٹی ڈال دی گئی۔

فرار کی تیاری کرتے تین ماہ ہو چکے تھے۔ میں لکڑی کے تمام تختے قبر میں منتقل کر کے انہیں آپس میں جوڑ رہا تھا۔ قیدی بڑھئی نے یہاں آ کر کام کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ رنگے ہاتھوں پکڑے جانے سے سخت خائف تھا اور پھر سزائیں بھی کیا کم تھیں کہ کوئی خوشی سے شریک کار بننے کی جرات کرتا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

برسات کا موسم آیا' تو ہماری مشکلات میں اضافہ ہو گیا۔ مجھے ہر دم یہی خطرہ لاحق رہتا کہ کہیں قبر بیٹھ ہی نہ جائے یا چٹائی سے مٹی بہہ جائے اور کوئی وارڈر اسے دیکھ لے' تو پھر مظالم کا جو پہاڑ نازل ہو گا اس کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔

ایک روز میں ناریل لے کر قبر کی طرف جا رہا تھا کہ جولیٹ نے مجھے دیکھ لیا۔ میرا سانس تقریباً رک گیا اور رگ و پے میں دہشت کی لہر دوڑ گئی۔ ''پیپلن' کیا تم ناریل سے تیل تیار کرتے ہو؟ یہ کام تم ادھر میرے محل میں کیوں نہیں کر لیتے؟ میرے پاس تمام ضروری آلات موجود ہیں' تمہیں آسانی رہے گی۔''

''نہیں' میں جیل میں کام کرنا پسند کرتا ہوں۔'' میں نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔

''کس قدر عجیب معاملہ ہے! یہ کام میرے ہاں آسانی سے ہو سکتا ہے۔'' پھر ایک دو لمحے کچھ سوچنے کے بعد اس نے کہا: ''پاپی پیارے' پتہ نہیں مجھے تمہاری بات پر یقین کیوں نہیں آتا؟ تم اس سے تیل نکالنے کا ارادہ ہرگز نہیں رکھتے!'' میرا خون رگوں میں منجمد ہونے لگا۔ وہ بولتی چلی گئی۔ ''آخر تمہیں تیل نکالنے کی ضرورت بھی کیا ہے' جبکہ تم اپنی ضرورت کا تیل مجھ سے مانگ کر لے جاتے ہو۔ میرا خیال ہے تم کسی اور مقصد کے لیے ناریل جمع کر رہے ہو!''

میرے پسینے چھوٹ رہے تھے اور میں شروع ہی سے لفظ ''فرار'' سننے کی توقع کیے ہوئے تھا۔ میرا سانس پھول سا گیا تھا۔ میں نے کہا: ''مادام! یہ بھی ایک راز ہے اور میں سب کچھ تمہیں بتا کر تمہاری وہ خوشی غارت نہیں کرنا چاہتا جو کوئی شے پا کر اچانک تمہیں میسر آئے گی' میں اس کے خول سے تمہارے لیے کوئی نادر تحفہ بنانا چاہتا ہوں۔''

عورت تحفے تحائف کی بات سن کر کمزور پڑ جاتی ہے۔ اس نے بڑے تصنع سے جواب دیا: ''پیپلن' میں نے تمہیں منع نہیں کیا تھا کہ میرے لیے پیسے ہرگز خرچ نہ کرنا۔ بس مجھے مچھلی کی ضرورت تھی' وہ فرمائش کر دی۔ میں تمہاری از حد ممنون ہوں۔ اب مجھے مزید کسی چیز کی حاجت نہیں۔''

''چلو' مجھے پیسٹری اور مکھن کھلاؤ۔'' میں نے اس کی کمزوری سے مزید فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا اور وہ مجھے لے کر محل کی طرف چل دی۔ اسے ایک لمحے کے لیے بھی میری حالت غیر کا اندازہ نہ ہو سکا۔

بارشیں پھر زور سے ہونے لگیں۔ کئی بار تو کام شروع ہی نہ ہو سکا' کیونکہ موسلا دھار

بارش کی وجہ سے ہر طرف جل تھل ایک ہو گیا تھا۔ آخر پانی خشک ہوا' تو میں قبرستان کی طرف روانہ ہوا۔ صرف دس گز دور پہنچا' تو کیا دیکھتا ہوں کہ چٹائی بالکل ننگی پڑی ہے۔ میرے خدا اگر کوئی اور دیکھ لیتا' تو کیا ہوتا! میں نے دل ہی دل میں سوچا اور لرزتے قدموں سے آگے بڑھا۔ جب چٹائی اٹھا کر اندر داخل ہوا' تو وہاں بھی کمر کمر تک پانی بھرا ہوا تھا۔ اب میں دہری مصیبت میں مبتلا ہو گیا۔ قبر کے اندر پانی اور باہر کاربوزی سرخ رومال لہرا رہا تھا۔ میں جاتا' تو کدھر' قبر میں میرا دم گھٹنے لگا۔ لاش بھی پانی میں تیر رہی تھی اور اس کا کفن الگ سوہان روح بنا ہوا تھا۔

میرے ذہن میں ایک خیال آیا' کیوں نہ ساتھ والی قبر کی دیوار میں سوراخ کر دوں تا کہ پانی اس میں چلا جائے۔ میں نے ٹٹول کر ایک اوزار پکڑا اور آہستہ آہستہ دونوں قبروں کی درمیانی دیوار توڑنے لگا۔ بڑی محنت کے بعد اس قصد میں کامیابی ہوئی' تو پانی ایک دم ساتھ والی قبر میں داخل ہوا۔ یوں لگتا تھا جیسے ریلا بہہ نکلا ہو۔

قبر سے پورا پانی نہ نکل سکا۔ ابھی گھٹنوں گھٹنوں پانی جمع تھا۔ کام شروع کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ ساری سوچ اسی ایک نقطے پر مرکوز تھی کہ عافیت سے باہر کیسے نکلا جا سکتا ہے۔ خدا خدا کر کے باہر خطرہ ٹلا اور میں قبر سے یوں باہر نکلا جیسے کسی دلدل میں دھنسا رہا ہوں۔

کاربوزی نے مجھے دیکھتے ہی کہا: ''مجھے یہ بیل منڈھے چڑھتی دکھائی نہیں دیتی' ایک بار کوئی رخنہ پڑ جائے' تو پھر حالات درست نہیں ہوا کرتے۔''

''ہاں' آج تو بس اخیر ہو چکی تھی۔'' یہ کہہ کر میں سمندر کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں ایک اور شخص کو کہا کہ وہ میرے لیے پانچ پونڈ مچھلی پکڑ رکھے' میں سہ پہر کو آ کر اس سے لے جاؤں گا۔ اتنی مچھلی روزانہ مجھے مادام جولیٹ کو دینا پڑتی تھی۔ اس روز اتنا تھک گیا تھا کہ اپنے اندر شکار کی ہمت نہ پاتا تھا۔

جب میں واپس باغ کے نزدیک پہنچا' تو وہاں چار پانچ واڈر پھر رہے تھے۔ میرے پاؤں کے نیچے سے زمین سرکنے لگی۔ میرے خدا! کیا سارا منصوبہ طشت از بام ہو گیا ہے؟ کیا میری قسمت پر ہمیشہ کے لیے ناکامی کی مہر ثبت ہو کر رہ گئی ہے؟ خاصی دیر تک میں وارڈروں کو گھومتے دیکھتا رہا' آخر رہا نہ گیا' جو ہوتا ہے سو ہو جائے میں ان کی طرف چل دیا۔ یہ دیکھ کر جان میں جان آئی کہ کاربوزی نے سفید رومال لہرایا ہوا ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

یہ لوگ سبزی ترکاری کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ انہوں نے جھولیاں سلاد' ٹماٹر اور سبز مرچوں سے بھر لیں' تو وہاں سے چلے گئے۔

دن گزرتے رہے۔ بارش کی وجہ سے کئی بار کام رکا۔ مگر آخر وہ دن بھی آ پہنچا کہ دوسرا چھ فٹ لمبا تختہ بھی جیل سے باہر نکال کر باغ میں چھپا دیا گیا' لیکن اس کے ساتھ ہی ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔ اس سے پہلے آج تک بڑھئی نے مجھ سے کبھی یہ نہ پوچھا تھا کہ آیا اس کے ارسال کردہ تختے مجھے باقاعدہ مل رہے ہیں یا نہیں' لیکن آج اس نے خاص طور پر مجھ سے تنہائی میں ملاقات کر کے گھبرائے ہوئے لہجے میں تختے کے بارے میں پوچھا۔ میں اس کی اندرونی کیفیت بھانپ گیا۔ ''کیوں خیر تو ہے؟ کسی نے دیکھ لیا یا تم نے کسی اور کو اس کے بارے میں بتا دیا ہے؟''

''نہیں ایسی بات نہیں۔''

''مگر تم پریشان ضرور ہو!''

''بس مجھے ایک شخص باب سیلر کے بارے میں شک ہے کہ وہ میری نقل و حرکت کو دلچسپی سے دیکھتا رہتا ہے۔ آج وہ تختہ لے کر باہر آنے والے شخص کو دروازے تک گھور گھور کر دیکھتا رہا۔''

''اچھا' تم مطمئن رہو' میں اس سے نپٹ لوں گا۔''

میں نے کاربوزی سے بات کی۔ باب سیلر ہمارے بلاک میں قید تھا۔ مجھے اس پر قطعاً شک نہ تھا' لیکن کاربوزی نے جو کچھ جواب میں کہا اس سے میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس نے بتایا کہ اس شخص نے عمر بھر فوجی زندگی بسر کی ہے یا پھر جیلوں میں گلتا سڑتا رہا ہے۔ یہاں وہ جس آزادی سے گھومتا پھرتا رہتا ہے اس سے مجھے بھی کئی بار شک گزرا ہے۔ میں نے اسے دیکھ کر متعدد مرتبہ سرخ رومال لہرایا ہے' بہر حال اس کی نگرانی کرنی چاہیے اور اگر ذرا بھی شبہ ہو کہ وہ مخبری کر رہا ہے' تو پہلی فرصت میں اسے موت کے گھاٹ اتار دو۔

میں نے گلگانی سے مشورہ لیا' وہ بھی اسی بات کے حق میں تھا کہ باب سیلر کو مخبری کے الزام میں قتل کر دینا چاہیے۔ مگر میرا دل نہ مانتا تھا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ بڑھئی کو اندرونی کشمکش کی بنا پر شبہ ہو گیا ہو کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے؟ پھر میں نے مزید تصدیق کے لیے اس شخص سے ملاقات کی جو لکڑی کا تختہ اٹھا کر باہر لایا تھا۔ اس کا کہنا تھا۔ مجھے باب سیلر پر ہرگز کوئی شک نہیں ہوا۔''

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

میری ہچکچاہٹ کو دیکھ کر کاربوزی نے خود اس شخص کو ٹھکانے لگانے کا فیصلہ کیا' مگر میں نے اسے روک دیا۔ میں کسی شخص کو محض شک کی بناء پر قتل نہیں کیا کرتا' مگر جب کوئی ثبوت ہاتھ آ جائے' تو پھر میری زد سے کوئی بچ بھی نہیں سکتا' خواہ مجھے اپنی زندگی ہی داؤ پر کیوں نہ لگانی پڑے۔

میں شدید دماغی تناؤ کی کیفیت میں مبتلا تھا۔ تین ماہ سے فرار کی تیاری ہو رہی تھی۔ ایک ایک لمحہ اضطراب انگیز تھا۔ اور اب آخری وقت پر باب سیلر کا کانٹا اٹک گیا۔ میں اپنے خیالات کو دوسری طرف متوجہ کرنے کے لیے سمندر کے اس حصے میں مچھلی کا شکار کرنے گیا جہاں مجھے کشتی پانی میں ڈالنا تھی۔ پانی ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور مجھے ہرگز امید نہ تھی کہ میں ان موجوں سے بچ کر جزیرے سے دور نکل سکتا ہوں۔ باب سیلر کی تلوار الگ سر پر لٹک رہی تھی اور اس کی بناء پر میرے اعصاب مزید تن گئے۔ تاہم میں نے اپنے آپ کو پرسکون کرنے لیے یہی فیصلہ کیا کہ باب سیلر کو ہرگز قتل نہ کروں گا۔ الا یہ کہ مجھے اس کے بارے میں کوئی ناقابل تردید ثبوت مل جائے۔

مچھلیوں کا شکار لے کر میں واپس محل کی طرف آیا۔ رات کی بارش کی وجہ سے قبر کے سوراخ سے جو مٹی بہہ گئی تھی' اسے کاربوزی درست کر رہا تھا۔ میں سیدھا جولیٹ کے پاس پہنچا۔ وہ ایک نئی کتھا لے کر بیٹھ گئی' پیپلن' میں نے تمہارے بارے میں ایک بھیانک خواب دیکھا ہے۔ تمہارا چہرہ خون سے لہولہان ہے اور جسم زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ خدا کے لیے کوئی بیوقوفی کا کام مت کرنا' ورنہ مجھ پر سختی نازل ہوگی۔ اس خواب نے مجھے اس قدر ہلا کر رکھ دیا ہے کہ نہ میں نے آج غسل کیا ہے نہ بالوں میں کنگھی۔ میں سارا دن دوربین لے کر چھت پر بیٹھی ساحل پر تمہیں دیکھتی رہی' مگر تم کہیں نظر نہ آئے' کہاں مچھلیاں پکڑتے ہو؟''

''میں آج جزیرے کے دوسری طرف چلا گیا تھا' اسی لیے تمہیں نظر نہ آ سکا۔''

''تم اتنی دور کیوں چلے جاتے ہو؟ اگر تند و تیز موجیں تمہیں ہڑپ کر لیں' تو تمہیں بچانے والا بھی کوئی نہ ہوگا۔''

''بس کرو' مبالغے سے کام مت لو۔''

''تو یہ مبالغہ آرائی ہے کیا! آئندہ سے میں تمہیں جزیرے کی دوسری جانب جانے سے منع کرتی ہوں' اگر تم نے میرے حکم کی خلاف ورزی کی' تو پھر تمہارا خصوصی پاس منسوخ کروا دوں گی' سمجھتے ہو تم سب کچھ میری وجہ سے ہوا!''

''مادام ہمیں خلاف عقل باتیں نہ کرنی چاہئیں۔ آئندہ میں تمہارے ملازم کو بتا دیا کروں گا کہ کہاں شکار کرنے جا رہا ہوں' پھر تم مطمئن رہو گی؟''

''ٹھیک ہے' تم تھکے تھکے دکھائی دیتے ہو!'' اس نے میرے اترے ہوئے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا: ''چار بجے واپس آ کر میرے ساتھ چائے کی پیالی پینا۔''

میں نے وعدہ کیا کہ ضرور آؤں گا۔

آئندہ چند دنوں میں بڑھئی نے مسلسل نگرانی کی شکایت کی۔ ایک بار تو اس نے یہاں تک کہا کہ اس کی غیر حاضری میں بعض تختوں کو ان کی اصل جگہ سے ہٹا دیا گیا ہے۔ میں نے کہا: ''آئندہ جو تختہ چیر و اس پر ایک باریک بال رکھ دو۔ کوئی شخص اسے ہلا جلا کر دیکھنے کے بعد خواہ کتنی احتیاط سے واپس رکھے گا' ہمیں بال کے گرنے سے فوراً پتہ چل جائے گا کہ کوئی شخص اس تختے کو ہلاتا رہا ہے۔''

ان تمام تر شبہات کے باوجود ہمارے کام میں کسی نے مداخلت نہ کی تھی' میں اب بھی شش و پنج میں تھا کہ باب سیلر کہیں بے گناہ نہ مارا جائے۔ میں نے اپنا ہاتھ روکے رکھا اور ساری توجہ اپنے فرار پر مرکوز رکھی۔ کشتی کے تمام تختے باغ تک پہنچائے جا چکے تھے۔ قبر کے اندر کشتی کا ڈھانچہ تیار تھا۔ صرف اس کے اندر دو بڑے تختے فٹ کرنے باقی تھے جو پیندے کا کام دیتے' چونکہ قبر اتنی کھلی نہ تھی اس لیے آخری کام ہم نے موقع تلاش کر کے قبر کے باہر انجام دینے کا فیصلہ کیا۔ میرے لیے صرف دو نازک مرحلے باقی تھے۔ ایک کشتی کا پیندہ فٹ کرنا اور دوسرے کشتی کو سمندر میں ڈال کر بھاگ نکلنا۔ ان دنوں چاند پہلے ہفتے میں تھا' اس لیے رات کے دو بجے سمندر کا پانی نیچے اترنے لگتا اور طغیانی کی کیفیت تھم جاتی۔ گلگانی کا مشورہ تھا کہ فرار کا یہ وقت انتہائی مناسب ہے۔

کاربوزی اور میں نے تیز رفتاری سے کام کرنے کا فیصلہ کیا' اگلی صبح نو بجے تک کشتی مکمل ہو جائے گی اور میں اسی رات فرار ہو جاؤں گا۔

اگلے دن صبح نو بجے ہم حرکت میں آ گئے۔ میں نے جلدی سے کشتی کا ڈھانچہ قبر سے نکالا اور کاربوزی نے دیوار کے قریب گڑھے سے دونوں بڑے تختے نکالے۔ میری خوشی کی کوئی انتہاء نہ رہی دونوں تختے بڑی نفاست سے ڈھانچے میں فٹ ہو گئے۔ ابھی ہم مکمل کشتی کو دوبارہ قبر میں چھپانے والے تھے کہ ایک وارڈر رائفل تانے ہماری طرف بڑھا۔

''بالکل حرکت نہ کرنا' ورنہ گولی چلا دوں گا۔''

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کشتی ہمارے ہاتھوں سے پھسل کر نیچے گر پڑی۔ میں نے اس وارڈر کو پہچان لیا۔ وہ بلڈنگ وارڈ کا چیف وارڈر تھا۔

''مزاحمت کرنے کی حماقت مت کرنا' تم پکڑے جا چکے ہو۔ اپنی جان بچانے کے لیے ہتھیار ڈال دو' اپنے ہاتھ اوپر اٹھا لو اور میرے آگے آگے چلو۔''

جب ہم قبرستان کے دروازے سے گزرے' تو چیف وارڈر نے مجھے وہاں کھڑے ہوئے ایک عرب سنتری سے کہا: ''عباس! اس اطلاع کا شکریہ! میں تمہیں انعام سے ضرور نوازوں گا۔''

''شکریہ!'' عرب نے جواب دیا: ''مگر باب سیلر نے بھی تو مجھے انعام دینے کا وعدہ کیا ہے۔ میں دونوں سے الگ الگ انعام لوں گا۔''

''اس کے ساتھ خود معاملہ طے کرتے رہنا۔ وارڈر نے ابھی تک ہماری طرف رائفل تان رکھی تھی۔ اس نے عرب سے کہا: ''عباس! ان کی تلاشی لو۔''

اس نے بڑی پھرتی دکھائی اور میری پیٹی سے چاقو نکال لیا۔ کاربوزی کا چاقو بھی برآمد کر لیا گیا' میں نے اس سے کہا: ''دوست' تم نے بہت پھرتی دکھائی ہے' آخر یہ سارا کارنامہ تم نے کس طرح انجام دیا؟''

''میں روزانہ ناریل کے درخت پر چڑھ کر تمہاری نقل و حرکت پر نظر رکھتا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔

''آخر تمہیں ایسا کرنے کے لیے کس نے کہا؟''

''باب سیلر اور چیف وارڈر دونوں نے۔''

تلاشی مکمل ہونے کے بعد ہم پھر چل پڑے۔ دفتر کا فاصلہ صرف چار سو گز تھا' مگر زندگی میں اس سے زیادہ بوجھل قدم میں نے کبھی نہ اٹھائے تھے۔ میرے اعصاب بالکل سن ہو کر رہ گئے تھے۔ چار ماہ کی شبانہ روز محنت یوں پلک جھپکتے میں اکارت چلی گئی اور اب ایک بار پھر میں کڑی سزاؤں کا سزاوار ٹھہرا۔

گورنر اپنے دفتر میں عدالت لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے چیف وارڈر سے پوچھا: ''کیا معاملہ ہے؟''

''میں نے ان دو آدمیوں کو فرار کی کوشش کرتے ہوئے پکڑ لیا ہے۔'' چیف وارڈر نے جواب دیا۔

''پیپلن! کیا تم نے اپنے دفاع میں کچھ کہنا ہے؟'' گورنر نے مجھے مخاطب کیا۔

''اس وقت نہیں' جب باقاعدہ انکوائری ہوگی' تو پھر سب کچھ عرض کروں گا۔'' میں نے درشت لہجے میں جواب دیا۔

''اسے بلیک ہول میں بند کر دو۔'' گورنر نے حکم دیا' اور ساتھ ہی اس کی تعمیل ہو گئی۔ بلیک ہول کمرہ عدالت کے ساتھ ہی بنا ہوا تھا اور زیر تفتیش مجرموں کو اس میں رکھا جاتا تھا۔

تین بجے سہ پہر کو ہمیں باہر نکالا گیا' ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ اب باقاعدہ انکوائری ہونے والی تھی۔ چیف وارڈر نے الزامات کی فہرست پڑھی اور ہم دونوں کے علاوہ بڑھئی اور معماروں کو بھی اس جرم میں ملوث کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ ہم لوگوں سے سرکاری لکڑی چرانے' ایک قبر کی بے حرمتی کرنے اور پھر فرار کی کوشش کا جرم سرزد ہوا ہے اور ہم سب کو ہر جرم کی الگ الگ سزا دی جائے۔

میں نے دیگر لوگوں کے بارے میں صحت جرم سے انکار کیا اور سارا الزام اپنے سر لے لیا۔ چیف وارڈر نے میری اس حرکت کی مخالفت کی۔ وہ کہنے لگا: ''ہمارے مخبر نے تمام لوگوں کو اس کے ساتھ کام کرتے دیکھا ہے۔''

میں نے مخبر کا نام پوچھا۔ اس نے اب نام بتانے میں کوئی قباحت محسوس نہ کی۔ اسے یقین تھا کہ تھوڑی دیر میں ہمیں سزا سنا دی جائے گی اور ہم پھر سینٹ جوزف کے ''آدم خور'' پنجرے میں بند ہوں گے۔ اس طرح کسی کے خلاف انتقامی کاروائی کا موقع ہمیں نہ ملے گا۔

''تمہارا مخبر باب سیلر ذاتی مخالفت کی بناء پر جس شخص کا نام بھی لے' کیا تم اسے مجرم گردانو گے؟'' میں نے بلند آواز میں پوچھا۔ گورنر نے گردن ہلائی جیسے کچھ سوچ بچار کر رہا ہو۔ آخر اس نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا: ''حتمی فیصلہ ہر ایک کو صفائی کا پورا پورا موقع ملنے کے بعد سنایا جائے گا۔ میری رائے میں مخبر باب سیلر اور ملزموں کو آپس میں جرح کی اجازت دینی چاہیے۔''

یہ فیصلہ ہماری بہت بڑی کامیابی اور چیف وارڈر اور اس کے ساتھیوں کی تذلیل کی علامت تھا۔ سماعت اگلے دن ملتوی کر دی گئی اور ہمیں پھر بلیک ہول میں بند کر دیا گیا۔ میں اپنی ذہنی کیفیت کی تصویر کشی نہیں کر سکتا' رات بھر مجھے نیند نہ آ سکی اور میں سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا رہا۔ ڈیگا اور گلگانی کی مہربانیوں سے ایسی چیزوں کی کوئی کمی نہ آنے پائی۔ میرے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ذہن پر باب سیلر کا بھوت سوار تھا۔ اب اس کے جرم میں کوئی شبہ نہ رہا تھا اور میں اسے ٹھکانے لگانے کا موقع ضائع نہ کر سکتا تھا۔ یہ موقع مجھے آئندہ جرح کے وقت میسر آنے والا تھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ میری اس شخص سے کوئی جان پہچان نہیں' کوئی عداوت نہیں پھر اس نے میرے جذبات پر اوس کیوں ڈالی؟ اگر اسے یہ حق پہنچتا ہے کہ بیٹھے بٹھائے کسی وجہ کے بغیر چھ سات آدمیوں کو مختلف سزائیں دلوا سکتا ہے' تو پھر ہمیں یہ حق کیوں نہیں کہ اس کا بھیجا پاش پاش کر دیں۔ کیا ہوا اگر اس کے قتل کے الزام میں پھانسی کی سزا مل گئی۔ ویسے بھی زندگی میرے لیے اجیرن بن کر رہ گئی تھی' بار بار کی ناکامی نے میرے حوصلے توڑ دیے تھے۔ خوشیاں' مسرتیں' امیدیں سب کچھ باب سیلر کی مخبری کے نتیجے میں ہوا ہو گیا۔ صرف ایک زبان ہلنے کے نتیجے میں میری چار مہینوں کی کاوش راکھ کا ڈھیر ثابت ہوئی' جو ہونا ہے سو ہو جائے' میں باب سیلر کو قتل کر دوں گا۔ تاہم موت کی سزا سے بچنے کا ایک طریقہ یہ تھا کہ کسی طرح اسے اشتعال دلا کر پہلے چاقو نکالنے پر وار کرنے کا موقع دیا جائے۔ تاکہ میں یہ کہہ سکوں کہ اپنے دفاع میں میں نے ہاتھ اٹھایا تھا' اس طرح سانپ بھی مر جاتا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹتی۔

اگلی صبح دس بجے ہمیں کال کوٹھڑی سے نکال کر کمرہ عدالت میں لایا گیا۔ ڈیوٹی پر متعین پہریدار کاربوزی کا گہرا دوست تھا۔ وہ دونوں آپس میں باتیں کرنے لگے عین اس لمحے دروازہ کھلا اور باب سیلر' عرب اور چیف وارڈر اندر داخل ہوئے۔ باب سیلر نے مجھے دیکھ کر پیچھے مڑنا چاہا' مگر چیف وارڈر نے اسے اندر آنے کو کہا اور ساتھ ہی اس نے ڈیوٹی پر متعین پہرے دار کو ہدایت کی کہ وہ دونوں فریقوں کو آپس میں بات چیت نہ کرنے دے۔ یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ کاربوزی سے باتیں کرنے والا سنتری تسمے باندھنے کے لیے جھکا۔ کاربوزی نے موقع غنیمت جانا اور باب سیلر کے منہ پر تھوک دیا۔ اس اثناء میں سنتری سیدھا کھڑا ہو چکا تھا۔ وہ کاربوزی کی حرکت نہ دیکھ سکا۔ مگر اس نے باب سیلر کو پیچ و تاب کھاتے ہوئے دیکھ لیا۔ اس کی نظر باب سیلر پر جم کر رہ گئی۔ اب میرے لیے سنہری موقع تھا۔ میں نے جیب سے چاقو نکال کر اس طرح لہرایا کہ صرف باب سیلر ہی اسے دیکھ سکتا تھا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' جھٹ جیب سے چاقو نکالا اور میرے دائیں بازو میں پوری قوت سے گھونپ دیا۔ اب مجھے وار کرنے سے دنیا کی کوئی طاقت' کوئی ضابطہ اخلاق نہ روک سکتا تھا' میں کھبو ہوں' اس لیے دائیں بازو کے زخم نے میرا کچھ نہ بگاڑا اور بائیں ہاتھ سے میں نے اپنا چاقو باب سیلر کے

سینے میں اتار دیا۔ ''آ.....ہ..... آہ!'' ایک لمبی خراہٹ اس کے حلق سے نکلی اور وہ فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

ڈیوٹی پر متعین پہریدار نے رائفل تانتے ہوئے کہا: ''کسی شخص نے اپنی جگہ سے حرکت کی' تو اسے بھون کر رکھ دوں گا۔'' ہمیں اب کسی حرکت کی ضرورت کیا تھی۔ میں اپنا انتقام لے چکا تھا۔ میرے دہکتے ہوئے سینے میں ٹھنڈ پڑ گئی۔ ایک خمار کی سی کیفیت میرے ذہن پر طاری تھی اور جب ہوش آیا تو تاریک تر مستقبل میری آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔

میں اور کاربوزی دونوں گورنر کے منظور نظر تھے' مگر گورنر میری مدد کرنے سے معذور تھا۔ مجھ پر تین الزام عائد کیے گئے تھے۔ یہ کہ میں نے سرکاری لکڑی چرائی ہے' دوسرے میں نے ایک قبر کی بے حرمتی کی ہے اور تیسرے فرار کی منصوبہ بندی۔ ان تینوں جرائم کی الگ الگ سزا جیل کے قواعد و ضوابط کے مطابق اتنی طویل تھی کہ میری نسلیں بھی بھگتنا چاہیں' تو نہ بھگتا سکیں اور آہنی سلاخوں کے پیچھے ہی گل کر رہ جائیں۔

کاربوزی مجھ سے زیادہ خوش قسمت تھا۔ اس نے گورنر کے ایما اور میرے مشورے سے یہ بیان دیا کہ پیپلن نے ڈرا دھمکا کر ساتھ ملانے کی کوشش کی تھی' چنانچہ اس طرح اسے سزا سے چھٹکارا مل گیا' مگر یہی رہائی اس کے لیے موت کا پروانہ ثابت ہوئی۔

ایک روز وہ غسل خانے میں نہا رہا تھا' عین اس وقت جب اس نے سر اور چہرے صابن ملا اور آنکھیں بند کر لیں تو کسی نے اس کے سینے میں خنجر اتار دیا۔ وہ بے چارا تڑپ بھی نہ سکا اور مجرم موقع واردات سے فرار ہونے میں کامیاب رہا' مگر یہ حقیقت ڈھکی چھپی نہ تھی کہ اسے کس نے کیفر کردار کو پہنچایا۔ یہ ساری کارستانی چیف وارڈر کی تھی جس کا سارا منصوبہ تلپٹ ہو رہا تھا۔ اس کی خواہش یہ تھی کہ ہم دونوں کا کورٹ مارشل کروا کر کڑی سے کڑی سزا دلوائے۔

میں اس وقت بلیک ہول میں بند تھا اور کاربوزی کے قاتلوں سے کوئی انتقام نہ لے سکتا تھا۔ میرے بارے میں گورنر نے یہ حکم دیا کہ ایک ماہ بعد فرانس سے ایک گشتی فوجی عدالت جزیرے میں آئے گی' تو وہ یہ کیس سنے گی۔ اس دوران مجھے خطرناک قیدی قرار دے کر اسی بلیک ہول میں بند رکھا گیا۔ پورے چوبیس گھنٹے بعد مجھے کچھ کھانے پینے کو ملتا۔ جو قیدی لڑکا کھانا لے کر آتا' وہ بلا کا دلیر اور جرات مند تھا۔ میں اس کی حرکات و سکنات کا بغور جائزہ لیتا رہتا' کیونکہ وہ میرے قریب آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چند دن کے اندر ہی ہمارے درمیان

خاصی بے تکلفی پیدا ہوگئی اور اس نے میرے سامنے حال دل کھول کر رکھ دیا۔ یہ قیدی لڑکا فرانس کے کسی رئیس خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ اس کے گھر میں دولت کی ریل پیل تھی اور اخلاق باختگی انتہا کو پہنچی ہوئی۔ اس نے بھی ماحول کا اثر قبول کیا اور ایک خاکروبہ کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھانا شروع کر دیں۔ ضبط کے بندھن ٹوٹے اور تمام اخلاقی اقدار کو پس پشت ڈالتے ہوئے انہوں نے جنسی تعلقات پروان چڑھائے' مگر جب ان کے ہاں حرام کی بچی نے جنم لیا' تو وہ اس جان کا وجود ایک لمحے کے لیے برداشت نہ کر سکا۔ رات کی تاریکی میں اس نے بچی کو تولیے میں لپیٹا اور اسے محل کے قریب ایک گندے نالے میں لے جا کر پھینکا۔ پولیس نے لاش برآمد کر لی اور قاتل کا سراغ لگانا شروع کر دیا' ادھر اس کے پورے خاندان کو اس وحشیانہ حرکت کا علم تھا' سبھی نے اسے زبان بند رکھنے کی نصیحت کی' مگر جو ایک بار حرام سے متنفر ہو چکا تھا' وہ اپنے ضمیر کو تھپکی دے کر سلا نہ سکا۔ ایک روز خود ہی تھانے پہنچ گیا اور اقرار جرم کر لیا' اب اسی جرم کی سزا کاٹنے کے لیے ان دور دراز جزیروں پر تھا۔ اس کا نام رومیو سالویدا تھا۔

جیل کی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد اسے پہلی بار زندگی میں سختیوں اور صعوبتوں سے آشنا ہونا پڑا' تو ایک ایک لمحہ اس پر قیامت بن کر گرا۔ اس کا ڈیل ڈول مضبوط' صحت قابل رشک اور حوصلہ جوان تھا۔ جب یہ خصوصیات کسی کے اندر موجود ہوں' تو پھر انسان دوسروں کی عاید کردہ پابندیاں قبول نہیں کرتا۔

''میں نے یہاں سے بھاگنے کا ایک عجیب ترین طریقہ سوچا ہے۔'' رومیو نے سرگوشی کے انداز میں کہا: ''میرا ظاہری چال چلن بالکل ٹھیک ہے' اسی لیے گورنر نے میری یہ درخواست قبول کر لی ہے کہ مجھے پاگل خانے میں کلرک بنا کر بھیج دے۔ دراصل وہاں اسٹور میں دو بڑے ڈرم پڑے ہیں۔ جنہیں خالی کر کے کشتی کے طور پر کام میں لایا جا سکتا ہے۔ پاگل خانے سے بھاگنا بالکل آسان ہے' کیونکہ وہاں چار دیواری کے باہر محافظ متعین نہیں ہیں۔ ہسپتال کے اندر صرف ایک میڈیکل اسسٹنٹ چند وارڈروں کے ساتھ پاگلوں کو قابو میں رکھتا ہے۔ اور تمام قیدی آہنی جنگلوں میں بند ہوتے ہیں۔ تم بھی وہاں میرے ساتھ شامل کیوں نہیں ہو جاتے؟''

''کیا کلرک بن کر شامل ہونا پڑے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''تمہارا کلرک بننا ناممکن ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ پاگل خانے میں تمہیں کوئی

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

بھی ایسا کام نہیں دے سکتا' کیونکہ ایک تو وہ جگہ کیمپ سے دور ہے اور دوسرے وہاں محافظ بھی زیادہ نہیں اور تم چند منٹوں میں سب کو جل دے کر نکل بھاگو گے۔ اس حالت میں تمہیں کلرک بنانے والا لازماً اپنی ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ میرے خیال میں تم ایک مریض کی حیثیت سے وہاں پہنچ سکتے ہو!''

''رومیو ہم ان لوگوں کو دھوکا کیسے دے سکتے ہیں؟ کوئی ڈاکٹر مجھے پاگل قرار دینے کی ذمہ داری کیسے لے گا؟ تمہیں معلوم ہے کہ پاگلوں کو غیر ذمے دار سمجھا جاتا ہے' وہ کسی قیدی کو قتل کر دیں' کسی محافظ پر ہاتھ اٹھائیں یا کسی بچے کا گلا گھونٹ دیں' ان سے کوئی باز پرس نہیں ہوتی۔ انہیں مجنون سمجھ کر کوئی بھی کچھ نہیں کہتا۔''

''پیپلن تمہاری بات درست ہے' مگر میرے نزدیک تمہی واحد شخص ہو جس کے ساتھ میں فرار ہونا پسند کروں گا۔ تم پاگل بننے کے لیے جو کچھ کر سکتے ہو ضرور کرو۔ ہسپتال میں کلرک ہونے کی حیثیت سے میں تمہاری ہر ممکن مدد کروں گا۔ اگرچہ یہ راہ پر خطر ہے اور انسان کو انتہائی ذلت کی زندگی گزارنا پڑتی ہے' مگر اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نظر نہیں آتا' مجھے امید ہے کہ تم ان خطرات پر قابو پا لو گے!''

''ٹھیک ہے' تم پاگل خانے میں اپنی ڈیوٹی سنبھال لو' میں بھی کوئی منصوبہ بنا لوں گا۔''

رومیو تو دوسرے تیسرے دن پاگل خانے چلا گیا۔ میں نے اپنے بارے میں غور و خوض شروع کر دیا۔ جیل کی لائبریری میں اس موضوع پر کوئی کتاب نہ تھی جو میں کسی کے ذریعے منگوا کر پڑھ سکتا' تاہم بعض قیدیوں سے مل کر میں نے تاثر قائم کر لیا کہ کسی پاگل میں کیا ابتدائی علامتیں ظاہر ہوتی ہیں۔

1- تمام پاگلوں کے سر کے پچھلے حصے میں کرب انگیز درد ہوتا ہے۔

2- ان کے کان بجتے رہتے ہیں۔

3- وہ کسی وقت بھی نچلے نہیں بیٹھ سکتے' کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کے عادی ہوتے ہیں' اعصابی تناؤ کی بناء پر وہ یکدم اچھل پڑتے ہیں اور یوں لگتا ہے کہ بس ختم ہونے والے ہیں۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ میں اپنے اندر یہ علامتیں کیسے پیدا کروں؟ اگر یک دم مجنونانہ حرکات شروع کر دوں اور کسی قیدی یا محافظ پر دیوانگی میں ہاتھ اٹھاؤں' تو ہٹے کٹے عرب حبشی مجھ پر پل پڑیں گے اور میری ہڈی پسلی ایک کر دیں گے۔ بہترین راستہ یہ تھا کہ میری عادات میں

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

لحظہ بہ لحظہ ایسی تبدیلیاں رونما ہوں کہ پہلے تو میرے ساتھی مجھ سے تنگ آ جائیں' پھر رفتہ رفتہ محافظ مجھ سے عاجز آ کر ڈاکٹر سے شکایت کریں کہ وہ میرا علاج کرے۔

میں نے منصوبے پر عمل شروع کر دیا۔ تین دن میں مسلسل جاگتا رہا' نہ نہایا دھویا نہ حجامت کروائی' کھانا بہت کم کھانے لگا۔ ایک روز میں نے اپنے ساتھ والے قیدی سے پوچھا کہ وہ وہاں میرے ''کمرے'' سے ایک تصویر کیوں چرا لے گیا ہے۔ دراصل یہ تصویر کبھی وہاں لگی ہی نہ تھی' مگر قیدی اس قدر گھبرایا کہ اس نے فوراً اپنا سیل تبدیل کر لیا۔ پھر ایک دن ہم مشقت سے واپس آ رہے تھے کہ باورچی خانے کے پاس سے گزرے' تو وہاں شوربے کی دیگ چڑھی ہوئی تھی۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ دیگ میں ٹٹی کر دی۔ سب لوگ مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے اور پھر جب میں نے خود ہی ایک برتن میں شوربا ڈال کر غٹا غٹ چڑھا لیا' تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ صرف ایک شخص زبان کھولنے کی جرات کر سکا: ''پیپلن! یہ تم کیا کر رہے ہو؟''

''شوربے میں تم نمک ڈالنا بھول گئے تھے نا!'' میں نے کہا۔

ان دو واقعات کی بناء پر مجھے ڈاکٹر کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ ڈاکٹر نے مجھے تعجب سے دیکھا۔ میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا: ''ڈاکٹر' کیا تم خیریت سے ہو؟''

''ہاں! میں ٹھیک ہوں۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا: ''تم یہاں کیسے؟ کیا بیمار ہو۔''

''نہیں تو!''

''پھر وہ تمہیں یہاں کیوں لائے ہیں؟''

''انہوں نے کہا تھا ڈاکٹر بیمار ہے' اس کی مزاج پرسی کر لو' مجھے خوشی ہے کہ تم ٹھیک ٹھاک ہو۔ اچھا خدا حافظ!''

''پیپلن' ایک منٹ ٹھہرو۔'' اس نے آواز لگائی۔ ''ایک منٹ میرے سامنے بیٹھو۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک ٹارچ اٹھائی اور میری آنکھوں کا معاینہ کیا۔

''ڈاکٹر' کیا تمہیں وہ چیز مل گئی ہے جس کی تلاش کر رہے ہو؟ تمہاری ٹارچ کی روشنی کمزور ہے' اس لیے کیا نظر آئے گا؟''

''مجھے کیا نظر آنا تھا؟''

''احمق مت بنو ڈاکٹر' تم حیوانوں کے ڈاکٹر تو نہیں ہو! تم مجھے بتاتے کیوں نہیں کہ میری آنکھوں میں کیا تلاش کر رہے ہو؟''

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ڈاکٹر کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ اس نے مزید بے عزتی سے بچنے کے لیے فوراً کہا: ''ہاں' میں نے دیکھ لیا ہے' مگر میں تمہیں بتا نہیں سکتا وہ ہے کیا!'' پھر اس نے محافظوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''اسے ہسپتال لے جاؤ' اس کی حالت سخت خراب ہے۔ فوری علاج ضروری ہے۔''

پہلا قدم کامیابی سے اٹھ چکا تھا۔ آدھ گھنٹے بعد میں ہسپتال کے نرم و گداز بستر پر محو خواب تھا۔ اب دوسرے مرحلے میں ڈاکٹر کو پوری طرح قائل کرنا تھا کہ اگر اس نے مجھے پاگل خانے نہ بھیجا' تو میں عام کیمپ میں وبال جان بن جاؤں گا۔

ڈاکٹر نے ایک روز مجھ سے پوچھا: ''پیپلن' نیند تو ٹھیک آتی ہے؟'' وہ انتہائی مودب لہجے میں مجھے مخاطب کرتا' اسے شاید ڈر تھا کہ میں کہیں اس پر ہاتھ نہ چھوڑ بیٹھوں۔

''ڈاکٹر میری طبیعت تو ٹھیک ہے' مگر نیند کا معاملہ گڑبڑ ہے۔ جونہی رات کو بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کرتا ہوں' تو باہر کوئی ہینڈ پمپ چلانے لگتا ہے۔ وہم! وہم! وہم! ایسی حالت میں نیند کس کافر کو آئے! یہ سلسلہ رات بھر جاری رہتا ہے اور برداشت سے باہر ہے۔''

ڈاکٹر نے کوئی جواب دیے بغیر میڈیکل اسسٹنٹ سے پوچھا: ''کیا اس کے کمرے کے باہر کوئی نلکہ ہے؟'' اسسٹنٹ نے نفی میں سر ہلا دیا..... اس کا سیل تبدیل کر دو۔'' ڈاکٹر نے حکم دیا اور جلدی سے باہر نکل گیا۔

دروازہ بند ہو چکا تھا' مگر مجھے اس کے قدموں کی آواز سنائی نہ دی۔ ظاہر ہے وہ میری نگرانی کر رہے تھے۔ میں نے بھی استادی دکھائی اور مکہ ہوا میں لہرا کر بلند آواز سے چلایا: ''حرامی! اب نلکا چلانا بند بھی کرو' کیا تمہارا باغیچہ اس قدر خشک ہو گیا ہے کہ زندگی بھر نلکا چلانے سے بھی سیراب نہ ہو گا۔''

یہ سن کر ڈاکٹر کو یقین ہو گیا کہ میرا دماغ واقعی چل گیا ہے۔ اگلی صبح میرا سیل بدل دیا گیا۔ چند دن بعد ڈاکٹر پھر معاینے کے لیے آیا: ''پیپلن! کیا تم نے وہ رسالہ پڑھ لیا ہے جو میں نے تمہیں بھجوایا تھا؟''

''کیا خاک پڑھتا!'' میں نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''بس جیسے ہی رسالہ گود میں لے کر بیٹھتا ہوں' میرے کان میں کوئی کیڑا اپنا ساز بجانا شروع کر دیتا ہے۔ ٹوں! ٹوں! ٹوں!

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

روئی ڈال کر کان صاف کرتا ہوں۔ مگر کیڑا دماغ میں گھس جاتا ہے۔ اگر تمہارے پاس کوئی ایسی دوائی ہو جو کان میں ڈالنے سے مجھے اس کیڑے سے نجات مل جائے' تو تمہارا ممنون ہوں گا۔''

ڈاکٹر حیران کھڑا میری باتیں سن رہا تھا۔ اس نے زیادہ سے زیادہ میڈیکل اسسٹنٹ کو یہ حکم دیا کہ میرے کان دھو ڈالے جائیں۔ درحقیقت ڈاکٹر اندر سے ہل چکا تھا اور ایک ہفتہ بعد تو اس کے پاؤں تلے سے زمین سرک ہی گئی جب میں نے اسے بتایا کہ کوئی غیر مرئی قوت مجھے اپنے شکنجے میں کسے ہوئے ہے۔ اور میرا سارا جسم اور روح بھی سخت عذاب میں گرفتار ہے جیسے کوئی تیز طوفان مجھے لرزا رہا ہو یا کوئی عظیم مکے باز میرے جبڑوں پر کاری ضرب لگا رہا ہو۔ کبھی چارپائی پر لیٹے لیٹے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں ایک بے لگام گھوڑے پر سوار ہوں جو پتھریلی ناہموار زمین پر بگٹٹ دوڑے چلا جا رہا ہے۔

اس کے بعد ڈاکٹر نے میڈیکل اسسٹنٹ اور تمام محافظوں کو ہدایت کی کہ وہ مجھ سے خبردار رہیں۔ ہمیں جلد از جلد اسے پاگل خانے بھجوانا پڑے گا۔

اور ایک دن میں واقعی پاگل خانے پہنچ چکا تھا۔ یہاں کل سو مریض تھے اور چند ایک محافظ۔ محافظوں کے لیے مریضوں کی نگہبانی کے بجائے اپنی ذات کی حفاظت ضروری تھی۔ یہاں حقیقی پاگلوں کے ساتھ رہتے ہوئے مجھے ہر دم یہی خطرہ درپیش رہتا کہ کہیں خود بھی واقعی ہوش وحواس سے ہاتھ نہ دھو بیٹھوں' کیونکہ بعض اوقات مجھ سے غیر ارادی طور پر مجنونانہ حرکات سرزد ہو جاتیں۔

رومیو سالویدا نے تمام محافظوں کے ساتھ گہری دوستی گانٹھ رکھی تھی۔ تمام اسٹور اس کی تحویل میں تھا اور اس کی مہربانی سے مجھے چوری چھپے تازہ غذا ملتی رہی جس سے میری گرتی ہوئی صحت بحال ہو گئی' تاہم میں نے اپنا حلیہ' ظاہری شکل صورت کبھی ٹھیک نہ کی۔ ڈاڑھی کے بال بے ترتیبی سے پھیلے ہوئے' پیلی پیلی' تھکاوٹ سے چور چور خلاؤں میں گھورتی آنکھیں' ہونٹ مڑے ہوئے اور ہاتھ پاؤں کی رگیں پھولی ہوئی۔ ایک خطرناک پاگل کی تمام علامات مجھ میں موجود تھیں۔

رومیو' فرار کی تیاری میں مصروف تھا۔ ٹین کے دو ڈرم تو تھے ہی' اس نے کہیں سے رسی بھی حاصل کر لی تاکہ ہم ضرورت پڑنے پر دیوار سے کود بھی سکیں۔ پھر اس نے احتیاط کے طور پر صدر دروازے کی ایک چابی بھی حاصل کر لی اب صرف انتظار اس بات کا تھا کہ میرے

سیل کی چابی بھی میسر آ جائے۔ کئی دن تک وہ مارا مارا پھرتا رہا۔ وہ آنکھ بچا کر میرے تالے کو دیکھ جاتا اور رات اپنے دفتر میں اوور ٹائم لگانے کے بہانے چابی تیار کرتا۔ پھر اسے آزمانے کے لیے واپس میرے سیل کی طرف آتا۔ پندرہ دن تک یہ کھیل جاری رہا۔ یہ تو وہی جانتا ہوگا کہ سخت محنت کے باوجود جب اس کی تیار شدہ چابی میرے تالے کو نہ لگتی' تو اس کے دل پر کیا گزرتی ہوگی' مگر اندر میری حالت بھی کچھ بہتر نہ تھی۔ ہر لحظہ جہنم میں گزر رہا تھا اور دل آزادی کے لیے تڑپ رہا تھا۔ بیوی' بچوں اور بھائی بہنوں کے چہرے میری آنکھوں کے سامنے پھر جاتے۔ ان دنوں دوسری عالمی جنگ چھڑ چکی تھی۔ فرانس پر نازی عفریت کا قبضہ مستحکم ہو چکا تھا۔ معلوم نہیں غلامی کے طوق گردن میں ڈالے میری قوم پر کیا بیت رہی ہوگی۔ کاش! میں وطن میں ہوتا' تو میرا جوان خون ہٹلر کے پینزر دستوں کے سامنے ایک ابلتا ہوا بے کراں سمندر بن جاتا۔ خون جو اس وقت ان جہنمی جیلوں اور پاگلوں خانے میں سڑ رہا تھا۔

بالآخر رومیو نے صحیح چابی بنا ہی لی۔ ہم نے طے کیا کہ مزید انتظار کیے بغیر اسی رات بھاگ نکلیں' کیونکہ آنے والے وقت کا کچھ پتہ نہ تھا۔ ''پاپی! آؤ چلیں۔'' میں یہ الفاظ سننے کے لیے مدت سے انتظار کر رہا تھا۔ ہم نے جلد ہی اسٹور سے دونوں ڈرم اٹھائے' رسیاں اپنے اردگرد لپیٹ لیں اور دبے پاؤں صدر دروازے کی طرف چل دیے۔ اس کی چابی رومیو کے پاس موجود تھی۔ محافظ اس وقت خواب خرگوش میں مست تھے۔ کوئی آہٹ پیدا کیے بغیر ہم نے دروازہ کھولا اور ایک لمحے کے بعد ہم اس منحوس پاگل خانے سے آزاد ہو چکے تھے۔

کچھ دور تک ہموار پگڈنڈی تھی' پھر چٹانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور ہمارے لیے آگے بڑھنا مشکل ہو گیا۔ اس وقت تک ہم بھرے ہوئے ڈرم اٹھائے ہوئے تھے..... خیال تھا کہ سمندر میں خالی ڈرم کے مقابلے میں بھرے ہوئے ڈرم کو آسانی سے متوازن رکھا جا سکتا ہے' مگر سفر کی صعوبت کے پیش نظر ہم نے ڈرموں کے ڈھکنے کھول دیے اور زیتون کا قیمتی تیل ضائع کر دیا۔

ساحل تک پہنچتے پہنچتے ہمارے پاؤں لہولہان ہو چکے تھے۔ رومیو نے سمندر میں اترنے کے لیے ایک ایسی جگہ منتخب کی تھی جہاں سے کوئی سو فٹ کی بلندی سے چھلانگ لگا کر پانی میں کودنا پڑتا تھا۔ اور وہ بھی اس وقت جب پانی کی بپھری ہوئی موج پھنکارتی ہوئی ان چٹانوں سے آ ٹکرائے' اس کے سوا اور کوئی راستہ نہ تھا' کیونکہ چٹانیں بالکل عمودی کھڑی

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

تھیں اور ایک قدم ڈھلوان پر رکھنے کا مطلب یہ تھا کہ انسان لڑھکتا ہوا نیچے گرتا چلا جائے اور پانی تک پہنچتے پہنچتے اس کی ہڈی پسلی ایک ہو جائے۔

پانی میں کودنے سے پہلے میں نے چیخ کر رومیو کو ہدایت کی کہ جیسے ہی وہ پانی میں گرے' تو ڈرم پر گرفت ڈھیلی نہ ہونے دے۔ اسی اثنا میں مجھے ایک موج چٹانوں کی طرف بڑھتی ہوئی نظر آئی۔ میں نے چلا کر کہا: ''کود جاؤ'' اور چشم زدن میں ہم نوکیلی چٹانوں کو پھلانگتے ہوئے پانی میں کود چکے تھے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے گہرائی میں اترتا جا رہا ہوں' مگر میں نے اپنے اعصاب پر مکمل کنٹرول رکھا اور کسی لمحے بھی ڈرم کو ڈھیلا چھوڑنے کی حماقت نہ کی۔ کچھ دیر بعد مجھے رومیو بھی ہاتھ پاؤں مارتا دکھائی دیا۔

ابھی میں پوری طرح توازن قائم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا کہ ایک اور شوریدہ سر موج میرے اوپر سے گزر گئی۔ پھر اس نے مجھے کئی سو فٹ اوپر اچھال دیا اور جب یہ واپس پلٹی' تو میں نے اپنے آپ کو ایک نوکیلی چٹان کے اوپر اوندھے منہ پڑے ہوئے پایا۔ میں پتھر سے چمٹ گیا تاکہ کوئی اور موج پھر مجھے میلوں گہرے پانی میں نہ دھکیل دے۔ پھر میں تیر کر واپس خشکی پر پہنچ گیا۔ اس وقت میرا سانس اکھڑ چکا تھا۔ اعصاب پر اس قدر بے پناہ دباؤ پڑا تھا کہ جسم میں سینکڑوں سوئیاں سی چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

میرے ہوش و حواس درست ہوئے' تو مجھے اپنے دوست رومیو کا خیال آیا۔ میں نے ایک دم چلانا شروع کر دیا: ''رومیو..... رومیو..... رومیو!'' مگر کوئی جواب نہ ملا۔ ''تم کہاں ہو؟'' میں چلا رہا تھا جواب میں وحشی ہوا سرسرا رہی تھی اور تند و تیز موجیں چٹانوں سے سر پٹخ رہی تھیں۔

✣ ✣ ✱ ✣ ✣

گولے ہمارے چاروں طرف گرتے رہے' ہماری کشتی تنکے کی مانند ڈولتی رہی۔ ہم نے اپنی قمیصیں اتار کر ہوا میں لہرائیں اور جہاز کو ہر ممکن طریقے سے یہ تاثر دیا کہ ہمارا جنگ سے کوئی تعلق نہیں۔ معلوم نہیں ہمارے اشارے کا اثر ہوا یا خود جہاز والوں نے ہمارے حال پر رحم کرنے کا فیصلہ کیا' بہر حال گولہ باری بند ہو گئی۔ جہاز ہمارے قریب آتا چلا گیا۔ آخر ہمارے پاس آ کر رک گیا۔ اس پر بنے ہوئے نشانات سے پتہ چلتا تھا کہ یہ برطانوی بحریہ کا جنگی جہاز ہے۔ ہمیں سیڑھی لگا کر اوپر کھینچ لیا گیا۔

''تم لوگ کون ہو؟'' جہاز کے کپتان نے پوچھا۔

''ہم فرانسیسی شہری ہیں اور اس وقت قید سے بھاگ نکلے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''کیا تم ڈیگال کے حق میں ہو یا مارشل پیتان کے؟''

''ہمیں دونوں کے بارے میں کچھ علم نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''ہم جنگ شروع ہونے سے برسوں پہلے سے قید و بند میں سڑ رہے ہیں' اس لیے ہم سیاسیات سے بے بہرہ ہیں۔''

کپتان ہماری بات کا قائل ہو گیا' تو اس نے ہمیں ایک نقشہ دکھاتے ہوئے کہا: ''اس راستے پر چلے جاؤ۔ دو دن کے سفر کے بعد تم جارج ٹاؤن کی بندرگاہ پر پہنچ جاؤ گے۔

ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ایک نئی ابتلا سے جان چھوٹ گئی۔ کپتان کے بتائے ہوئے راستے پر سفر کرتے ہوئے ہم ٹھیک دو دن بعد جارج ٹاؤن کی بندرگاہ کے قریب پہنچ گئے۔ کسی قسم کی ناگہانی آفت میں پڑ جانے کے ڈر سے ایک لمبا چکر کاٹ کر بندرگاہ سے بہت دور ساحل پر جا لگے۔ کشتی' سمندر میں چھوڑی اور شہر میں داخل ہو گئے۔

اگرچہ ہمارے پاس کرنسی موجود تھی' تاہم اس پر غیر متعین عرصے تک گزارا نہ ہو سکتا تھا۔ ہم نے ایک مکان کرائے پر لیا اور محنت مزدوری شروع کر دی۔ کوئک کوئک اور ہوان ہوا روزانہ کثیر رقم کمانے لگے۔ میں ابھی سستی دکھا رہا تھا۔ ایک روز میں گھومتا پھرتا جارج ٹاؤن کے اس محلے میں جا نکلا جہاں ایشیائی باشندے رہائش پذیر تھے۔ نامعلوم مجھے ایک لمبے بالوں والے' گلے میں پتھروں کی مورتیوں کی مالا پہنے ہوئے اس شخص میں کیا کشش دکھائی دی کہ چند دن کی ملاقات کے بعد اس سے بہت بے تکلف ہو گیا۔ وہ مجھے اکثر گلی بازاروں میں ملا کرتا تھا۔ ایک دن اس نے مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دی جسے میں مسترد نہ کر سکا۔ اس کا گھر مورتیوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ کوئی ہندو ہے۔ اس کی دو نوعمر بیٹیوں..... اندرا اور رادھا نے میری خدمت کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اندرا تو میری طرف کھنچتی چلی گئی۔ میرے سامنے انڈین قبائل کی دو بہنیں لالی اور زوریماں گھوم گئیں۔ ان کی فطری محبت نے بھی میرا دل موہ لیا تھا۔ کیا وقت اپنے آپ کو پھر دہرا رہا تھا؟ نہیں' میرا اندیشہ غلط ثابت ہوا۔ صرف اندرا میرے قریب آئی اور اس طرح قریب آئی کہ پھر دور نہ ہو سکی۔ اس کے باپ نے ہمارے جذبات کا لحاظ کرتے ہوئے ہمیں شادی کی اجازت دے دی۔

ایک چھوٹی سی تقریب منعقد ہوئی' مگر خوشی کے جذبات فراواں نے تمام غم غلط کر دیے۔ شادی ہوئی اور میں ایک کیف و سرور کے عالم میں کھو گیا۔ اندرا کا باپ کما کر لاتا اور ہم لوگ

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

عیش اڑاتے۔ اندرا کے ہمراہ میں نے جارج ٹاؤن میں پہلی بار ''ٹاکیز'' فلمیں دیکھیں۔ میں نے اس سے پہلے فلموں کے بارے میں سنا تک نہ تھا' اس لیے میرے لیے یہ تجربہ بڑا حیران کن تھا۔ میں بچوں کی طرح دانتوں میں انگلی دبائے فلم کے دوران بیٹھا رہتا۔

جارج ٹاؤن تو ہماری منزل نہ تھی۔ کیف وسرور کا ہالہ ٹوٹا' تو سنگلاخ حقیقتوں کا رخ دیکھ کر میں لرز گیا۔ یہاں بھی میں آزاد نہ تھا' کسی وقت بھی گرفتاری کا اندیشہ لاحق تھا۔ میں نے کوئک کو نک سے بات کی' مگر وہ نکلنے پر آمادہ نہ ہوا' چنانچہ مجھے اپنے ساتھیوں کی تلاش میں دوڑ دھوپ کرنا پڑی۔ فرنچ گیانا سے بھاگ کر دو اور قیدی جارج ٹاؤن پہنچنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ چاپر اور ڈیپلانکے نوجوان بھی تھے اور دلیر بھی۔ انہوں نے میرا ساتھ دینے کا وعدہ کیا اور اب کے ہم نے برطانوی ہنڈوراس کا رخ کیا۔

فرار کی تیاری خفیہ خفیہ جاری رہی۔ ایک رات اندرا کو اپنے پہلو میں لیٹا چھوڑ کر میں چپکے سے گھر سے نکلا' چاپر اور ڈیپلانکے پہلے ہی طے شدہ جگہ پر اکٹھے ہو چکے تھے۔ ہم نے سمندر میں کشتی ڈالی اور اندازے سے برطانوی ہنڈوراس کی طرف بڑھنے لگے۔ اگرچہ سفر میں غیر معمولی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا' پھر بھی میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ ہمیں اس وقت تک اپنی منزل پر پہنچ جانا چاہیے تھا۔ کیا ہم غلط سمت چلے آئے ہیں' میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اگر ہم راستہ کھو چکے ہیں' تو لازماً جھیل پاریا میں داخل ہو چکے ہوں گے جو ہنڈوراس کے بالمقابل واقع ہے۔ ہم یقینی طور پر ونزویلا کی طرف بڑھ رہے تھے۔

میں نے ایک نئی دنیا' ایک نئی تہذیب کا سراغ لگایا تھا۔ ونزویلا کی سرزمین پر پہلے چند لمحات جس کیف ومستی میں گزرے اسے میری معمولی ذہانت صحیح طور پر بیان نہیں کر سکتی۔ ان اجنبی لوگوں نے ہمارے لیے کس گرمجوشی سے اپنے بازو وا کر دیے تھے۔

''عجیب مسافر ہو تم! تمہاری کیا حالت ہو رہی ہے؟'' انہوں نے ہمیں دیکھ کر کہا۔ ہم جس گاؤں میں اترے تھے' اس کا نام اراپا تھا اور یہ ماہی گیروں کی بستی تھی۔ گاؤں کی تمام عورتوں نے کسی امتیاز کے بغیر نرسوں کی سی ڈیوٹی سنبھال لی۔ ایک مکان کے اندر ہمارے لیے اونی بستر لگا دیے گئے۔ ہمارے جسم کی کوکوا مکھن سے مالش کی گئی۔ قسما قسم کی مچھلی کھانے کے لیے پیش کی گئی۔ کئی دنوں کی فاقہ کشی کے بعد اس کھانے میں کتنی لذت تھی خدایا!''

اس بستی کے سبھی لوگ غریب تھے' مگر کسی نے بھی ہماری خبر گیری میں غفلت نہ کی۔ تین

دن کے اندر ان کی دن رات کی توجہ سے ہم دوبارہ چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے تھے۔

''تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ کہاں سے آئے ہو۔ تمہارے جسموں پر کندہ نشانات سے واضح ہے کہ تم فرانسیسی قید خانوں سے بھاگ نکلے ہو۔''

میں یہ سن کر بڑا متاثر ہوا۔ انہیں خوب اندازہ تھا کہ ہم سنگین جرائم کی سزا بھگت رہے ہیں اور اب جہنمی کیمپوں سے فرار ہو کر یہاں پہنچے ہیں' اس کے باوجود انہوں نے ہمیں پناہ دینے میں کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہ کیا۔ سادگی اور عاجزی کے لبادے میں فرشتے چھپے ہوئے تھے فرشتے!!''

فطرت سے قریب تر زندگی بسر کرنے والا انسان فرشتہ ہی تو ہوتا ہے۔

سات دن پلک جھپکنے میں گزر گئے۔ آج مجھے اپنے میزبانوں کے چہرے مرجھائے سے نظر آ رہے تھے۔ میں نے اپنی ایک خدمت گار سے پوچھا: ''تبلیسی! کیا تم بتاؤ گی کیا معاملہ ہے؟ تم لوگ فکرمند کیوں دکھائی دیتے ہو؟''

تبلیسی نے نہ چاہتے ہوئے جواب دیا: ''بات یہ ہے آج گوٹریا کے حکام اس گاؤں میں آ رہے ہیں۔ پولیس کو معلوم ہو چکا ہے کہ تم لوگ یہاں چھپے ہوئے ہو۔ ہمیں کچھ اندازہ نہیں کہ انہیں کس نے خبر دی!''

تھوڑی دیر بعد ایک طویل قامت' پیاری سی سیاہ فام لڑکی مجھ سے ملنے آئی۔ اس کے ساتھ اس کا خاوند بھی تھا۔ لڑکی نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''موسیو' پولیس آج یہاں آ رہی ہے۔ مجھے معلوم نہیں وہ تم سے اچھا سلوک کریں گے یا برا؟ تاہم پسند کرو' تو کچھ عرصے تک ہمارے پاس پہاڑوں میں آ چھپو۔ کوئی پولیس والا تمہاری گرد کو نہ پا سکے گا۔''

میں نے اس سادہ لوح لڑکی کے ہاتھوں کا بوسہ لینا چاہا' عقیدت سے' اظہار تشکر کے طور پر' پھر رک گیا۔ اس اثنا میں گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی۔ شاید پولیس والے آ چکے تھے۔ اجنبی لہجے میں کوئی شخص پوچھ رہا تھا! ''تم لوگوں نے مفرور فرانسیسی قیدیوں کو اپنے ہاں پناہ دے رکھی ہے اور مجھے بتایا ہی نہیں۔''

اراپا کے کسی بوڑھے نے جواب دیا: ''جناب ہم انتظار کر رہے تھے کہ ان کی نقاہت دور ہو جائے۔ جب ان کی کشتی ساحل پر لگی' تو وہ مردوں سے بدتر تھے۔ اب بھی وہ محض چند قدم چلنے پھرنے کے قابل ہو سکے ہیں۔''

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

''بہر حال اب ہم انہیں لینے آئے ہیں۔ گوٹریا سے ایک لاری بھی اس مقصد کے لیے آ رہی ہے۔'' محکم آواز پھر گونجی۔

ہمیں بھی ایک جگہ جمع کر لیا گیا۔ پولیس پارٹی کے سربراہ نے پوچھا: ''کیا تم شیطانی جزیرے سے فرار ہوئے ہو؟''

''نہیں ہم جارج ٹاؤن سے آ رہے ہیں جو برٹش گیانا میں واقع ہے۔''

''تم وہیں کیوں نہ ٹھہرے؟''

''وہاں آسانی سے محنت مزدوری نہیں ملتی۔''

وہ مسکرا دیا: ''تمہارا خیال ہے کہ انگریزوں کے بجائے تمہیں یہاں سکون ملے گا۔''

''ہاں اس لیے کہ ہم تمہاری طرح لاطینی نسل سے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

اس اثنا میں ایک معمر آدمی آیا۔ اس نے پولیس والوں سے پوچھا کہ وہ ہمیں اپنے ساتھ کیوں لے جانا چاہتے ہیں۔ جواب ملا: ''اس لیے کہ یہ لوگ خطرناک قیدی ہیں۔ وہ کیمپوں سے بھاگ نکلے ہیں اور عادی مجرم ہیں۔''

''تم غلط کہتے ہو۔'' بوڑھا آدمی بولا: ''انسان ہمیشہ کے لیے گمراہ نہیں ہوتا۔ وہ ماضی میں خواہ کیسا بھی ہو موقع ملتے ہی وہ راہ راست پر آنے کی کوشش کرے گا۔ تم انہیں ہمارے پاس رہنے دو۔ ہم انہیں نئی زندگی بنانے میں مدد دیں گے۔''

''صاف بات یہ ہے۔'' پولیس کے سربراہ نے کہا۔ ''وہ لوگ ہم سے زیادہ تہذیب یافتہ ہیں جنہوں نے ان مجرموں کو سلاخوں اور کال کوٹھڑیوں میں بند کر رکھا تھا تاکہ یہ دوسروں کو نقصان نہ پہنچاتے پھریں۔ ہم انہیں کیسے کھلا چھوڑنے کی عیاشی کر سکتے ہیں؟''

''تم تہذیب سے کیا مراد لیتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔ ''تمہارے خیال میں جس قوم کے پاس طیارے، بحری جہاز، صنعتی مشین اور موٹر کاریں ہوں گی، وہ تہذیب یافتہ ہے۔ نہیں، ہرگز نہیں۔ فطری طرز زندگی ہم نے پہلی بار اراپا کے ان مچھیروں کی بستی میں دیکھی ہے۔ یہاں قدرت ہر رنگ میں جلوہ فرما ہے اور عجز و انکسار ہر چہرے بشرے سے ٹپکتا ہے۔ ہمیں اس قدر حسن سلوک اور کہیں سے میسر نہیں آیا جتنا تہذیب سے دوران اجڈ اور جاہل لوگوں سے ملا ہے۔''

''میں تمہارا مطلب سمجھتا ہوں۔'' پولیس کے سربراہ نے کہا۔ ''مگر مجھے گورنر کا حکم ہے کہ تمہیں پکڑ کر اس کی خدمت میں حاضر کروں۔ دیکھو لاری بھی آ پہنچی۔''

گاؤں کی عورتوں اور مردوں نے ہمیں گلے لگا کر رخصت کیا، ہر آنکھ اشکبار تھی اور ہر دل پرنم..... اراپا کے باسیو! خدا حافظ۔ تم نے اپنے منہ سے ٹکڑے نکال کر ہمارا پیٹ بھرا اور ہم عادی مجرموں کو پناہ میں لے کر خود بہت بڑا خطرہ مول لیا۔ وزویلا کے ساحل کے حکمرانو خدا حافظ!!

✣ ✣ ✱ ✣ ✣

دو گھنٹے بعد ہم ایک بہت بڑے گاؤں میں پہنچے۔ یہاں بندرگاہ بھی واقع تھی اور اس کا نام گوٹریا تھا۔ ایڈمنسٹریٹر نے ہمیں ضلعی پولیس کے سربراہ کے حوالے کر دیا۔ تھانے میں ہمارے ساتھ اچھا سلوک ہوا، مگر پوچھ گچھ کڑی کی گئی۔ تفتیشی افسر نہایت احمق ثابت ہوا۔ وہ یقین کرنے کو تیار نہ تھا کہ ہم برطانوی گیانا سے آئے ہیں۔ جب میں نے جارج ٹاؤن سے خلیج پیریا کے سفر کی روداد سناتے ہوئے سائیکلون کے بارے میں بتایا، تو اس نے اچھل کر کہا کہ ہم اسے بیوقوف بنا رہے ہیں۔

''اس طوفان میں دو بڑی کشتیاں اپنے عملے اور سامان سمیت غرق ہو گئیں۔'' اس نے کہا۔ ''اور ایک جہاز کا بھی کوئی سراغ نہیں ملتا۔ جو باکسائٹ سے بھرا ہوا تھا اور ادھر تم کہہ رہے ہو کہ صرف سولہ فٹ کی کھلی کشتی میں بچ کر آ گئے ہو۔ تمہاری گپ بازی پر کون یقین کرے گا؟ حتیٰ کہ منڈی میں جو بوڑھا احمق مانگتا پھرتا ہے، وہ بھی اسے نگل نہیں سکتا۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تمہاری کہانی کی تہہ میں ضرور کوئی راز پوشیدہ ہے!''

''میں جو کچھ کہہ رہا ہوں تم جارج ٹاؤن سے اس کی تصدیق کر سکتے ہو۔'' میں نے کہا۔ میں اپنا مذاق اڑانا نہیں چاہتا۔ لوگ مجھ پر قہقہے لگائیں گے کہ تمہاری بات میں آ کر تصدیق کرنے نکلا ہوں۔''

معلوم نہیں اس غبی شخص نے ہمارے بارے میں کیا رپورٹ لکھی ہو گی، بہر حال ایک صبح ہم پانچوں کو نیند سے بیدار کیا گیا، ایک دوسرے کو زنجیروں سے باندھ دیا گیا اور ایک لاری میں بٹھا کر نامعلوم منزل کی جانب روانہ کر دیا گیا۔

میں بتا چکا ہوں کہ گوٹریا کی بندرگاہ خلیج پاریا میں واقع ہے۔ اس میں ایک اور خوبی یہ ہے کہ ایمزان کے برابر بڑے دریا اورینا کو کے دہانے پر ہے۔ ہم پانچ آدمیوں کو دس سپاہیوں

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کی نگرانی میں ریات بوطور کے دارالحکومت کی طرف بھیجا گیا تھا۔ کچی پکی سڑکوں کا سفر جاری رہا۔ رات کو ہم لاری کے اندر سوئے رہتے اور دن کو علی الصبح وہی سفر' خدا جانے منزل کون سی تھی۔

بالآخر سمندر سے پانچ سو میل دور ہمارے سفر کا انجام آ پہنچا۔ یہاں کچی سڑک بھی ختم ہو جاتی تھی۔ ہم الڈووارڈو میں پہنچ چکے تھے۔ اس جگہ کے بارے میں اتنا بتاتا چلوں کہ ہسپانوی استعمار پرستوں اور مہم جوؤں کی نظر اس گاؤں پر عرصے سے مرکوز تھی۔ وہ یہاں انڈین باشندوں کے پاس سونے اور ہیروں کی بہت بڑی تعداد دیکھتے' تو انہیں اندازہ ہوتا کہ یہاں ضرور سونے کا کوئی پہاڑ ہے۔ پورا سونے کا نہیں' تو آدھا ضرور ہوگا۔ اس گاؤں کے قریب سے ایک دریا بہتا ہے' اس لیے ہر قسم کی مچھلی بھی بافراط ملتی ہے۔ مچھلی کی ایک قسم ایسی بھی پائی جاتی تھی جو بجلی کا جھٹکا لگا کر انسان کو آناً فاناً موت کے گھاٹ اتار سکتی ہے۔ لاش بعد میں دریا کے کنارے گلتی سڑتی رہتی۔ اسی دریا کے وسط میں ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے جہاں ایک مشقتی کیمپ بنا ہوا ہے۔ یہ وینزویلا کا جیل خانہ تھا۔ میں نے زندگی بھر اس سے زیادہ ظالمانہ لیبر کیمپ نہیں دیکھا۔ یہاں انتہائی غیر انسانی سلوک روا رکھا جاتا۔ یہ مربع شکل کا جیل خانہ تھا۔ لمبائی چوڑائی ایک سو پچاس فٹ اور چاروں طرف خاردار تاروں کی باڑ لگی ہوئی تھی۔ یہاں سو قیدی بند تھے جو رات کو کھلی زمین پر سونے پر مجبور تھے۔ کہیں کہیں زنگ کی چھتوں کے کمرے بھی موجود تھے' مگر وہاں محافظوں نے قبضہ جما رکھا تھا۔

ہم سے نہ کوئی وضاحت پوچھی نہ ہمیں یہاں لانے کے بارے میں تسلی بخش جواب ملا۔ تین بجے سہ پہر کو ہم لاری سے اترے اور الڈووراڈو کے قید خانے میں داخل ہوئے' اگلے لمحے سے ہمیں قیدی بنا دیا گیا۔ انہوں نے ہمارے نام لکھنے لکھانے کا تکلف بھی نہ کیا۔ ساڑھے تین بجے ہمیں پھر طلب کیا گیا۔ دو ساتھیوں کو بیلچے تھما دیئے گئے اور باقی تین کو ٹوکریاں۔ پانچ سپاہیوں نے ہمیں گھیرے میں لے لیا۔ وہ رائفلوں اور پستولوں سے مسلح تھے اور ان کی کمان ایک کارپورل کے ہاتھ میں تھی۔ ہمیں مار پیٹ کی دھمکی دے کر انہوں نے آگے لگا لیا اور اس جگہ لے جایا گیا جہاں باقی قیدی کام میں مصروف تھے۔ ہم نے محسوس کر لیا کہ قید خانے کے محافظ اپنی قوت کا رعب ہمارے ذہنوں پر بٹھانا چاہتے ہیں' اس لیے ہم انہیں اس قوت کے عملی مظاہرے کا موقع دینے کو تیار نہ تھے۔ انہوں نے جو حکم دیا ہم نے بلا چون و چرا تسلیم کر لیا۔ اس کے باوجود ہم لعنت ملامت اور غلیظ گالیوں کا نشانہ بنتے رہے۔

یہ ہفتے کا دن تھا۔ ہمیں ایک خندق کھودنے پر مامور کیا گیا تھا۔ شام کو پسینے اور گرد سے اٹے ہوئے ہم واپس کیمپ میں آ گئے۔ اس وقت بھی کوئی رسمی کارروائی نہ کی گئی۔ ''پانچوں فرانسیسی یہاں جمع ہو جائیں۔'' ساڑھے چھ فٹ لمبے کارپول نے بیل کی طرح ڈکراتے ہوئے حکم دیا۔ یہ بے وقوف وحشی کیمپ کے اندر نظم و ضبط کا انچارج تھا۔ اس نے ہمیں ٹوکریاں اور بیلچے رکھنے کی جگہ دکھائی۔

قیدیوں کی اکثریت کولمبین افراد پر مشتمل تھی۔ باقی وینزویلا کے باشندے تھے۔ ظلم و تشدد کے اعتبار سے کوئی بھی فرانسیسی کیمپ اس کے برابر نہ تھا۔ یہاں جس سختی سے کام لیا جاتا' اس سے سخت جان خچر بھی بے دم ہو سکتا تھا۔ اس کے باوجود سب قیدیوں کی صحت اچھی تھی اور یہ اس وجہ سے کہ یہاں کھانے کی چیزیں بہتات سے میسر آئیں۔

ہم نے آپس میں ایک میٹنگ کی۔ اس میں یہ طے پایا کہ اگر کوئی سپاہی ہم میں سے کسی ایک کو بھی مارے پیٹے' تو باقی ساتھی کام چھوڑ کر زمین پر لیٹ جائیں گے اور پھر خواہ کچھ ہو' وہ اٹھنے کا نام نہ لیں گے۔ اس طرح ہمارا معاملہ یقیناً حکام بالا تک پہنچے گا اور ہماری بھی کوئی شنوائی ہو سکے گی' ہم کسی سے یہ پوچھ سکیں گے کہ آخر کس جرم کی پاداش میں ہمیں یہاں مشقت پر لگایا گیا ہے۔ میٹنگ کے بعد ہم نے کارپورل کو اپنے پاس بلانے کا فیصلہ کیا۔ میں نے ترجمانی کے فرائض انجام دیے۔ اس کارپورل کو سب لوگ نیگرو بلانکو (سفید نیگرو) کہتے تھے۔ کوماؤ اسے بلا لایا۔ یہ وحشی رائفل سے مسلح ہمارے پاس آیا۔ ہم اس کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے۔

''تم میرے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''ہم ایک بات تم پر واضح کر دینا چاہتے ہیں وہ یہ کہ ہم تمہارے قواعد و ضوابط کی کبھی نافرمانی نہ کریں گے' لیکن ہم نے دیکھا ہے کہ تم کسی بہانے کے بغیر بھی طیش میں آ جاتے ہو اور ننگی پیٹھ پر کوڑے برسانے لگتے ہو۔ یاد رکھو' جس دن تم نے بلاوجہ ہم میں سے کسی ایک کو بھی مارا' تو تمہاری خیر نہیں۔ بس اپنے آپ کو مردہ سمجھنا۔''

''بہت اچھا۔'' نیگرو بلانکو نے کہا۔

''ایک اور نصیحت ہے!''

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

''کیا؟'' اس نے مریل سی آواز میں پوچھا۔

''میں نے تمہیں جو وارننگ دی ہے' اس کا تذکرہ کسی عام سپاہی کے بجائے صرف اعلیٰ افسر کے سامنے کرنا۔''

''او کے!'' یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

یہ واقعہ اتوار کو ہوا۔ اس دن کام سے چھٹی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ایک افسر میرے پاس آدھمکا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''پیپلن!''

''کیا تم فرانسیسی قیدیوں کے لیڈر ہو؟''

''ہم پانچ آدمی ہیں اور سب کے سب لیڈر''

''تم نے کارپورل کے سامنے ترجمانی کے فرائض ادا کیے تھے نا!''

''اس لیے کہ میں ہسپانوی زبان روانی سے بول سکتا ہوں۔''

یہ افسر نیشنل گارڈ سے تعلق رکھتا تھا' اس نے بتایا کہ وہ کمانڈنگ افسر نہیں' اس کے اوپر دو افسر اور بھی ہیں' لیکن آج وہ موجود نہیں' ان کی منگل کو واپسی ہونا تھی۔ ''تم نے اپنی طرف سے اور اپنے ساتھیوں کی طرف سے کارپورل کو جان سے مار دینے کی دھمکی دی ہے؟ کیا یہ درست ہے؟''

''حرف بحرف صحیح سنا تم نے!'' میں نے جواب دیا۔ ''اور یہ بڑی سنجیدہ دھمکی ہے' لیکن میں نے ساتھ یہ بھی کہا تھا کہ ہم کارپورل کے کسی حکم کی نافرمانی نہ کریں گے۔ اس کے باوجود اس نے ہم پر دست درازی کی' تو پھر ہماری دھمکی موجود ہے۔ کیپٹن' تم جانتے ہو ہم سزا یافتہ تو ہیں نہیں۔ وینز ویلا کی کسی عدالت نے ہمارے کسی جرم کی پاداش میں ہمیں یہاں نہیں بھیجا۔''

''مجھے اس بارے میں کچھ علم نہیں۔ بس تمہیں کیمپ بھیجا گیا ہے' تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم سے مشقت لی جائے۔''

''کیپٹن' تم ایک فوجی ہو۔ تمہارے سر میں ضرور بھیجا ہوگا۔ اپنے آدمیوں سے کہہ دو کہ وہ ہمارے ساتھ بدسلوکی نہ کریں۔ ہم حکم عدولی کر کے انہیں کبھی ایسا موقع نہ دیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں سب کو ہدایات جاری کر دوں گا۔''

ہم نے اتوار کا دن خوش گپیوں اور کافی پینے میں گزارا۔ میں نے موقع غنیمت سمجھتے ہوئے کیمپ کے قیدیوں کا مطالعہ کیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ یہ لوگ ان حالات کے عادی ہو چکے ہیں اور بعض اوقات جان بوجھ کر محافظوں کو چھیڑتے ہیں یا ممنوعہ کاموں میں ہاتھ ڈالتے ہیں تاکہ محافظوں کا پارہ چڑھ جائے اور وہ اول فول بکنے لگیں۔ ''اتوار کو چھ بجے پیٹ بھر کر ناشتہ کرنے کے بعد ہم پھر کام کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ کام کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ سب لوگ دو قطاریں بنا لیتے۔ ایک قطار میں پچاس قیدی اور دوسری قطار میں ان کے بالمقابل پچاس محافظ' اس طرح ہر قیدی کی نگرانی کے لیے ایک سپاہی مقرر تھا۔ آج کا دن پہلے سے زیادہ بھاری گزرا۔ بعض قیدی نڈھال ہو کر زمین پر گر پڑے' وہ پاگلوں کی طرح چیخ چلا رہے تھے اور رحم رحم کی درخواست کر رہے تھے۔

منگل کو ہم کام پر نہ گئے۔ نیشنل گارڈ کے دو میجروں نے ہمیں دفتر میں طلب کیا تھا۔ وہ دونوں حیران تھے کہ ہم ایلڈو وارڈو میں کسی عدالت کی سزا کے فیصلے کے بغیر کیسے موجود ہیں! آخر انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ گورنر سے بات کریں گے۔ شاید وہ کوئی وضاحت کر سکے۔

معلوم نہیں یہ دونوں میجر بھی مشقت لینے کے مسئلے میں بہت زیادہ وحشیانہ سلوک کرتے ہوں' مگر ہمارے معاملے میں انہوں نے بڑی پھرتی دکھائی اور فوراً گورنر سے رابطہ قائم کیا اور اسے صورت حال کی وضاحت کرنے کے لیے کیمپ میں بلایا۔ گورنر اپنے برادر نسبتی کے ساتھ جلد ہی چلا آیا۔

''فرانسیسیو' تم نے میرے ساتھ بات کرنے کی درخواست کی ہے۔ آخر کیا مسئلہ ہے تمہارا؟''

''پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمیں اس لیبر کیمپ میں کس عدالت نے سزا دے کر بھیجا ہے؟ کیا اس نے ہمارا مقدمہ سنے بغیر ہی کوئی فیصلہ سنایا ہے؟ آخر ہم یہاں کس جرم کی پاداش میں کب تک سڑتے رہیں گے؟ ہم سمندر کے راستے وینز ویلا آئے تھے۔ ہم نے کوئی جرم نہیں کیا۔ پھر ہم یہاں کیا کر رہے ہیں؟ آخر ہم سے مشقت لینے کا جواز تمہارے پاس کیا ہے؟''

''دیکھو ہم حالتِ جنگ میں ہیں' اس لیے تمہاری حقیقت جاننا ہمارے لیے ازبس ضروری ہے۔'' گورنر نے جواب دیا۔

''یقیناً لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہمیں یہاں لا پھینکا جائے۔''

PVL
PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

''تم فرانسیسی انصاف سے بھاگ کر آئے ہو' اس لیے ہم یہ معلوم کر رہے ہیں کہ آیا نہیں تمہاری تلاش ہے یا نہیں؟''

''یہ دلیل بھی درست ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن میں پوچھتا ہوں کہ ہمارے ساتھ ایسا سلوک کیوں جا رہا ہے جو صرف سزا یافتہ مجرموں کے ساتھ کیا جاتا ہے؟''

''اس وقت تمہیں بھگوڑوں کے ایکٹ کے تحت نظر بند کیا جا رہا ہے۔ ساتھ ساتھ ہم تمہارے بارے میں معلومات جمع کر رہے ہیں۔''

شاید یہ کج بحثی دیر تک جاری رہتی' ایک افسر نے مداخلت کرتے ہوئے کہا: ''مسٹر گورنر! ہم ان آدمیوں کے ساتھ دوسرے قیدیوں جیسا سلوک نہیں کر سکتے۔ میرا خیال ہے جب تک فرانس سے ان کے بارے میں کوئی خبر نہیں آتی' انہیں مشقت میں لگانے کے بجائے کسی اور طرح مصروف رکھنا پڑے گا۔''

''یہ سخت خطرناک لوگ ہیں۔ انہوں نے کارپورل کو قتل کرنے کی دھمکی دی ہے۔'' گورنر نے جھلاہٹ سے کہا۔

''صرف اسی کو نہیں۔'' میں نے تیزی سے جواب دیا۔ ''ہم ہر اس شخص کو موت کے گھاٹ اتار دیں گے جس نے ہم پر ہاتھ اٹھانے کی جرات کی۔''

گورنر نے فاتحانہ انداز میں افسروں کی طرف دیکھا۔ ''کیوں؟ ہیں نا یہ خطرناک لوگ!'' بوڑھے میجر نے ایک دو منٹ کے توقف کے بعد جرات سے کام لیتے ہوئے کہا: ''یہ مفرور فرانسیسی ٹھیک کہتے ہیں۔ انہوں نے وینزویلا کے کسی قانون کی خلاف ورزی نہیں کی اور ہم انہیں کوئی سزا بھی نہیں دے سکتے۔ مسٹر گورنر' دو راستے ہیں۔ یا تو انہیں مصروف رکھنے کے لیے کام ڈھونڈیے یا پھر انہیں بالکل کام پر نہ بھیجا جائے' کیونکہ عام قیدیوں کے ساتھ کام کرتے ہوئے اس بات کا اندیشہ ہے کہ کوئی محافظ ان پر ہاتھ اٹھائے اور انہیں اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانے کا جواز مل جائے۔'' گورنر نے اٹھتے ہوئے کہا: ''ٹھیک ہے۔ انہیں ابھی کام پر مت بھیجو۔ کل میں حتمی طور پر ان کے بارے میں بتا دوں گا۔''

میں نے افسروں کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے ہمارے موقف کی صحیح ترجمانی کی..... ایک افسر نے ہمیں سگریٹ پیش کیے۔

ہمیں یہاں رہتے ہوئے ایک ہفتہ گزر گیا۔ ہم کیمپ میں گھومتے پھرتے رہتے۔ کام تو تھا کوئی نہیں۔ بس گپ بازی ہوتی رہتی اور اپنی قسمت کو کوستے رہتے کہ کہاں آن پھنسے۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ہفتے کے روز ایک خوفناک واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ کومبین قیدیوں نے کارپورل کے غیر انسانی تشدد سے تنگ آ کر اسے ٹھکانے لگانے کا پروگرام بنایا اور قرعہ فال ایک بوڑھے قیدی کے نام پڑا۔ اس شیر دلیر نے پست ہمتی نہ دکھائی اور اپنی جان پر کھیل کر بھی یہ مشن پایہ تکمیل کو پہنچانے کا وعدہ کیا۔ اس کے ساتھیوں نے اسے تیز دھار آلہ دیا۔ بوڑھے کومبین نے موقع پا کر پوری قوت سے تیز دھار آلہ نیگرو بلانکو کے سینے میں تین بار گھونپا۔ زخموں سے تڑپتے ہوئے کارپورل کو ہسپتال پہنچایا گیا اور قاتل کو کیمپ کے وسط میں ایک کھمبے سے باندھ دیا گیا۔ سپاہی پاگل کتوں کی طرح قیدیوں کی تلاشی لینے لگے تاکہ مزید ہتھیار برآمد کر لیے جائیں۔ وہ اس قدر طیش میں تھے کہ میں جلدی سے اپنا زیر جامہ نہ اتار سکا' تو ایک سپاہی نے پھنکارتے ہوئے مجھے ایک ٹھڈا دے مارا۔ میرے ساتھی بریری نے بیچ ہوا میں اچھالا اور اس منحوس سپاہی کی کھوپڑی پر دے مارا۔ ایک اور سپاہی نے یہ ماجرا دیکھا' تو اپنی سنگین بریری کے بازو میں اتار دی۔ میں نے گھوم کر اپنے سامنے کھڑے ہوئے سپاہی پر پے در پے مکوں کی بارش شروع کر دی۔ پھر میں نے اس کی رائفل چھین لی اور نالی سیدھی کرتے ہوئے چیخ کر حکم دیا: ''سیدھے کھڑے ہو جاؤ' کسی فرانسیسی کو ہاتھ مت لگانا۔'' عین اسی وقت ایک افسر موقع پر آ پہنچا۔ اس نے چیختے ہوئے کہا: ''فرنچی' صبر کرو۔ میں ان پر قابو پا لیتا ہوں۔'' یہ کیپٹن فلورس تھا۔ اگر وہ ایک لمحہ بھی دیر سے آتا' تو میں فائر کر چکا ہوتا اور کچھ سپاہیوں کو تو بھون کر رکھ دیتا' اگرچہ خود میری جان جانے کا اندیشہ بھی ضرور تھا۔

اس افسر کی مداخلت سے سپاہیوں نے ہمارا پیچھا چھوڑا اور تشدد کی بھوک مٹانے کے لیے وہ دیگر قیدیوں کی تلاش میں نکل گئے اور پھر ہم نے دنیا کے سب سے گھٹیا فعل کا مشاہدہ کیا۔

کیمپ کے وسط میں کومبین بدستور ایک کھمبے کے ساتھ بندھا ہوا تھا اور بیک وقت تین سپاہی اسے بے تحاشہ پیٹ رہے تھے۔ یہ سلسلہ شام کو پانچ بجے شروع ہوا اور صبح چھ بجے طلوع آفتاب تک جاری رہا۔ کوئی فانی انسان اس قدر ظالمانہ سزا کیسے برداشت کر سکتا ہے جبکہ اس کا گوشت پوست کا جسم ہی مسلسل نشانہ بن رہا ہو۔ کبھی کبھی یہ سلسلہ رکتا اور اس سے پوچھا کہ اس سازش میں اس کے دوسرے ساتھی کون ہیں' اسے تیز دھار آلہ کن لوگوں نے مہیا کیا؟ مگر اس نے اپنے ساتھیوں سے غداری نہ کی اور اپنا قول نبھایا۔ وہ کئی بار ہوش و حواس کھو بیٹھتا۔ سپاہی پانی کی بالٹیاں اس پر انڈیلتے' جب وہ دوبارہ ہوش میں آتا' تو درندے پھر

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

اس پر جھپٹتے اور ایک بار بے ہوشی کا وقفہ طویل ہو گیا' تو افسر نے کہا: ''کیا یہ مر چکا ہے؟''

''معلوم نہیں۔'' جلادوں نے جواب دیا۔

''اسے کھول دو۔'' افسر نے حکم دیا اور سپاہیوں نے فوراً اس پر عمل کیا۔ اسے چاروں شانے چت لٹا دیا گیا۔ افسر نے ایک کوڑا پکڑا اور زور سے کومبین کی پشت پر دے مارا۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ گوشت کے ٹکڑے اڑ کر ادھر ادھر بکھر گئے۔ ساتھ ہی ایک دبی دبی چیخ اس کے منہ سے نکلی۔

''سزا جاری رکھو۔'' افسر نے کہا۔ ''ابھی یہ مرا نہیں۔''

اور پھر طلوع آفتاب تک اس پر تشدد کا سلسلہ جاری رہا۔ چھ بجے تک انہوں نے دیکھا کہ ابھی اس میں زندگی کی رمق باقی ہے۔ ''یہ کس قدر سخت جان نکلا۔'' افسر نے تعجب کا اظہار کیا اور ایک میڈیکل اردلی کے کان میں کھسر پھسر کی۔ تھوڑی دیر بعد اردلی نے پانی کا گلاس کومبین کو پیش کیا۔ قدرے ہچکچاہٹ کے بعد قیدی نے پورا گلاس غٹا غٹ پی لیا' اس کا سر چکرانے لگا۔ زمین و آسمان اس کی آنکھوں کے سامنے گردش کر رہے تھے۔ وہ لامتناہی خلاؤں میں معلق ہو گیا' حیات کا کمزور سا رشتہ منقطع ہوتے دیکھ کر اس نے بلند آواز میں کہا: ''بیوقوف' تم نے اس قدر مار سہ لی' مگر ان کی آخری چال کو نہ بھانپ سکا۔ انہوں نے تجھے زہر دے ڈالا ہے۔''

اس کے ساتھی ساکت و صامت کھڑے' خوفناک نظارہ دیکھتے رہے۔ کوئی اس کی مدد کے لیے آگے نہ بڑھا۔ میں نے زندگی میں آج پہلی بار موت کی تمنا کی تھی' ایک انسان میرے سامنے' میری گناہ گار آنکھوں کے سامنے بہیمیت کا نشانہ بنتا رہا اور میں کچھ نہ کر سکا' حیف ہو میری زندگی پر! میں نے کئی بار چاہا کہ کسی سپاہی کی رائفل چھین کر سب کو جہنم رسید کر دوں' مگر اس کا فائدہ کیا ہوتا؟ یہی نا کہ میری جان بھی جاتی اور میرے ساتھی فرانسیسی بھی کبھی منزل پر پہنچنے کے خواب کی عملی تعبیر نہ دیکھ سکتے۔

ایک ماہ بعد نیگرو بلانکو دوبارہ دہشت گردی کے لیے ہسپتال سے فارغ ہو چکا تھا' لیکن اس کی قسمت میں لکھا جا چکا تھا کہ وہ ایلڈوراڈو کے کیمپ ہی میں آخری سانس لے گا۔ ایک رات کوئی سپاہی گارڈ ڈیوٹی دے رہا تھا' بلانکو اس کے سامنے سے گزرا' تو سپاہی نے اس کی طرف رائفل تانتے ہوئے حکم دیا: ''گھٹنوں کے بل جھک جاؤ۔''

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

نیگرو بلانکو نے کسی بچے کی طرح حکم کی تعمیل کی۔

''آخری عبادت کر لو۔''

اس نے مختصر سی عبادت کی اور پھر سپاہی نے تین فائر اس کی کھوپڑی اور سینے میں دل کے مقام پر داغ دیے' اگرچہ یہ اسرار ہی ہے کہ اس نے بلانکو پر گولی کیوں چلائی' مگر قیدیوں میں یہ روایت مشہور ہو گئی کہ سپاہی بلانکو کی شیطنیت اور چنگیزیت سے عاجز آ چکا تھا۔ اس کا پیمانہ صبر آخر ایک روز چھلک اٹھا اور اس نے اپنا انتقام لے لیا' اپنے جذبات کی آگ بجھا لی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ بلانکو نے اس سپاہی کا کچا چٹھا اعلیٰ افسروں کے سامنے بیان کر دیا تھا' یہ کہ بھرتی ہونے سے پہلے یہ شخص نامی گرامی چور رہ چکا ہے۔ بہرحال وہ چور تھا یا نہیں' بلانکو کو اس بے چارے کو کومبین کے پہلو میں دفن کر دیا گیا جو چور ضرور تھا' مگر دلیر و باہمت بھی تھا۔

ان واقعات نے حکام کی توجہ اپنی طرف مبذول رکھی اور ہمارے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہ ہو سکا۔ چاپر کی ڈیوٹی گورنر کے گھر کھانا پکانے پر لگا دی گئی۔ گوناؤ اور بریری کو آزاد کر دیا گیا' کیونکہ فرانس سے ہمارے بارے میں رپورٹ آ چکی تھی۔ اس کے مطابق ان دونوں نے اپنی سزا پوری کاٹ لی تھی' چاپر اور ڈی پالنکے کو بیس بیس سال قید کی سزا ملی تھی اور ابھی خاصا عرصہ باقی تھا۔ گورنر نے یہ اطلاعات موصول کر کے اطمینان کا سانس لیا۔

''اگرچہ تم لوگوں نے وینزویلا کے کسی قانون کی خلاف ورزی نہیں کی' اس کے باوجود تمہیں کچھ عرصے تک بند رکھا جائے گا۔ اپنے اخلاق و اطوار کو بہتر بنا لو۔ ہم تمہیں زیر مطالعہ رکھیں گے۔''

✣ ✣ ✱ ✣ ✣

ایک روز بعض افسروں سے میری گفتگو ہو رہی تھی' انہوں نے شکایت کی کہ تازہ سبزیاں میسر نہیں آتیں۔ اس آبادی میں ایک ماڈل فارم تو موجود تھا' مگر وہاں صرف چاول' مکئی اور دالیں وغیرہ اگائی جاتیں۔ میں نے تجویز پیش کی کہ اگر بیج مہیا کر دیے جائیں' تو ہم لوگ سبزیاں اگانے کا مشن قبول کرنے کو تیار ہیں۔ اس طرح مصروف بھی رہیں گے۔ افسروں نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور چند دنوں کے اندر ہمیں ٹماٹر' بھنڈی توری اور کدو وغیرہ کے بیج مہیا کر دیے۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ہم نے دریا کے کنارے تھوڑی سی جگہ صاف کی۔ اپنے رہنے کے لیے پاس ہی جھونپڑیاں بنالیں۔ اس وقت تک دو مزید غیر ملکی قیدی کیمپ میں پہنچ گئے تھے۔ ایک کا نام ٹوٹو تھا اور وہ پیرس کا رہنے والا تھا۔ دوسرا کراسکین تھا۔ ہم چاروں نے مل کر نہایت جانفشانی سے کام کیا۔ مختصر سی مدت کے اندر سبزیوں کی فصل لہلہائی اور کیمپ میں ہر طرح کی سبزی وافر مقدار میں مہیا ہونے لگی۔

ایک روز میں ٹماٹروں کے کھیت کی گوڈی کر رہا تھا کہ میرا کھرپا کسی سخت شے سے ٹکرایا' میں نے زیادہ توجہ نہ دی' ہوگا کوئی کنکر' مگر یہ بات نہ تھی' میری نظر اس پر پڑی' تو آنکھیں چندھیا گئیں۔ یہ پتھر تو چمکدار تھا۔ کیا میں نے ہیرا تلاش کرلیا تھا۔ یقین جانیے فرط جوش سے مجھ پر قدرے گھبراہٹ طاری تھی۔ میں نے یہ پتھر ٹوٹو کو دکھایا۔ ''خدا کے لیے منہ بند رکھو۔ کسی کے سامنے اس ہیرے کی بابت ذکر مت کرنا۔ شاید یہیں کہیں ہیرے کی کان ہوگی۔ دیکھنا ہم دنوں کے اندر کروڑ پتی ہو جائیں گے۔''

اسی شام میں ایک کارپورل کو حساب پڑھا رہا تھا (وہ اب کرنل بن چکا ہے' لیکن اس وقت کمشن کی تیاری کر رہا تھا) میں جانتا تھا کہ وہ وسیع ظرف کا مالک ہے اور یونہی آ کے گپیں نہیں ہانکتا' چنانچہ میں نے اسے ہیرا دکھا دیا۔

''کہاں سے ملا؟'' کرنل فرانسسکو نے پوچھا۔

''ٹماٹر کے کھیت سے گوڈی کرتے ہوئے۔''

''پھر یہ یقینی بات ہے کہ ہیرا دریا سے وہاں پہنچا ہے۔ کیا تم پانی کی بالٹیاں دریائے کارونی ہی سے لاتے ہو؟''

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ تو اس نے کہا کہ معلوم نہیں ابھی اور کتنے قیمتی پتھر تمہارے کھیتوں کی مٹی میں یا دریا کی تہہ میں چھپے ہوئے ہیں۔ ٹوٹو نے یہ باتیں سنیں' تو وہ یوں کام میں جت گیا کہ زندگی بھر اس نے ایسی مشقت نہ اٹھائی ہوگی۔ اس نے بالٹی پکڑی اور دریا سے بھر بھر کر لانے لگا۔ بالٹی کے اندر پانی سے زیادہ ریت ہوتی میں نے کہا: ''ٹوٹو تم مر جاؤ گے' اتنا کام مت کرو۔''

''ساتھی' میں تو ریت لا کر کھیتوں میں ملا رہا ہوں' اس طرح زمین بھربھری اور زرخیز ہو جائے گی۔'' اس نے جواب دیا' مگر یہ تو کہنے کی بات تھی۔ دراصل وہ ہیروں کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ اور آخر وہ اس مہم میں کامیاب ہوگیا۔ اسے ایک ہیرا مل ہی گیا۔ اسے دیکھ کر اس کی

آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک لہرائی۔ دیکھا دیکھی ہم نے بھی اس کی تقلید کی۔ اب تو ہیروں کی تلاش کی دوڑ شروع ہوگئی تھی۔ چند دنوں کے اندر ہم سب کے پاس وافر مقدار میں ہیرے موجود تھے۔ ان کی خبر ''کرنل'' فرانسسکو کے سوا کسی کو نہ تھی اور اس شخص پر ہمیں اعتماد تھا کہ وہ مخبری نہ کرے گا۔

ہمیں بے حد آزادی میسر تھی۔ ہم کسی پہرے کے بغیر کھیتوں میں کام کرتے اور رات کو کیمپ کے بجائے اپنی جھونپڑیوں میں سوتے۔ ہمیں یہاں رہتے ہوئے آٹھ ماہ ہو چلے تھے۔ جب کبھی گورنر سے بات ہوتی' تو وہ کہتا: ''ابھی اور صبر کرو۔'' اس کی باتوں سے تنگ آ کر ہم نے ایک بار پھر فرار کے موضوع پر سوچنا شروع کر دیا۔ ٹوٹو نے کہا کہ اسے اس موضوع سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں۔ کوئی اور فرانسیسی بھی ساتھ دینے کو تیار نہ ہوا۔ ناچار میں نے خود ہی دریا کے اتار چڑھاؤ کا مطالعہ شروع کر دیا۔ ساتھ ہی میں مچھلیاں پکڑ کر کیمپ میں فروخت کرنے لگا۔

آج ایک عجیب حادثہ گزرا۔ گاسٹن جو اپنے دوستوں میں تو ردو کے نام سے مشہور تھا' گورنر کے سیف سے ستر ہزار روپے لے کر بھاگ نکلا۔ اس چھوکرے کی پرانی داستان بھی تجسس سے پُر ہے۔ بچپن میں وہ جزیرہ اسیراں کے اصلاحی اسکول میں داخل تھا۔ ایک روز اس کے بوٹوں کا تسمہ اچانک ٹوٹ گیا۔ جس سے اس کے کولہے کی ہڈی اپنی اصل جگہ سے ہٹ گئی اور وہ ساری عمر کے لیے لنگڑا ہو کر رہ گیا۔ اسے چلتا دیکھ کر واقعی دکھ ہوتا۔ بہرحال پچیس سال کی عمر میں مشقتی کیمپوں میں آیا۔ اصلاحی اسکول میں پڑھنے کے بعد ظاہر ہے اسے یہیں آنا تھا اور کسی کو تعجب نہ ہوا۔ یہ نام نہاد اسکول بچوں کے اخلاق بگاڑتے ہیں۔ اور انہیں معاشرے کے ناسور بنا کر فارغ کرتے ہیں۔

ہر شخص اسے تو ردو کہتا۔ کسی کو اس کا اصلی نام..... گاسٹن درانتن کا علم نہ تھا۔ لنگڑا تو وہ تھا ہی' لوگ اسے لنگڑا کہہ کر مخاطب بھی کرتے۔ اس جسمانی خرابی کے باوجود کیمپ سے بھاگ کر وینزویلا پہنچ گیا۔ ان دنوں یہاں گومیز کی آمریت کا دور دورہ تھا اور کوئی شخص اس کے استبداد سے محفوظ نہ تھا۔ گومیز کی اسپیشل پولیس نے تو ردو کو ڈھونڈ نکالا اور اسے سڑکوں کی تعمیر کے کام پر لگا دیا۔ یہ لڑکا اس متحرک لیبر کیمپ سے بھی فرار ہوگیا' مگر چند دن بعد پھر پولیس کے ہتھے چڑھ گیا۔ اسے تمام قیدیوں کے سامنے پتھریلی زمین پر ننگا کھینچا گیا اور پھر اسے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

سو کوڑوں کی سزا ملی۔ کوئی انسان بھی اسی کوڑے عام طور پر نہیں سہ سکتا' مگر تو ردو سو کوڑے کھانے کے بعد بھی زندہ رہا۔ وجہ یہ تھی کہ اس کی کمر بہت پتلی تھی اور کوڑے کی ضرب ٹھیک طور پر نہ لگ سکتی۔ کوڑے لگانے کے بعد اس کے زخموں پر نمک چھڑک کر اسے دھوپ میں لٹا دیا گیا' مگر اس کا سر کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا۔ یہ اس لیے کہ کوئی قیدی زخموں کی تاب نہ لا کر تو مر سکتا ہے' مگر اسے دھوپ لگنے سے نہیں مرنا چاہیے۔

تو ردو زمانہ جاہلیت کے اس تشدد سے زندہ بچ نکلا' جب وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا' تو حیران کن طور پر اس کے کولھے کی ہڈی صحیح ہو چکی تھی۔ قیدیوں نے اسے معجزہ قرار دیا۔ اس تو ہم پرست ملک میں لوگوں نے یہ کہا کہ اس قدر سخت سزا کو ہمت و جرات سے سہ جانے پر خدا کی طرف سے یہ اس پر خاص عنایت ہوئی ہے' چنانچہ اب اس کی ہتھکڑیاں اتار دی گئیں اور اسے کسی مقدس ہستی کا درجہ دے دیا گیا۔ کیمپ میں اسے سب سے آسان کام تفویض کیا گیا۔ وہ قیدیوں کے لیے دریا سے تازہ پانی لایا کرتا تھا۔

فرانس کو پتہ چلا کہ اس کے قیدیوں کی بہت بڑی تعداد ویزو ویلا کی سڑکیں تعمیر کرنے میں مصروف ہے تو فیصلہ ہوا کہ کیوں نہ ان لوگوں کی قوت فرنچ گیانا کی تعمیر و ترقی پر صرف کی جائے۔ مارشل فرانسی کو اس مشن پر یہاں بھیجا گیا' گومیز نے فرانسیسی درخواست کو شرف قبولیت بخشا اور تو ردو دیگر فرانسیسی قیدیوں کے ساتھ ایک بار پھر فرنچ گیانا واپس پہنچ چکا تھا۔ اس کے ساتھی اس کا لنگڑا پن ٹھیک ہونے پر حیران بھی تھے اور مسرور بھی۔

1943ء میں وہ دوسری بار فرار ہوا اور آخر قسمت اسے الڈوارڈو کے کیمپ میں لے آئی۔ اس نے یہاں کے افسروں کو بتایا کہ وہ پہلے بھی ویزو ویلا میں رہ چکا ہے' لیکن کس حیثیت سے؟ اس راز سے اس نے پردہ نہ اٹھایا۔ افسروں نے فوراً اسے چاپر کی ڈیوٹی دے دی۔ وہ اس وقت گورنر کے باغ کا مالی بن گیا تھا۔ تو ردو نے باورچی خانہ سنبھال لیا۔

گورنر کے دفتر میں پورے کیمپ کا خزانہ تھا۔ تو ردو نے اس کے تالے توڑے اور ستر ہزار روپے کی پوری رقم اڑا لی اور راہ فرار اختیار کی۔ یہ کوئی بیس ہزار ڈالر کے برابر رقم بنتی ہے۔ یہ حادثہ بجلی بن کر کیمپ پر گرا۔ ایک ایک قیدی کی تلاشی لی گئی' گورنر اپنی فوج ظفر موج کے ہمراہ بنفس نفیس ہماری جھونپڑیوں میں آدھمکا' اسے شک تھا کہ تو ردو کو ہم نے چھپا رکھا ہے یا

اس کے فرار کا انتظام ہم نے کیا ہے۔ ہم نے پورے واقعے سے لاعلمی کا اظہار کیا۔ کیمپ کے افسروں نے بھی گورنر کے سامنے ہماری صفائی پیش کی کہ اگر یہ بھی اس سازش میں شریک ہوتے' تو اس کے ساتھ ہی بھاگ چکے ہوتے۔ آخر اتنی بڑی رقم تنہا شخص کو کون لے جانے دیتا ہے۔

تو ردو کی لاش برطانوی گیانا کی سرحد سے پچاس میل ادھر جھاڑیوں میں اٹکی ہوئی مل گئی۔ لاش کے اوپر منڈلاتے ہوئے گدھوں نے اس کا سراغ لگانے میں مدد دی تھی' اس کی موت کے بارے میں کئی افواہیں گردش کرنے لگیں۔ بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ انڈین قبائل کے ہاتھوں مارا گیا ہے' لیکن بعد میں ایک شخص کو وہی چوری شدہ نوٹ کسی بنک سے تبدیل کراتے ہوئے پکڑ لیا گیا۔ گورنر نے ان نوٹوں کے نمبر تمام بنکوں کو بھجوا دیے تھے۔ اس شخص نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا۔ اس نے دو اور مجرموں کی بھی نشاندہی کی جن کے ساتھ مل کر اس نے تو ردو کو ٹھکانے لگایا تھا' مگر وہ کبھی گرفتار نہ ہو سکے۔ یہ تھا میرے دوست تو ردو کا المناک انجام!!

✣ ✣ ✶ ✣ ✣

ویزو ویلا کے باشندے مجھے اس قدر مہربان اور خوش اطوار لگے کہ میں نے یہاں سے بھاگ نکلنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ میں نے اس امید پر قید کی صورت حال ذہنی طور پر قبول کر لی کہ کسی نہ کسی دن اس ملک کا آزاد شہری بن جاؤں گا۔ قارئین کو میرا یہ فیصلہ سراسر حماقت نظر آتا ہوگا۔ کیونکہ قیدیوں کے ساتھ ان لوگوں کے وحشیانہ سلوک کے بعد انہیں مہربان اور خوش اطوار کہنا یقیناً حماقت ہے۔ میں اپنے دفاع میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ درشتی اور تشدد ان کے مزاج کا ایک حصہ بن گیا ہے۔ ایک عرصے سے ڈکٹیٹر گومیز نے جس طریقے سے ان لوگوں پر حکومت کی' اس سے وہ ایک خاص ماحول کے عادی ہو گئے ہیں۔ کاروبار حکومت چلانے کے لیے کوئی عام سول افسر بھی لوگوں کا مزاج درست کرنے کے لیے کوڑوں کی سزا تجویز کر دیتا ہے۔ کیمپ کے اندر کوئی کارپورل قیدیوں پر ظلم و تشدد ڈھاتا ہے' لیکن اگر کبھی اس سے بھی غلطی ہو جائے' تو اسے خود اسی سزا سے واسطہ پڑتا ہے۔ اس طرح یہ کیفیت ان لوگوں کی زندگی کا معمول بن گئی ہے۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

اب میری رہائی کے آثار واضح ہو رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ملک میں انقلاب برپا ہو گیا ہے۔ ملک کے صدر جنرل مدنیہ کا تخت الٹ دیا گیا ہے' فوج اور سول کے ملے جلے افسروں نے بغاوت کر دی ہے۔ جنرل مدنیہ اپنے لبرل نقطہ نظر کی وجہ سے مشہور تھا۔ اس نے صحیح معنوں میں جمہوریت کی بنیادیں استوار کر دی تھیں' جب اس کے خلاف بغاوت ہوئی' تو لوگوں کی خواہش کے باوجود اس نے کسی کو اپنی حمایت میں مظاہرے کرنے اور اس طرح ایک دوسرے کا خون کرنے سے منع کر دیا۔

انقلاب کے ایک ماہ بعد تمام افسر تبدیل ہو گئے۔ گورنر کی بھی چھٹی ہو گئی۔ ان کی جگہ نئی انتظامیہ آ گئی جس نے اپنے قانون چلائے۔ کیمپ کے نئے انچارج نے مجھے ایک روز دفتر میں بلا کر کہا: ''کل سے تمہیں آزاد کر دیا جائے گا' لیکن میری خواہش ہے کہ تم اپنے ساتھ بے چارے پکولینو کو بھی لے جاؤ۔ وہ تمہارے ساتھ رہنے کا عادی ہو گیا ہے' اگرچہ اس کی کوئی شناخت نہیں' تاہم میں اس کے لیے شناختی کاغذات تیار کرا دوں گا۔ جہاں تک تمہارا تعلق ہے۔ یہ لو نیا شناختی کارڈ' یہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ تمہارے نام پر بنایا گیا۔ بس چند شرطیں ہیں۔ جنہیں تم لازماً ملحوظ رکھو گے۔ سب سے پہلے تمہیں ایک سال تک کسی چھوٹے گاؤں میں رہائش رکھنا ہو گی۔ اس کے بعد کسی شہر آباد ہو سکو گے۔ یہ ایک طرح سے عبوری عرصہ ہے جو تمہیں پولیس کی نگرانی میں بسر کرنا ہو گا' نگرانی ایسی کڑی نہ ہو گی' بلکہ تمہاری عمومی زندگی پر نظر رکھی جائے گی کہ تم اپنے اخلاق اور اطوار میں کس حد تک اصلاح کرتے ہو اور مجرمانہ زندگی سے کس قدر کنارہ کشی اختیار کرتے ہو۔ اگر ضلعی حاکم اعلیٰ اس عبوری مدت کے بعد تمہارے بارے میں تسلی بخش رپورٹ دے دے گا۔ تو تم کسی بھی شہر میں رہائش پذیر ہونے کے اہل ہو جاؤ گے۔ میرے خیال میں کاراکاس کا شہر تمہارے لیے موزوں رہے گا۔ بہرحال تم اس ملک میں رہنے کے قانونی حق دار بھی ہو گئے ہو۔ تمہارے ماضی سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔ یہ تم پر منحصر ہے کہ تم کس قدر جلدی اپنے آپ کو ایک باعزت شہری ثابت کرتے ہو۔ خدا تمہاری مدد کرے۔''

اگلے روز سات بجے صبح مجھے حقیقی آزادی میسر آنا تھی۔ میرا دل جذبات سے بھر آیا۔ آخر میں ایک طویل سفر کے بعد کسی منزل تک پہنچ گیا تھا۔ میں اس لمحے کا انتظار تیرہ برس سے کر رہا تھا اور آج 18 اکتوبر 1945ء کی تاریخ تھی۔

میں اپنے باغ میں گیا' دوستوں سے معافی مانگی اور پھر چند لمحے تنہائی میں بسر کیے۔ مجھ پر جذبات کا اس قدر غلبہ تھا کہ میں اپنی حالت کی صحیح عکاسی نہیں کر سکتا۔ میں نے شناختی کارڈ پر نظر ڈالی۔ نمبر-1728629 تاریخ اجراء 3 جولائی 1944ء درمیان میں سرکاری مہر۔ نیچے میرا نام۔ پشت پر تاریخ پیدائش: 16 نومبر 1906ء اور شناختی کارڈ جاری کرنے والے محکمے کے ڈائریکٹر کے دستخط۔ یہ چیز ٹھیک ٹھاک تھی۔ میں اب وینزویلا کا باشندہ تھا۔ مجھ پر رقت کا عالم طاری ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے خدا کے حضور جھک کر اس کا شکر ادا کرنا چاہیے' لیکن میاں پیپلن' تمہیں عبادت کا طریقہ تو آتا نہیں' تمہیں بپتسمہ بھی کسی نے نہیں دیا' تم کس خدا کی بات کرتے ہو جبکہ تم کسی مذہب کے پیروکار نہیں۔ تم عیسائیوں کے خدا کو پکارو گے؟ یا یہودیوں کے خدا کو؟ یا مسلمانوں کے خدائے ذوالجلال کو؟ میں اپنی دعاؤں میں جس خدا کو مخاطب کرتا' بہرحال مقتدر اعلیٰ تو ایک ہی قوت ہے' نام ہی جدا ہیں' مسئلہ تو یہ تھا کہ مجھے عبادت کے الفاظ بھی خود گھڑنے پڑیں گے' اس لیے کہ میں عبادت کے الفاظ سے بھی آگاہ نہیں۔ بہرحال مجھے کسی خاص تشویش کی ضرورت نہ تھی۔ آخر میں پہلے بھی اپنی ابتلا کے دوران کسی خدا سے مدد مانگا ہی کرتا تھا!

کل میں آزاد ہو جاؤں گا' بالکل آزاد اور پانچ برسوں کے اندر میں ہر اعتبار سے وینزویلا کا شہری بن جاؤں گا۔ اور اس مقصد کے حصول کے لیے مجھے پہلے سے دگنا دیانت دار بن کر زندگی بسر کرنا ہو گی' اگرچہ میں اس قتل سے بری الذمہ تھا جس کے لیے سرکاری وکیل' چند سپاہیوں اور جیوری کے بارہ بدمعاشوں نے مجھے عبور دریائے شور کی سزا دی تھی' مگر میرے گرد سازش کا جال بننے کی انہیں وجہ یوں ملی تھی کہ میں بدکردار تو تھا ہی جرائم کی دنیا میرے لیے جانی پہچانی تھی۔ اب مجھے اپنے اس ماضی سے چھٹکارا حاصل کرنا تھا۔ اپنے دامن کے تمام دھبوں کو صاف کرنا تھا'' ''پاپی! خدا کا شکر ادا کرو' اس نے تمہیں اصلاح کا موقع تو

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

دیا۔ ''میرے دل سے آواز ابھری۔ ''خدایا! اگر میں صحیح طریقے سے دعا نہیں مانگ رہا' تو مجھے معاف کر دینا۔ تیرا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس مناسب الفاظ نہیں ہیں۔ تو نے مجھے نجات بخشی ہے۔ درحقیقت یہ جدوجہد طویل بھی تھی اور جان لیوا بھی۔ تیری مدد کے بغیر میں اپنا مقصد کبھی نہ پا سکتا۔ میں خلوص سے تیرا شکر ادا کرنے کے لیے کیا کروں؟''

''اپنے انتقام کو بھول جاؤ۔''

کیا واقعی میں نے یہ الفاظ سنے یا میرا احساس ہے کہ مجھے یہ الفاظ سنائی دیے؟ کیا میرا مجرم ضمیر ملامت کر رہا تھا؟

''نہیں! نہیں ایسا کرنے کو نہ کہو۔ ان لوگوں نے مجھے بے حد نقصان پہنچایا ہے۔

میں ان سپاہیوں کے کیسے معاف کر دوں؟ میں اس ننگ انسانیت وکیل کی کھال اتارنے کا خیال دل سے کیسے نکال دوں؟ میں ایسا نہیں کر سکتا' خدایا! تو نے ایسا حکم دیا ہے جس کی تعمیل میری طاقت سے باہر ہے۔ نہیں' نہیں' میں تیری حکم عدولی پر معذرت خواہ ہوں' میں اپنے انتقام کو بھول جانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔''

میں جھونپڑی سے باہر نکل گیا۔ مجھے خدشہ تھا کہ اندر تنہا بیٹھا رہا' تو کہیں ہتھیار ہی نہ ڈال دوں۔ میں باغ میں گھومنے پھرنے لگا۔ میرے تین ساتھی مجھے دیکھ کر میرے پاس آ گئے۔ ان کی نظریں میرے چہرے پر جمی تھیں اور خود وہ میری آزادی کا مژدہ سن کر مسرور تھے۔ یقیناً ان کی باری بھی آنے والی تھی!!

ٹوٹو نے اس خیال کی تصدیق کی۔ ''کیپٹن نے بتایا ہے کہ ہر پندرہ دن بعد ایک قیدی کو رہا کر دیا جائے گا۔'' قدرے توقف کے بعد اس نے پوچھا: ''پاپی! تم آزاد ہو کر کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟''

ایک دو سیکنڈ میں خاموش رہا۔ پکے سچے بدمعاشوں کے سامنے حقیقت بیانی سے کام لیتے ہوئے اگرچہ میں عار محسوس کرتا تھا' تاہم میں نے ہمت کر کے کہا: ''میں کیا کروں گا؟ جواب بالکل آسان ہے۔ میں کوئی ملازمت ڈھونڈوں گا اور بس اسی پر جم جاؤں گا۔ آخر اس ملک نے مجھ پر اعتماد کیا ہے' تو مجھے کوئی جرم کرتے ہوئے ضرور شرم محسوس ہوگی۔''

میں ایک طنزیہ مسکراہٹ دیکھنے کی بجائے ان تینوں کا یہ جواب سن کر حیران رہ گیا: ''ہم

نے بھی راہ راست پر آ جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ پیپلن' تم نے ٹھیک سوچا ہے' اگرچہ شروع میں مشکل پیش آئے گی' مگر یہ لوگ حسن سلوک کے حق دار ہیں۔''

میرے ذہن میں اراپا کے غریب مچھیروں کے الفاظ گونجے: ''انسان ہمیشہ کے لیے گمراہ نہیں ہوتا۔ اسے اپنے آپ کو صحیح کرنے کا موقع ملنا چاہیے۔'' جھیل پاریا کے یہ ان پڑھ مچھیرے ایک ایسے فلسفے کے وارث ہیں جو صبح کی شبنم سے زیادہ تروتازہ ہے اور ادھر ہمارے یورپی بھائی نت نئی ترقی میں مگن اور زندگی کے ہر فلسفے سے بیزار نظر آتے ہیں۔ تہذیب نظر کو خیرہ کرتی ہے اور دلوں کو مردہ۔ حیا اور شرافت کا دامن چاک چاک اور اقدار کا چہرہ لہولہان۔ تو پھر میں دنیا کے دوسرے سرے پر آباد ان ماہی گیروں کی سادہ مزاجی سے کیوں نہ طراوت حاصل کروں؟ میں اس بے لوث معاشرے میں کیوں نہ رچ بس جاؤں؟ میں ان کی گھمبیرتا کو اپنی روح میں کیوں نہ جذب کر لوں؟

✣ ✣ ✱ ✣ ✣

میرے پاس نہایت عمدہ نیوی بلیو سوٹ تھا۔ یہ میرے شاگرد نے تحفتاً دیا تھا جو اب کرنل ہے۔ ایک ماہ پہلے اس نے کمیشن حاصل کر کے آفیسرز اسکول میں داخلہ لے لیا تھا۔ وہ پہلی پوزیشن حاصل کرنے والے تین لڑکوں میں شامل تھا۔ میں خوش تھا کہ میری ہدایات بھی کسی کے کام آ سکیں۔ کیمپ سے جانے سے پہلے اس نے اپنے کچھ کپڑے مجھے دے دیے تھے۔ میں نیشنل گارڈ کے کارپورل اور اب کرنل فرانسسکو کا ممنون ہوں کہ کم از کم اس کی عنایت سے اچھے کپڑے پہن کر کیمپ سے نکلوں گا۔

آزادی کے پہلے چند ہفتوں میں مجھے روزگار کی تلاش میں دقت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ دوسری طرف پکولینو کی گراں ذمے داری بھی میں نے قبول کر لی تھی' اس کی خوراک اور اس کے علاج کا بھی مسئلہ تھا' بہرحال گھبرانے کی کوئی بات نہ تھی۔

میں نے سوچا کیا اپنے باپ کو خط لکھ کر اطلاع دے دوں کہ میں آزاد ہو چکا ہوں۔ وہ پولیس والوں سے میرے فرار کے قصے تو سنتا رہتا ہوگا۔ نہیں' مجھے جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ مجھے اس کے ان زخموں پر نمک پاشی کا قطعاً حق نہ تھا جو وقت نے مندمل کر دیے تھے۔ میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے اور باعزت شہری بننے کے بعد اسے یہ اطلاع دوں گا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

''......... پیارے پاپا! تمہارا چھوٹا بیٹا آزادی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ وہ بہت دیانتدار بن گیا ہے اور راہ راست پر چلتا ہے۔ اب تم اس کا ذکر سن کر شرمندہ نہ ہوا کرو گے۔ میں نے ہمیشہ تم سے محبت کی ہے اور تمہیں عزت و تکریم سے یاد کرتا رہا۔''

✣ ✣ ✶ ✣ ✣

صبح کے سات بج رہے ہیں' صاف نیلا آسمان اور چمکدار روشن سورج' پرندے خوشی کے گیت گانے کے لیے بیدار ہو چکے ہیں اور میرے دوست کیمپ کے دروازے پر جمع ہیں۔ پکولینو حجامت بنوا کر نئے کپڑوں میں ملبوس ہے۔ ایک افسر ہمارا انتظار کر رہا ہے۔ وہ ایلڈ وارڈ و کے گاؤں تک ہمیں الوداع کہنے جائے گا۔

''ہمیں گلے لگاؤ۔'' ٹوٹو نے کہا: ''اور پھر چلے جاؤ۔ یہ سب کے لیے مناسب طریقہ رہے گا۔''

''بھائیو! خدا حافظ۔ اگر کبھی لا کالیو (میں نے ایک سال تک وہاں رہنے کا فیصلہ کیا تھا) سے تمہارا گزر ہو' تو اس عاجز کا چھوٹا سا گھر تمہیں خوش آمدید کہے گا۔''

''خدا حافظ' پاپی' گڈ لک!''

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

ان دعائیہ کلمات کے ساتھ ہم رخصت ہوئے۔ آج پکولینو کی چال میں بھی افتخار تھا۔ تیرہ برس سے ہم نے جو بیڑیاں پہن رکھی تھیں' وہ ان چند الفاظ سے اتر گئیں: ''اس لمحے کے بعد تم آزاد ہو۔'' کتنے آسان لفظ تھے جنہیں سننے کے لیے مجھے تیرہ برس پر پھیلا ہوا طویل انتظار کرنا پڑا!

محافظوں کی پیٹھ ہماری طرف تھی۔ اب ہماری کوئی نگرانی نہ کرے گا۔ چند منٹ میں ہم دریا کے کنارے ٹیڑھی پگڈنڈی پر رواں دواں تھے۔

✣ ✣ ✶ ✣ ✣